خطباتِ مُشران

بزمِ دوم

یعنی

آنجہانی پنڈت سُندر نراین مُشران

رئیس فرخ آباد کے چند خطبے

مع مقدمہ

از شاعرِ حرّیت جناب نسیم امروہوی

لۂ امتحان

ایم، اے - آگرہ یونیورسٹی

یعنی

آنجہانی پنڈت سندر نراین مُشران

رئیس فرخ آباد کے چند خطبات

مع مقدمہ

از شاعر حریت جناب نسیم امروہوی

مشمولہ امتحان

ایم، اے۔ آگرہ یونیورسٹی

قیمت عمہ

فہرست مضامین

۱- "شہید ادب" ۱

۲- مقدمہ ۷

۳- شعرا کا خیر مقدم اور شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ ۱۰

۴- سرسید میموریل فنڈ ۲۶

۵- ہندو مسلم اتحاد ۳۶

۶- حاضرین مشاعرہ کا خیر مقدم آداب شاعری اور حالات شعراء ۴۰

۷- گوکھلے کا غم ۶۵

۸- جنگ عظیم پر پہلا لکچر ۷۳

۹- جنگ عظیم پر دوسرا لکچر ۱۱۶

۱۰- جنگ عظیم پر تیسرا لکچر ۱۵۸

۱۱- گاندھی جنم دن ۱۸۹

"شہیدِ ادب"

پنڈت سُندر نراین صاحب مُشران

کے

مختصر حالات زندگی

پنڈت سندر نراین مُشران ایم، آر، اے، ایس (لندن) فرخ آباد کے رئیس ور اُردو کے نامور خطیب اور ممتاز ادیب تھے - آپ کے والد پنڈت چھمی نراین مُشران سندیدہ خدمات کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ کی سندِ خیر خواہی پائے ہوئے تھے اور آپ کے ادا پنڈت گوردھن داس مُشران کو (جو نواب تجمل حسین خاں بہادر، والی فرخ آباد کی سرکار میں مدار المہام تھے) بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی سرکار سے "انتظام الدولہ، ممتاز الملک، مہاراجا گوردھن داس بہادر، دیوان اعلیٰ" کا خطاب تھا - اُن کی اسناد میں تحریر ہے کہ فرخ آباد کے ضلع کا انتظام مالی، بعد غدر محض گوردھن داس کے مشورے سے کیا گیا ہے - پنڈت گوردھن داس کے بزرگ صوبہ دار کشمیر تھے لیکن کشمیر کی طوائف الملوکی کے زمانے میں ترک وطن کر کے فرخ آباد میں اقامت گزیں ہو گئے تھے -

شہیدِ ادب کو رفاہِ عام کے کاموں سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی - ۱۸۹۹ء میں آپ کی کوشش سے فرخ آباد میں ایک پبلک لائبریری قائم ہوئی - جس کی ترقی و بقا کے تمام سامان آپ نے اپنی حیات ہی میں فراہم کر دیے - جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو بتاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۳۲ء لائبریری ہال میں ایک سنگ مرمر کی لوح آپ کی یادگار میں نصب کی گئی اور جلسۂ عام میں ایک سپاسنامہ اعتراف امتنان کے طور پر ممبران لائبریری کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا - جس میں آپ کی لیاقت علمی، شرافت، بے تعصبی اور ہردلعزیزی کا ذکر

بہ تزک و احتشام اور بحسن وخوبی تمام، انجام پا رہے ہیں، جس کی وجہ سب سے بڑی یہ ہے کہ ہمارے اتحاد بورڈ کے میرمجلس، یعنی آپ، ایسے شخص ہیں جو تعصبات مذہبی سے محض نا آشنا اور فسادات قومی کے دشمن ہیں۔ بورڈ کا کام اور انتظام اس حسن اخلاق اور حسنِ تدبیر سے ہوتا رہا ہے کہ پانچ برس میں کبھی ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ گویا سب کام بہ اتفاق تمام انجام پاتے رہے۔ آپ کی سفارش پر آٹھ یا نو ہندو مسلم ارکان بورڈ کی خدمتوں کی قدر دانی منجانب حکام ضلع، دو مرتبہ کی گئی اور خوشنودی مزاج کی سندیں عطا ہوئیں"

شہیدِ ادب نے جنگ عظیم کے دوران میں بحیثیت سکریٹری لائبریری، چار برس تک، بطور "وار لکچرر" کے گورنمنٹ اور رعایا کی خدمت بخوبی تمام اور بجوش اسلوبی مالاکلام انجام دی اور ان عظیم الشان جلسوں میں، جو مجسٹریٹ ضلع کی صدارت میں منعقد ہوئے، آپ نے وہ فصیح و بلیغ پولیٹیکل تقریریں فرمائیں جو آپ کا علمی کارنامہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ پولیٹیکل لکچر (جو بعنوان "جنگ عظیم" شائع ہو چکے ہیں) گورنمنٹ اور رعایا کے حق میں رحمت و برکت ثابت ہوئے اور رعایا اور سرکار کے باہم خیرخواہی اور ہمدردی کے تعلقات میں بہت اضافہ ہو گیا۔ جدید حالات میں بھی وہ ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں، کیونکہ ان کے مطالعے کے بعد ہر شخص اسی نتیجے پر پہونچتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں بھی اتحادی طاقتیں آخرکار اپنے زبردست اخلاقی وسائل کی بنا پر کامیاب ہوں گی۔

آپ کے خطبات کا مجموعہ موسومہ "خطبات مشران" ایک رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں آپ نے اخلاقی، علمی، سیاسی اور تمدنی ہر قسم کے مباحث پر سلیس اور دلچسپ الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی تقریریں بہت صاف اور سلجھی ہوئی اور طرزِ ادا نہایت دلکش ہے۔ زبان وہی ہے جو فصحائے دہلی و لکھنؤ بولتے ہیں، جس کے بارے میں آپ نے خود ایک خطبے کے دوران میں ارشاد فرمایا ہے "اُردو میں نے پیرزالان کشمیر (اپنی ماں۔ بہن وغیرہ) سے سیکھی ہے" حق یہ ہے

کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں آپ کی پبلک خدمات کا اظہار کیا گیا :-
"آپ نے جو خدمات ، بحیثیت آنریری منصف و مجسٹریٹ انجام دیں ، وہ جمہور کے نزدیک بہت قدر کے لائق سمجھی گئیں - جس آزادی اور معدلت گستری سے آپ نے یہ خدمتیں انجام دیں ، اس کی نظیر اس شہر میں کمتر ملتی ہے اور پھر جس استغناء سے آپ نے دونوں عہدوں سے دست کشی کی ، وہ اس شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گی - ان عہدوں کو حاصل کرنے کے لیے لوگ ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں ، لیکن آپ نے ان عہدوں کو ایسی بے پروائی سے چھوڑا ، گویا آپ ان کی طرف سے بالکل مستغنی و بے نیاز تھے - صحیح یہ ہے کہ آپ نے ان عہدوں کو خود تلاش نہیں کیا ، بلکہ ان عہدوں نے خود آپ کو ڈھونڈھا تھا - یعنی حکام نے آپ کی لیاقتوں اور کارگزاریوں کے صلے میں آپ کو یہ عہدے عطا فرمائے تھے کہ عامۂ رعایا کے حق میں ، آپ باعث رحمت اور موجب برکت ثابت ہوں - جب اس شہر میں ۱۹۲۱ء میں پنچایت کمیٹیاں قائم ہوئیں ، تو ایک عظیم الشان جلسے میں ہندوؤں مسلمانوں نے آپ کو سرپنچ انتخاب کیا اور اس صیغے میں بھی آپ کی خدمتیں قابل تحسین سمجھی گئیں - آپ نے جس آزادی اور رحمدلی سے سنٹرل جیل کی انسپکٹری کی وہ اہل زنداں کو ہمیشہ یاد رہے گی - ہمارے شہر کے اکثر بڑے آدمی اس عہدے پر مقرر ہوئے مگر کسی نے بیچارے قیدیوں کے حال زار پر کوئی توجہ مبذول نہ کی - آپ نے ہمیشہ رپورٹیں لکھیں ، جن میں آپ نے اہل زنداں کی غذا ، آرام و آسائش ، سیر و تفریح کے واسطے وقتاً فوقتاً سفارشیں کیں - پولیٹیکل قیدیوں کو خاندان کے عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت دلوائی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زنداں عموماً اور پولیٹیکل قیدی خصوصاً ، آپ کو اپنے حق میں بخشندۂ برکات سمجھتے رہے - پانچ برس سے آپ نے جو شاندار خدمتیں بطور 'میر مجلس ہندو مسلم اتحاد بورڈ' کے انجام دیں ، وہ حکام عالی مقام سے پوشیدہ نہیں ہیں اور شہر فتحگڑھ ، بلکہ تمام ضلع کے ہندو مسلمان ان سے بخوبی واقف ہیں - آپ کی صدارت میں پانچ سال سے اس شہر میں نہایت امن و اماں رہی ہے اور سب ہندو مسلم تیوہار ،

"شہید ادب"

آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران

رئیس فرخ آباد

کہ ایسی فصاحت اور بلاغت جیسی کہ آپ کے خطبات میں ہے، اُسی کو حاصل ہوسکتی ہے جس نے اپنی ماں، بہن کی گود میں زبان سیکھی ہو۔

"خطباتِ مشران" کے مختلف منتخب خطبے، آگرہ یونیورسٹی کے ایم، اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے بی، اے آنرز اور جامعہ اُردو آگرہ کے امتحانات ادیبِ ماہر، و ادیبِ کامل، کے نصابات میں شامل کیے گئے ہیں۔ اور یہ کتاب صوبۂ متحدہ اور ریاست ہائے حیدرآباد و کشمیر کی تمام درسگاہوں کے کتب خانوں کے لیے منظور ہو چکی ہے۔

علم و ادب سے آپ کو جو روحانی تعلق تھا اُس کے اظہار میں یہ واقعہ خصوصیت سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ۱۰ر جنوری ۱۹۳۷ء کو ستتر برس کی عمر میں فرخ آباد کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں بحیثیت صدر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے آپ جاں بحق ہوئے اور قوم سے "شہیدِ ادب" کا خطاب پایا ؎

ایسی مرگِ کامراں ملتی ہے کس انسان کو
زندۂ جاوید کہنا چاہیئے مُشران کو

از

شاعرِ حریت حضرت نسیم امروہوی

درخت ہوں کہ دھوپ اور ہوا کو روکیں۔ میں زخواں پہنچنے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی مہمانی اور خوراک کا کرلیتا
ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے اور اسکی جڑیں زمین کی نمی کو بخارات بنتی ہیں۔ ہوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے
اسکے ہوا اور اسکی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے جیسے سایہ کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینہ اور ماگھ پوس کی سردی اور برف
اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اوس کو معلوم ہو
تکتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے لوگ اوسکے پیل پھول پھل لکڑی پتے لیتے ہیں دوست اور دشمن دونوں کی
خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی

عکسِ تحریر شہیدادب

مقدمہ

از شاعرِ حرّیت حضرت نسیم امروہوی

پنڈت سُندر نراین مُشران مرحوم کے خطبات پر مقدمے کی حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر مشکل ہے ، اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے ، جس کی طبع رسا ، ان بلند پایہ خطبات کی علمی اور ادبی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے ۔ یہ خطبات ، جو معاشرت ، ادب ، تاریخ ، سیاست اور علم و حکمت کے مختلف اور بیشتر شعبوں پر حاوی ہیں ، اپنے تعارف و تبصرہ کے لیے ایک فکر نکتہ رس اور طبع نقاد کے محتاج ہیں ۔ مشہور ہے کہ جب گبن نے اپنی مشہور تاریخ " عروج و زوال روما " لکھ کر ختم کی تو اس نے جوشِ مسرت میں مفتخرانہ انداز سے کہا تھا : — "میں اپنی کتاب کے لیے مقدمہ نویس کہاں سے لاؤں" —— گبن نے ان چند لفظوں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری تصنیف جس پایے کی ہے ، اس کے شایان شان مقدمہ لکھنے والا ، صفحۂ ارض پر کوئی موجود نہیں ۔ ممکن ہے کہ گبن کو اپنی تاریخ کے لیے کوئی ایسا مقدمہ نویس مل جاتا جو اس کے محققانہ معیار انتخاب پر پورا اُترتا ، لیکن جہاں تک خطباتِ مُشران کی بلند پایگی اور ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے ، یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ قلم جو کہ ان خطبات کی حقیقی اہمیت کو واضح کر سکے ، کم سے کم اس شخص کے پاس نہیں ہے ، جو اس وقت اس سلسلے میں خامہ فرسائی کی ناکام کوشش کر رہا ہے ۔ یہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ "خطباتِ مُشران" پر کچھ لکھنا آسان نہیں ۔ ان خطبوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک نظرِ غائر اور فکر جامع کا محتاج ہے ۔ اوّل تو ادبیات میں "خطبہ" یوں ہی ایک مشکل ترین اور جامع ترین صنف ہے اور پھر اس صنفِ ادب کی خصوصیات کو علمی اصول پر بیان کرنا اور ان کی تمام وسعتوں کو چند سطروں میں

پوزیشن سے بحث کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا اور مُلکی نظم ونسق کے اندرونی اسرار کا انکشاف بھی ضروری تھا، اس لیے محض تقریر کے دامن میں ان کا سمانا امکان کے حدود سے باہر تھا۔ ان خطبات کے علاوہ بقیہ تمام خطبے وہ ہیں جو اظہار و بیان سے قبل قیدِ تحریر میں نہیں آئے۔ اور اُس وقت لکھے گئے جبکہ وہ کسی جلسے میں ادا ہو رہے تھے۔

خارج از موضوع نہ ہوگا اگر اس موقع پر صنف خطبہ و تقریر کے متعلق منطقیانہ زاویۂ نگاہ سے کچھ بیان کر دیا جائے، جس کے بعد ان خطبات کی اہمیت واضح ہونے کے مزید امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ خطبہ کیا ہے۔؟ وہ تقریر جو کسی جلسے میں کی جائے۔ اس بیان کے مطابق فن تقریر و خطابت میں بظاہر کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا مگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تقریر اس بیان کو کہتے ہیں جو کسی جلسے یا صحبت میں کسی بھی موضوع یا مسئلے پر ارادۃً دیا گیا ہو مگر خطبہ صرف وہی بیان ہے جو علمی مسائل کی تحقیق و تشریح کے لیے یا کسی موضوع کو عالمانہ لہجے اور انداز بیان میں سامعین کے ذہن نشین کرنے کے لیے کسی منبر یا پلیٹ فارم سے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تقریر میں یہ حد بندی نہیں ہوتی۔ گویا خطبہ و تقریر میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ اسی بات کو زیادہ واضح لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ صرف علمی تقاریر کو ہی خطبات کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں مُقرّر ہزاروں لاکھوں ہوتے ہیں مگر ان بے شمار مُقرّروں میں خطیب اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مُقرّر اور خطیب میں وہی فرق ہے جو ایک مُصنّف اور محقق میں ہوتا ہے۔ اگرچہ محقق بھی اپنی تحقیقات کی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے مُصنّف کہلاتا ہے مگر اس کا درجہ محض مصنّف سے بالا تر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک خطیب بھی ایک مُقرّر سے اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے۔

خطبے کی تعریف کے بعد سرسری طور سے یہ لکھ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل و ابتدا کہاں سے ہوئی۔ درحقیقت خطبہ اُس عہد کی پیداوار ہے جب دنیا میں کتابوں کا رواج عام نہ تھا۔ اس لیے اُس عہد کے علماء و فضلاء اپنی تحقیقات کو

سمیٹ کر کسی خطیب کے خطبوں کی ادبی اور علمی خوبیوں پر روشنی ڈالنا اس قدر دشوار اور جامعیت طلب ہے جس کی حد و انتہا نہیں ۔

پنڈت جی کے خطبات علم و ادب، تاریخ و سیاست، تمدن و معاشرت اور نفسیات کے بے شمار اور اہم ترین مسائل پر مشتمل ہیں، جن سے اس مجموعے میں ایک مستقل علمی تصنیف کی شان پیدا ہوگئی ہے ۔ موصوف نے جس موضوع کو بھی لیا ہے، اس کی جزئی تفصیلات تک بیان کر دی ہیں ۔ درحقیقت ان کا ہر خطبہ بجائے خود ایک معنی خیز مقالہ ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مقالہ نگار اپنے خیالات کو پہلے قلمبند کر لیتا ہے پھر منظرِ عام پر لاتا ہے ۔ برخلاف اس کے ایک خطیب اپنے دلائل کو زبانی بیان کرتا ہے اور ادائے مافی الضمیر میں زبان قلم کی ترجمانی کا محتاج نہیں ہوتا ۔ مقالہ نگار اظہار خیالات کے وقت آزاد ہوتا ہے ۔ وہ ایک فقرہ لکھ کر ہزار بار مٹا سکتا ہے اور دس ہزار بار بنا سکتا ہے لیکن ایک خطیب کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں ۔ وہ عوام کے مجمع میں گھرا ہوتا ہے ۔ اس کے پاس اظہار و بیان کے لیے محدود وقت اور محدود گنجائش ہوتی ہے ۔ اُسے اپنے دل، دماغ اور زبان تینوں اعضا سے بیک وقت کام لینا پڑتا ہے ۔ اس کے پاس سوچنے کو وقت نہیں ہوتا اور نہ اثنائے تقریر میں اپنی یادداشت کو تازہ کر سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں خطبے کی علمی شان قائم و برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہے ۔

زیرِ نظر خطبات وہ تقاریر ہیں جو پنڈت جی نے مختلف سیاسی، ادبی اور معاشرتی مجلسوں میں ارشاد فرمائیں اور اسی وقت ان کے کاتب خاص نے قلمبند کر لیں ۔ وہ تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا جاتا تھا ۔ ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے کہ موصوف نے ان پر نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائی ہو ۔ کل مجموعے میں صرف تین خطبے ایسے ہیں جو پہلے سے لکھے گئے تھے اور پنڈت جی نے جلسوں میں انھیں پڑھ کر سنایا تھا ۔ یہ تینوں خطبات گزشتہ جنگ عظیم کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ وہ سرتاسر تاریخی موضوعات تھے، متعدد ممالک کی جغرافیائی بری اور بحری

مہتم بالشان خطابیاتی مجموعہ اُردو میں مرتب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے پنڈت جی کے خطبات کا مجموعہ اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مجموعے نے ہماری زبان میں ایک ایسی تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کی ہمپایہ مؤلفات کی اُردو ادب میں بہت کمی تھی اور اس کمی کے باعث ہمارا لٹریچر، روم و یونان و عرب کے ادبیات کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

اس زمانے میں جبکہ بعض تنگ نظر حلقوں کی طرف سے زبان میں بھی فرقہ پرستی کے زہر کو داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مبارک ہیں وہ شخصیتیں اور وہ نفوس جو اپنی زبان اور اپنے ادب کی ترقی کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی بہترین کوشش صرف کر رہے ہیں۔ پنڈت جی کے خطبات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سینہ علم و حکمت کے پہلو بہ پہلو ایسے ہی صدق و صفا کا مخزن تھا۔ عالم انسانیت کے بہترین حکیموں اور بلند نظر فلسفیوں کی طرح ان کی نگاہ، رنگ، نسل، خون، جغرافیہ، سماج اور قوم و ملت کی تمام حد بندیوں سے بالاتر تھی۔ وہ عربی و فارسی و انگریزی کے بہترین عالم تھے۔ ان کو ادبی خدمات سے عشق تھا۔ انھوں نے ادب کے ہر شعبے میں کامل عبور اور حقیقی دستگاہ بہم پہنچائی تھی اور دماغ فلسفیانہ، زبان عارفانہ، فکر حکیمانہ اور دل شاعرانہ پایا تھا ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

ان کا مجموعۂ خطبات اکاون ۵۱ خطبوں اور تقریروں پر مشتمل ہے۔ اگر موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی جائے تو اس مجموعے میں ادبی، سیاسی، مذہبی، تاریخی، طبی، معاشرتی اور عام نوعیت کے خطبات ہیں۔ دو خطبے فن موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض خطبات کسی خاص تحریک یا تقریب کے سلسلے میں ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل وغیرہ۔ بعض رخصتی تقاریر ہیں بعض خطبے نیم سیاسی اور نیم تاریخی ہیں۔ جنگِ عظیم کے موضوع پر جس قدر خطبے ہیں وہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ بعض خطبے ایسے ہیں جن میں رہنمایان قوم و ملت یا بانیان مذاہب کے

مستقل تصنیف و تحریر کی شکل میں پیش کرنے کے بجائے، اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ گویا آج جس طرح درسگاہوں میں علمی مسائل پر لکچر دیے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح عہد قدیم میں خطبات کا رواج تھا۔ فرق یہ ہے کہ آج لکچر ایک اضافی چیز ہے، مگر اُس زمانے میں ایک خطبہ ہی سب کچھ ہوتا تھا اور تعلیم و تدریس کا واحد ذریعہ وہی تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں سے مختلف موضوعات پر خطبے دلواتے تھے۔ یہ گویا ان کی علمی استعداد اور قابلیت کا امتحان ہوتا تھا۔ جوں جوں تحریر و کتابت کا رواج بڑھتا گیا، خطبات کی اہمیت و مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ یونان علم و حکمت کا گھر تھا اور اسی لیے وہ اپنے خطبا کی جادو بیانی اور علمی عظمت کے لیے مشہور ہے۔ یونان کے بعد علمی دنیا میں روما کا نمبر آتا ہے۔ رومی خطیب بھی تاریخ میں غیر فانی ہستی رکھتے ہیں۔ مشرق میں عربی خطبا اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے ضرب المثل ہیں، مگر عربی خطیبوں کی تقاریر میں (حضرت علیؓ کی نہج البلاغہ کے علاوہ) علمی مسائل کی اتنی فراوانی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی خطبا صرف اپنی زباندانی اور قدرتِ کلام کا اظہار کرنے کے لیے منبر خطابت کو زیب دیتے تھے۔ عہدِ جدید میں خطابت کا رواج عام طور پر بہت کم ہے۔ ہماری مُراد ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان میں مُقرر بہت سے ہیں مگر خطبا کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اگر کچھ خطیب ہیں بھی تو ان کے خطبے بہت کم قیدِ تحریر میں آئے ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ علوم و مصنفات میں شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم اور سر سید اعظم کے خطبات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان میں اور خطباتِ مُشران میں بیّن فرق ہے۔ وہ خطبے یا تو ایسے ہیں جو اوّل مضمون نگاری کے اصول پر قلمبند کر لیے گئے، اس کے بعد مجلس میں پیش ہوئے یا اُن میں صرف تقریر کی شان ہے، خطبے کا انداز بیان نہیں، نیز ان میں خطباتِ مُشران کی برابر تنوع موضوع بھی نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ہم ہر دو مذکور الصدر حضرات کی خطابت کی جامعیت کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ ان دونوں بزرگوں کے علاوہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، کوئی مستقل اور

فرانس کے عیر فانی ادیب ژان ژاک روسو کا مقولہ ہے کہ :-

" اگر تم کسی سوسائٹی کی دماغی اور تمدنی کیفیات کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اُس کے ادبی کارناموں کا مطالعہ کرو۔ یہ دیکھو کہ جس ادب کی وہ نمایندگی کرتی ہے وہ انقلاب و تغیر کے کتنے دَوروں اور عہد و زمانہ کی کتنی گردشوں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ جب تم اُس کے ادب کے مختلف ادوار سے واقف ہو جاؤ گے تو تمھیں اس سوسائٹی کی تاریخی رفتار اور تدریجی تبدیلیوں کا پتہ لگانے میں آسانی ہوگی "

ان لفظوں میں روسو نے ادب کو قوموں کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کی ذہنی کیفیت اور تدریجی ترقی کا معیار و مظہر قرار دیا ہے اور پھر ادب کی زبردست طاقتوں اور اس کے روحانی اور اخلاقی نتائج پر بحث کرتے ہوئے ، ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے :-

" ادب انسانی تصوّر کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصّبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے ۔ ادب کے مندر میں انسانیت کی دیوی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اپنے پجاریوں کو ذہن و دماغ اور علم و حکمت کی ایسی بلند ترین چوٹی پر لے جانا چاہتی ہے جہاں ، رنگ ، نسل ، خون اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں اور انسان کاہنوں ، مذہبی لیڈروں اور کلیسا کے علمبرداروں کی گرفت سے آزاد ہو کر حقیقی انسان بن سکے "

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مصنّف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ :-

" اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ مذہب کے نام پر کبھی لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں "

حقیقت بھی یہی ہے کہ ادب عالمگیر انسانی تصوّر کی نمایندگی کرتا ہے۔ وہ بین الاقوامیت کا ترجمان اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے ۔ حقیقی ادب وہی ہے جو اس معیار پر

اوصاف حسنہ پر سبق آموز تبصرہ کرکے ایک خطیب کے فرائض انجام دیے ہیں، جو کہ شاعر کے بعد سب سے پہلے اصلاح ملک و قوم کا فطری حق رکھتا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً پنڈت مُشران اُن گرا نمایہ قوم پرستوں میں سے تھے جو ہندوستان کی واحد قومیت، ہندوستان کے مشترکہ ادب اور ہندوستان کے تمدنی خصوصیات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم ملاپ کا ادبی اور انسانی سنگم تھی۔ اُن کے خطبات، اُن کی فراخدلی، صلح کل حکمت عملی اور انسانی عظمت و کمال کا گہرا اثر قلب پر ڈالتے ہیں۔ وہ ہماری اس ادبی تحریک کے علمبردار ہیں جو ہندو مسلم و دیگر اقوام ہند کی سوسائٹی کی مشترکہ ترقی اور ہم آہنگی کا نمائندہ ہے —— وہ ادبی تحریک جس کا پودا ہند و عجم کی معتدل آب و ہوا میں نصب ہوا، مغل حکومت اور ہندی ریاستوں نے اس کی آبیاری کی، عوام نے بارآور کیا اور پنڈت جی کے ایسے نیک نفس اور عالی ظرف ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

ہر زبان اور ہر ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی، معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے اور اُس زبان کے ادبیات میں صرف وہی تصنیف ایک باوقار جگہ پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے، جو اس مقصد سے بعید نہ ہو جائے۔ بنابریں یہ بیان کرنے سے پہلے کہ پنڈت جی کے خطبات میں کس حد تک یہ ادبی روح پائی جاتی ہے اور ان سے کس قدر وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو اُردو کی تخلیق میں مضمر تھا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اُردو کی ابتدا اور نشو و نما کے تاریخی مرقع پر ایک نظر ڈالی جائے اور اُردو ادب کے سماجی اور ذہنی پس منظر کو اور اُجاگر کر دیا جائے۔ یہ نہ صرف ایک دلچسپ علمی مشغلہ ہوگا بلکہ اس طرح ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ علم و ادب اور تمدن و تہذیب کی وہ کون سی فضا تھی جو پنڈت مُشران جیسے قوم پرست ادیبوں کو پیدا کرتی تھی۔ اس اہم مسئلے کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے بعد ہم پنڈت جی کے زیر نظر خطبات کی ادبی اہمیت اور علمی پایگی کے متعلق اظہار خیال کریں گے اور بتائیں گے کہ اُردو کے بازار میں، وہ کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

آہستہ آہستہ ہندوستان کا پوشیدہ جادو اُن پر اثر کر رہا تھا - وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی سماج میں غیر ارادی طور پر جذب ہوتے جا رہے تھے - جوں جوں ہندو اور مسلمان کے درمیان ارتباط بڑھتا جاتا تھا ، ایک ایسی قدرتی بولی خود بخود عالمِ وجود میں آتی جاتی تھی ، جو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب اور دلپسند تھی - یہ بولی تمام بندشوں سے آزاد تھی - یہ زبان تمام حدبندیوں سے بلند تھی - اسے ادیبوں اور شاعروں کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیا تھا - اسے عوام نے پیدا کیا تھا - یہ عوام کی گود میں پلی تھی - اسے سوسائٹی کے نچلے طبقے اظہار خیالات کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے - حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی تخلیق کا سہرا کسی جماعت کے سر نہیں باندھا جاسکتا - وہ خود بخود اس طرح وجود میں آگئی جس طرح تمام فطری طاقتیں مناسب وقت آنے پر ظہور میں آجاتی ہیں - برکھا رُت میں زمین پر جو ننھے ننھے پودے لہلہانے لگتے ہیں ، ان کی تخم ریزی کوئی نہیں کیا کرتا - موسمِ بہار میں جگہ جگہ جو پھول کھِل جاتے ہیں ، اُن کی آبیاری کسی کے ذمّہ نہیں ہوتی - قدرت ان معصوم پودوں کی خود دایہ گیری کرتی ہے اور انھیں پروان چڑھاتی ہے - ہماری زبان بھی اسی قدرتی عمل کا نتیجہ ہے - تاریخ کا ہاتھ تیزی کے ساتھ ہندو مسلم تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے رہا تھا اور اُردو اس نئی تہذیب کے بطن میں پرورش پا رہی تھی - مختلف قومیں ایک مرکز پر جمع ہو رہی تھیں - مختلف بولیاں ایک محفل میں بولی جا رہی تھیں - چمن میں بھانت بھانت کے پرندے تھے اور ہر ایک مختلف راگ الاپ رہا تھا - لیکن اس رنگا رنگی اور بیگانگی کے پردے میں ایک نیا یگانگت کا راگ پیدا ہو رہا تھا اور وہ نغمۂ نَو اُردو کا نغمہ تھا -

اُردو کی اصل برج بھاشا اور فارسی کو بتایا جاتا ہے - برج کے علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شیریں ہندی زبان تھی - جب مسلمان سندھ کو عبور کرکے شمالی ہند میں پہونچے اور دہلی نئی حکومت کا پایۂ تخت قرار پایا تو ہندو مسلم اختلاط اور بڑھ گیا - سب سے پہلے مسلمان نو وارد کی حیثیت سے سندھ کے سواحل پر لنگر انداز ہوئے تھے

پورا اُترے اور حقیقی ادیب وہی ہے جو اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے ــــ
ــــ آئیے متذکرہ حقیقتوں اور سچائیوں کی روشنی میں ہم اپنے ادب کا جائزہ لیں۔
روسو نے لکھا ہے کہ ادب سوسائٹی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں کا آلۂ حرکت پیما ہے۔ ادب کی انسانی قدر و قیمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ حقیقی ادب، حقیقی انسانیت کا ترجمان ہے اور اسی کے ذریعہ، انسانیت کے مختلف اجزا کو ایک رشتۂ اتحاد و اخوت میں پرویا جا سکتا ہے۔ یعنی بین الاقوامی اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ادب اور صرف ادب ہے۔

ادبیات اُردو کی تاریخ ظہور و آغاز، اس کی عہد بعہد تبدیلیوں اور ارتقائی مدارج پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو آسانی کے ساتھ ہم اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ سماجی ترقیوں اور متحدہ تہذیب و تمدن کی تشکیل و ترتیب کے مختلف مدارج میں کارفرما پا سکتے ہیں۔ اُردو ہندو مسلم کی شہرۂ آفاق تہذیبوں کا ایک ذہنی و دماغی سنگم ہے۔ اُردو کے حرف حرف اور نقطے نقطے پر ہندو مسلم اتحاد کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ درحقیقت اُردو کا ظہور ہی اس تاریخی ضرورت کے ماتحت ہوا کہ مسلم نو واردوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان کوئی مشترک رابطہ پیدا کیا جائے۔ قدرت نے ان تمدّنی و معاشرتی ضروریات کی تکمیل کے لیے اُردو کا سانچہ بنایا اور اگر ہم یہ کہیں تو بجا ہے کہ آج وہ مشترکہ قومیت جس پر ہم اس قدر نازاں ہیں، ادب اور زبان کے اسی قدرتی سانچے سے ڈھل کر نکلی ہے۔

جب مسلمان نو وارد کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو ہر قدم پر مہمان اور میزبان کو اختلاف زبان کی دقتیں محسوس ہونے لگیں۔ ہندوستان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر قوم کو اپنا لیتا ہے اور پھر وہ قوم ہندوستان کی دوسری قوموں سے اس قدر گھل مل جاتی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی اور اپنے اور پرائے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ مسلمان ابتداً ہندوستان کے لیے اجنبی تھے۔ وہ شروع شروع میں اس عظیم الشان برِاعظم کے اندر تنہا سے نظر آتے تھے، لیکن

اگرچہ ان کا سیاسی وقار بہت محدود تھا، لیکن اس کے باوجود سندھی زبان وتہذیب پر عربی ادب اور سماج کے جو نقوش ثبت ہوئے وہ محتاج اظہار نہیں سندھی زبان میں آج تک عربی الفاظ ومحاورات کی کثرت ہے اور وہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عربی کے یہ اثرات سندھ تک محدود رہے۔ شمالی اور وسطی ہند میں جو اسلامی نو وارد داخل ہوئے وہ عرب نہ تھے، ایرانی، افغانی اور ترک تھے۔ لہذا ہندوستان میں اس کے بعد جو تہذیبی اور ادبی تحریکیں بار آور ہوئیں، ان میں عربی اثرات سے زیادہ ایرانی و ترکی اور افغانی رنگ جھلک رہا تھا۔ چنانچہ اُردو جو ہندو مسلم ملاپ کا خوشگوار پھل ہے وہ عربی رنگ و بو کا سرمایہ دار نہیں بلکہ اس میں ایرانی حلاوت، افغانی پختگی، ترکی ذائقہ اور ہندوستانی رس، یہ چاروں عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سطور میں فرانسیسی ادیب "ژان ژاک روسو" کا ایک مقولہ نقل کیا تھا کہ:۔

"ہر قوم کا ادب اس کی تاریخی سماجی تبدیلیوں کا آئینہ ہوا کرتا ہے"

—— آئیے اُردو کے آئینے میں ہم ہندوستانی قومیت کی مختلف تاریخی اور سماجی تبدیلیوں اور تدریجی انقلابات کے خال وخط کا معائنہ کریں —— اگر ہم کسی ادبی تحریک کا تاریخی جائزہ لینا چاہتے ہیں تو خارجی شہادتوں سے قطع نظر تین پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی جائے گی تاکہ اس ادب کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جا سکے اور یہ بتلایا جا سکے کہ وہ تاریخی انقلابات کے کتنے دوروں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس ادب کی تعمیر کن کن زبانوں سے ہوئی ہے یعنی کن کن مختلف زبان بولنے والی قوموں نے ادب کو پیدا کیا ہے۔ بطور مثال آپ فارسی ادب پر ایک نظر ڈالیے۔ خود فارسی زبان کے الفاظ، محاورات، لسانی تراکیب، مصطلحات اور مصادر و افعال آپ کو بتلا دیں گے کہ فارسی ادب و زبان کو عربوں اور ایرانیوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ ایک داخلی شہادت ہے اس ادب کے تاریخی ظہور و ارتقا کی —— آج ہم صرف فارسی زبان کی ساخت سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں

اور آہستہ آہستہ مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں - ان ریاستوں کی سرکاری زبان عربی تھی اور ان کے درباروں پر بھی عربی تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا -

عربوں کی یہ ایک تاریخی خصوصیت رہی ہے کہ وہ جس سرزمین پر پہونچتے تھے اُسے اپنا لیتے تھے - وہ مقبوضہ علاقوں کے دل و دماغ کو بالکل اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے - ایران اس کی ایک بہترین مثال ہمارے واسطے مہیا کرتا ہے - ایرانیوں کو اپنی تہذیب و تمدن پر ناز رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ایشیائی قوموں میں ایرانی اپنی نفاستِ ذوق ، پاکیزگیِ فکر اور ذہنی و دماغی اوصاف کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں - فردوسی کہتا ہے کہ ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار ... عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کنند آرزو ... تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

لیکن جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو انہی اونٹ کا دودھ پینے والے بدویوں نے جمشید و کیخسرو کی سرزمین کے ذرّے ذرّے کو عربی رنگ میں رنگ دیا - عربی اثر سے ایرانیوں نے نہ صرف اپنا مذہب بدل دیا بلکہ اپنی قومی خصوصیات، اپنے ملکی رسوم، اپنی زبان ، اپنی ہزار سالہ تہذیب ، غرض اپنا سب کچھ اپنے فاتحوں کے حوالے کردیا - عربوں نے ایران کے جنت نظیر سبزہ زاروں پر ہی قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ ایرانی دل و دماغ کو بھی مسخر کرلیا تھا - بلاشبہ عرب بھی ایرانیوں سے متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی عربی روح تک کو بھول گئے - چنانچہ مورّخین کا اتفاق ہے کہ خلافت عباسیہ، عجمی تہذیب اور ایرانی اثر و نفوذ کا مکمل نمونہ تھی - یہ ایک ضمنی بحث تھی جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ عرب فاتحین کے ہاتھوں میں مسخر کرنے والے ہتھیار ہی نہ تھے بلکہ ان کے دماغوں میں دل فتح کرنے والی طاقت اور ان کی باتوں میں مَن موہنے والا جادو بھی تھا - ہندوستان میں کبھی خالص عربی حکومت قائم نہیں ہوئی - البتہ سندھ کے چند علاقوں میں کچھ دن کے لیے چند اسلامی ریاستیں برسرِ اقتدار آئیں -

رومی شاہنشاہیت کا ایک جزو تھا اور انگریزی دل و دماغ رومی اور یونانی اثرات سے معمور تھے - عربی ادب میں اسرائیلی اور مسیحی روایات کی موجودگی، عرب کی اُس ذہنی، دماغی اور سیاسی حالت کا قدرتی نتیجہ ہے جو قبل از اسلام وہاں پائی جاتی تھی- فارسی ادب میں عربی روایات کی کثرت، عربی ایرانی تعلقات اور مذہبی و تمدنی اتحاد کا واضح اور غیر مشتبہ ثبوت ہے -

کسی ادب کی تاریخی و تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس ادب کے نفسیاتی رجحانات کو روشنی میں لایا جاتا ہے - ہر ادب میں ایک مخصوص روح پائی جاتی ہے، جو اُس قوم کے اجتماعی مزاج سے پیدا ہوتی ہے جس نے اُس ادب کی تشکیل میں حصہ لیا- فارسی ادب کے رنگین و لطیف رُجحانات ایرانیوں کے قومی شعور اور اجتماعی مزاج کی پردہ دری کرتے ہیں - عربی ادب کے رُجحانات ایک مخصوص کیفیت رکھتے ہیں - یہ مخصوص کیفیت درحقیقت عربوں کے نفسیاتی پس منظر کا عکس ہے -

بہتر ہے کہ ہم اُردو کی تحریک ادبی اور تاریخی نشوونما کا جائزہ لینے کے لیے انہی تینوں طریقوں کو استعمال کریں - ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ شروع ہی سے تسلیم کر لیا گیا ہے) کہ اُردو، ہندو مسلم تہذیبوں اور قومیتوں کے امتزاج و اتحاد کا نتیجہ ہے - آیئے اس دعوے کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھیں -

(الف) اُردو زبان کی ساخت برج بھاشا اور فارسی کے ملاپ سے ہوئی ہے - اُردو کی لسانی تشکیل اس کی گواہ ہے- اُردو کے تمام افعال و مصادر و روابط و حروف ہندی اور خالص ہندی ہیں - اُردو میں پچاس فی صدی اسماء ہندوستانی بولیوں سے لیے گئے ہیں- اس کے معنی کیا ہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ اُردو دو قوموں کے ارتباط سے ظہور میں آئی ہے -ایک وہ قوم جس کی بولی برج بھاشا تھی - دوسری وہ قوم جو فارسی زبان استعمال کرتی تھی -آپ ہندو مسلم تہذیبوں کے اتصال کا حقیقی پرتو اُردو میں دیکھ لیجیے - کیا ضرورت ہے کہ آپ ہندو مسلم تعلقات و روابط

کہ یہ زبان ایک ایسی مشترک سوسائٹی نے پیدا کی تھی جو عربوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی - ان دونوں قوموں نے اپنے اپنے الفاظ، اپنے اپنے محاورات اور اپنی اپنی مصطلحات اس نئی زبان کو دیں اور یہ رفتہ رفتہ اپنی موجودہ شکل میں آگئی ـــــ ضمنی طور پر فارسی زبان کی تشکیل سے اُن تعلقات و روابط کا پتہ چلتا ہے جو عربوں اور ایرانیوں کے درمیان تھے - ہم اُس زمانے کی پوری تاریخ محض فارسی زبان کے مطالعے سے سمجھ سکتے ہیں ـــــ نئی فارسی زبان میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ ہمیں نظر آتے ہیں - یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فارسی کے دامن میں ان لفظوں کی موجودگی ایران کے جدید سیاسی انقلابات کا براہ راست نتیجہ ہے - جس طرح قدیم فارسی زبان کے مطالعے سے (جس پر عربی اثر غالب تھا) ہم عرب ایرانی روابط کی وضاحت کر سکتے ہیں اُسی طرح نئی فارسی زبان اُن تاریخی واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے جو ماضی قریب میں ایران کے اندر پیش آتے رہے اور اپنا دیرپا اثر ایرانی ادب اور سماج پر ڈالتے رہے -

ادب کی لسانی ساخت کے علاوہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ادب ماضی میں کن کن سماجی، تاریخی اور مذہبی ماحولوں سے گزرا ہے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے - وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادب کے روایاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے - یعنی یہ دیکھا جائے کہ اس ادب میں کس کس قسم کی ادبی، تاریخی اور مذہبی روایات کی نمایندگی پائی جاتی ہے - بطور مثال انگریزی لٹریچر یونانی علم الاصنام کی کہانیوں سے بھرپور ہے - عربی ادب میں یہودی روایات اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے - فارسی کی تمام تر روایات عرب سے ماخوذ ہیں - آپ فارسی ادب میں عشق و محبت کا قصصی اور مثالی کردار اگر تلاش کریں گے تو لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا اور یوسف زلیخا کے رومان قدم قدم پہ ملیں گے - فارسی ادب میں یہ روایات بالکل عام ہیں ـــــ انگریزی لٹریچر میں یونانی علم الاصنام کی جھلک رومی برطانی اختلاط اور اُن تاریخی واقعات کی صریحی شہادت ہے جو رومن امپائر کے عروج و کمال سے وابستہ ہیں، جب جزیرۂ برطانیہ

اشارہ کرتی ہیں۔ اُردو کی ساخت اور ادب اُردو کی مشترک روایات، ہندوستان کی قومیت مشترکہ کی نشانی ہیں۔ تاریخ نے ہمارے دلوں ہمارے دماغوں اور ہمارے ذہنوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ یہ سانچہ ادب اُردو کا سانچہ تھا، مشترک تمدنی روایات کا سانچہ تھا، متحدہ قومیت کا سانچہ تھا۔ اگر آج ادب اُردو کو ہمارے درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو متحدہ قومیت، مشترکہ ہندوستانی سماج اور ہندی ایرانی تہذیب (انڈو ایرین کلچر) کی تمام شاندار روایات مہمل ہو کر رہ جائیں گی۔ اُردو اور صرف اُردو اُن ہزار سالہ کوششوں کی شہادت دے سکتی ہے جو ہندوستانی قوموں نے باہمی یکجہتی اور اتحاد کے لیے سماج، تمدن، فلسفے، عقیدے اور تہذیب کے ہر گوشے میں کیں۔ ہم نے اپنی پیاری زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ بنا کر ٹوٹے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے دماغوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اُردو کے دامن میں ہر زبان کے لفظ ہیں، پنجابی، سندھی، فارسی، ترکی، عربی، بنگالی، مرہٹی، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، فرانسیسی۔ غرض مشرق و مغرب میں جتنی جاندار بولیاں اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب سے اُردو نے استفادہ کیا ہے۔ آپ ایک سرسری نظر ہی میں ان لفظوں کو تلاش کر سکتے ہیں اور اس سے اُردو کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چِتّا معمولی سا لفظ ہے جسے ہم روزانہ بولتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اُردو نے اسے پنجابیوں سے لیا ہے۔ باورچی، چلمن، آقا ترکی زبان سے لیے گئے ہیں۔ نیلام پرتگالی ہے۔ گلاس انگریزی ہے۔ یہ لفظ بطور مثال زبان پر آ گئے ہیں ورنہ اُردو کے خزانے میں مختلف النوع جواہر ریزوں کی کمی نہیں ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ج) یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارا ادب ہندوستان کی ہزار سالہ سماجی تبدیلیوں اور تمدنی ترقیوں کی کس حد تک نمایندگی کرتا ہے، ہم نے اُردو کی لسانی بناوٹ اور روایاتی پس منظر کو بطور تمثیل پیش کیا۔ اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر

کی تحقیق کے لیے تاریخی دلائل کے انبار لگا دیں۔ کیا فقط اُردو کی بناوٹ یہ نہیں بتاتی کہ ایسی ملی جلی بولی صرف وہی قومیں بنا سکتی ہیں جن کے دل و دماغ ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہوں۔

(ب) ادب اُردو کی روایات ہند و مسلم روایات اور علم الاصنام کے اتصال کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُردو ادب شجاعت و جوانمردی کی روایات کا مظہر جہاں رستم و سہراب کو قرار دیتا ہے وہاں ارجن اور بھیم کو بھی نہیں بھولتا۔ روایات عشق و محبت کی ترجمانی ہم فقط لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ نل دمن، بھونرا اور کنول، چاند اور چکور اور پپیہے اور کویل بھی عشق و محبت کے ادب اُردو میں بہترین کردار پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ادب میں یوسف کا حسن اور آدم و حوّا کی باہمی محبت ایک مثالیہ کیرکٹر کی حیثیت رکھتی ہے مگر جب عصمت و عفت کا آدرش قائم کرنا پڑے گا تو کون ہے جو سیتا کو بھول جائے۔ اُردو کا ادیب ظلم و شقاوت کا آئیڈیل نمرود و فرعون کے ساتھ راون کو بھی سمجھنے میں تامل نہیں کرتا۔ بیستوں کے افسانوں اور کوہ طور کے قصوں کے ساتھ ہم ہمالیہ اور بندھیاچل کے بھی گیت گاتے ہیں ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

— دجلے اور فرات کے کنارے گلگشت کرتے کرتے ہم گنگ و جمن کی وادیوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ نوروز اور شب برات کے ساتھ دیوالی اور ہولی کے تذکروں سے بھی ہمارا لٹریچر معمور ہے۔ موسم بہار کے جشن شگوفہ کی افسانہ طرازی کے دوش بدوش برکھا رُت کی البیلی رنگینیاں بھی ہمارے لٹریچر کے مرقع میں نظر آتی ہیں۔ ہماری عشقیہ مثنویوں میں راجا اندر کے اکھاڑے کے ساتھ کوہ قاف کے پریزادوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف ہے۔ غرضکہ آپ اُردو لٹریچر کا اوّل سے آخر تک جائزہ لیجیے، آپ کو ہند و مسلم روایات دوش بدوش نظر آئیں گی۔ یہ تمام چیزیں سماجی ملاپ کی گہرائی، مذہبی خیالات کی یکرنگی، اور ذہنی پس منظر کے اتحاد کی طرف

سادگی اور نرمی ہے تو دوسری طرف مغل ایرانیوں اور ترکوں کی شان وشکوہ۔ اُردو میں کبت بھی ہیں اور نظمیں بھی، دوہے بھی ہیں اور غزلیں بھی، ویدانت بھی ہے تصوف بھی، برہمنیت بھی ہے اسلامیت بھی، راجپوتی آن بان بھی ہے اور عربی شکوہ وشان بھی۔ اُردو ادب کا مزاج ہندوستانیوں کے عام اجتماعی مزاج کی طرح حلیم، بُردبار اور ملنسار ہے۔ انگریزی ادب وتمدن کے اثر سے ہمارے رجحانات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ادب اُردو ان کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہمارا قومی مزاج تاریخ کی دس گزشتہ صدیوں میں جن فکری منزلوں اور شعوری مرحلوں سے گزرا ہے، ہمارا ادب ان سب کے اثرات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ادب ہی کسی قوم کی سماجی اور فکری گہرائیوں کے ناپنے کا آلہ ہے۔

ان تمام حقیقتوں کے دُوہرانے کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان میں گزشتہ ہزار سال کے اندر جس قدر سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکری انقلابات ہوئے ان کی گود میں اُردو نے جنم لیا۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ ایک شدید انقلاب کی تمہید تھا۔ مسلمان ہندوستان کے دروازے میں داخل ہو کر ایک ایسی دنیائے قدیم کی حدود میں باریاب ہوئے تھے جہاں چار ہزار برس سے ایک مخصوص تہذیب کا دیا جل رہا تھا، علوم وفنون کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان بھی مصر، بابل، یونان، روم اور چین کی طرح اپنے شاندار ماضی پر فخر کر سکتا ہے۔ ہندوؤں نے دنیائے عتیق ہی میں اپنی ذہانت سے تہذیب کے اُن تمام مدارج کو طے کر لیا تھا جو دنیا کی دوسری قوموں نے سیکڑوں ہزاروں برس بعد طے کیے۔ ہندوستان کسی وقت بھی نیم وحشی اور غیر متمدن نہیں رہا۔ کم سے کم تاریخ کی جہاں تک یادداشت ہے اس نے ہمیشہ ہندوستان کو شعر، ادب، موسیقی، ریاضی، نجوم، ڈراما، قانون اور روحانیت کا گہوارہ پایا ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اگرچہ اس وقت یہ عظیم مُلک اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے عالمِ زوال وانحطاط میں تھا، مگر چار پانچ ہزار برس میں آریوں نے جس قدر دماغی وعلمی ترقیاں کی تھیں،

ہمیں ہندو مسلم تہذیبوں کو صحیح طور پر ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تو ان نفسیاتی رجحانات سے فائدہ اُٹھانا پڑے گا جو ادب اُردو کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر قوم کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہوا کرتا ہے اور اس کے ادب میں بھی وہی مخصوص قومی روح پائی جاتی ہے جو اس قوم یا اس سوسائٹی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انگریزی لٹریچر میں جو نفسی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی انگریزی ادب وشعر کے مطالعے سے آپ پر جو اثر پڑتا ہے، وہ حقیقت میں برطانی قوم کی مخصوص اجتماعی روح کا تاثر ہے۔ عربِ جاہلیت کے قصائد سے ہم آج بھی ایّامِ جاہلیت کی قومی روح کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم امرؤ القیس، زُہیر اور ایّامِ جاہلیت کے دوسرے شعرائے عرب کے قصیدوں میں عربی نفسیات، عربی شعور اور عرب کی اجتماعی زندگی کے نقوش کی جھلکیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایرانی لٹریچر ایرانیوں کی نفسی زندگی اور ان کے قومی تاثر واحساس کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُردو ادب کا بھی ایک خاص نفسیاتی مزاج ہے، ایک مخصوص اثر ہے جو اُردو نظم ونثر کا مطالعہ ہم پر ڈالتا ہے۔ اُردو لٹریچر کے رجحانات اور امکانات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف ادبی رجحانوں، مختلف سماجی نظریوں اور مختلف دماغی تحریکوں کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اُردو ایک ایسا جاذب ہے جو ہر نقش کو جذب کر لیتا ہے۔ ماضی بعید میں اس نے ہندی اور فارسی کی قابلیتوں کو چوسا۔ دکن میں پہونچی تو مرہٹی، تامل، تلنگو اور دوسری مقامی بولیوں کا دودھ پیا۔ دہلی دربار میں ترکوں سے سابقہ پڑا تو ترکی سے مانوس ہوگئی۔ جب اٹھارھویں صدی میں دانایانِ فرنگ نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو اُردو نے ان اجنبیوں کی آؤبھگت کی اور آج اُردو لٹریچر مغربی ادب سے جس قدر متاثر ہو چکا ہے وہ محتاجِ بیاں نہیں —— اُردو ادب کا مطالعہ ہمیں ایک خاص زاویۂ نظر قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ زاویۂ نظر ہے، ہندوستانی قومیت کے مخصوص رجحانات کا —— اُردو میں ایک طرف ہندو قوم کا حلم،

بادِ سموم سے کھلا کر رہ گئے ۔

بلا شبہ اُردو کی ترویج و ترقی میں اُن صوفیوں اور مبلغوں کا بھی کافی حصّہ ہے جو مذہبی تبلیغ یا خدا پرستی کے شوق میں عوام کی تہذیب و اصلاح کی غرض سے دور دور نکل گئے تھے اور خدا کی باتیں بندوں کو ان کی اپنی زبان میں سکھاتے پھرتے تھے ۔ صوفیہ کے تذکروں میں ان کے اکثر وہ ملفوظات و اقوال نقل کیے گئے ہیں جو اس دعوے پر بطور ثبوت و دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں ۔

جب ہم اُردو کے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ ہماری نظریں امیر خسرو پر ٹھہر جاتی ہیں جن کے گیت ہمارے گھروں میں آج تک گائے جاتے ہیں ، جن کی پہیلیاں ہمیں اب تک یاد ہیں ، جن کی کہہ مکرنیاں ، جن کے بول اور جن کی کہاوتیں آج بھی ادبِ اُردو کی قدامت کے نشان ہیں ۔ امیر خسرو ہندوستانی نژاد تھے ۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی میں جو کچھ لکھا وہ اپنی مادری زبان میں لکھا ۔ انھیں قدرت نے طبعِ موزوں اور قدرتِ نظم دی تھی، اس لیے وہ جو کچھ فرما گئے وہ ہمیں اب تک ازبر ہے مگر ان کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس زبان میں کچھ نہ کچھ کہا اور سُنا ہوگا لیکن ان کی گمنامی ان کے تمام کارناموں کو لے ڈوبی ۔ اس بحث میں یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اُردو کا حقیقی سرچشمہ ہندوستان کی کونسی بولی ہے ۔ ہمارے صوبے کے لائق مصنّف اور مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر تاراچند صاحب اُردو کی قومی اہمیت اور اس کی لسانی اصلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"اس وقت ہندوستان میں جتنی بولیاں مروّج ہیں ان میں سے کوئی بھی سنسکرت سے نہیں نکلی ۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جدید ہندی سنسکرت سے مشتق ہے ۔ وہ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی زبانوں میں کوئی بھی سنسکرت سے مشتق نہیں "

——اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تاریخی دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اُردو میں ہندو سماج کی مناسب حصّہ داری اور ان کی تمدنی زندگی کی پوری پوری نمایندگی

اُن سب کے نقوش باقی تھے ۔ البیرونی جو غزنویہ عہد میں ہندوستان آیا تھا جی کھول کر ہندوستانی کمالات کی داد دیتا ہے ۔ اس نے ہندوستانی علوم ریاضی کو حیرت اور تعجب کی نظروں سے دیکھا اور اپنے سفرنامے میں ہندوؤں کو دنیا کی سب سے زیادہ عالم و ریاضی داں قوم قرار دیا ۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے علوم اپنے ساتھ لائے، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کی زبان اور ان کی قومی خصوصیات ہندوؤں سے جُداگانہ تھیں، مگر اب یہ اجنبیت و بیگانگی باقی نہ رہ سکتی تھی کیونکہ اِدھر ہندوؤں کو بھی نئے مہمانوں کی مزاجدانی اور نئی دنیا کی ہمزبانی ضروری تھی ۔ مسلمان ہندوستان کو فتح کرنے نہیں اپنا وطن بنانے آئے تھے اور جس ملک کو وہ اپنا وطن قرار دے چکے تھے قدرتی طور پر وہ اس کے دوسرے باشندوں سے بیگانہ اور آزاد نہ رہ سکتے تھے ۔ جب دو برابر کی طاقتیں آپس میں ملتی ہیں تو کچھ دیر تک تو ان میں کشمکش کی سی کیفیت رہتی ہے لیکن اس کے بعد اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے یکجان و دو قالب ہوکر ایک ایسی بہتر و پسندیدہ تر شکل اختیار کرلیتی ہیں جس میں دونوں عنصروں کی بہترین صلاحیتیں موجود ہوں ۔ بسا اوقات دو مختلف پودوں کا پیوند بارآور ہوکر اس قدر لطیف، بامزہ اور خوشگوار پھل پیدا کرتا ہے کہ وہ خصوصیات پہلی صورت میں ہرگز نہ پیدا ہوسکتی تھیں ۔ ہندو مسلم تہذیبیں بھی اسی قانون قدرت کے ماتحت پہلے پہل متصادم رہیں لیکن اس کے بعد ان میں قربت و یکجائی پیدا ہونے لگی ۔ اس تہذیبی اتصال کے جو نتائج برآمد ہوئے اس کی سب سے زیادہ دلکش مثال اُردو ہے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اُردو میں شاعرانہ سرگرمیوں کا آغاز کب ہوا؟ تاریخ صرف اتنا پتہ دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلا شاعر جس نے اس نئی بولی کو مُنہ لگایا لاہور کے عہد غزنویہ کا ایک ادیب سعد سلیمان تھا ۔ سعد سلیمان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس نے ہندوستانی میں اپنا کچھ کلام مرتب کیا تھا، اتفاق کی بات ہے کہ سعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کی اس خصوصیت کا ذکر بھی کردیا ورنہ معلوم نہیں کتنے شوخ طبع لوگوں نے اس نئی بولی میں (جو ابھی تک عوام میں مروج نہ تھی) اپنی موزونیت طبع کے پھول کھلائے ہوں گے جو کہ بغیر مہکے ہوئے گمنامی کی

اور دوسری لسانی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں - ہزاروں محاورے باہم مشترک ہیں خیالات کے سانچے اور اظہار و بیاں کے طریقے یکساں اور یکرنگ ہیں - صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہ فرق زبان کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتا -

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب لکھا ہے کہ :-

"اُردو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہے ، جسے ہمارے بزرگوں نے اتحاد اور ملاپ کی نشانی کے طور پر ہم سب کے لیے چھوڑا ہے - ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اس انمول ورثے کی قدر کریں "

ہمارا سر عقیدت و ارادت کے ساتھ جُھک جانا چاہیئے ان بزرگوں کے آستانے پر جن کی پُر خلوص کوششوں نے ہماری قومی زبان کی تشکیل کی ، ہمیں مشترکہ خیالات و احساسات دیے ، مشترکہ سماجی طریقے ، مشترکہ رسمیں اور مشترکہ خصوصیتیں عطا کیں - یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلامی حکومتوں کے عہد میں ایک نئی بولی کو رواج دیا - جہاں گئے اُسے سینے سے لگا کر لے گئے ، جس محفل میں بیٹھے اسی کے گُن گائے - آج انھی کی کوششوں سے اُردو پشاور (سرحد) سے منی پور (آسام) اور سری نگر سے مدراس تک بولی ، سمجھی ، پڑھی اور لکھی جاتی ہے -

برادران ہنود اپنے علمی شوق ، اپنی ذہانت اور اپنی بے نظیر قوت آخذہ کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہیں - اسلامی حکومتوں کے زمانے میں انھوں نے بہت جلد حالات کا جائزہ لے کر اپنے کو مقتضائے حال کے متناسب اور متوازن بنالیا - انھوں نے فارسی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی اور عہد مغل کے شعراء کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً ایسے ہندو بزرگوں کی کافی تعداد ہمیں ملے گی جو فارسی زبان اور شیرازی لہجے میں داد سخن دیتے تھے - بنابریں مغلیہ عہد ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کا سنہرا عہد تھا - اکبر و جہانگیر کی قومی پالیسی نے ہمیں آپس میں اس قدر قریب تر کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قریب اپنا انفرادی وجود باقی رکھ کر ممکن نہ تھا - ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی رنگ میں شرابور اور ایک ہی کیفیت میں سرشار تھے - مغلیہ حکومت خالص ہندوستانی حکومت تھی - مغل بادشاہوں کے

پائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو اُردو کو ایک بدیسی زبان بتلانے کی جرأت کرتے ہیں ، اسی ضمن میں موصوف نے اُردو اور جدید ہندی کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں اور ایک ہی زبان کی دو شکلیں بتلایا ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ

"اُردو ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش احمقانہ اور طفلانہ ہے ۔ سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آمیز اُردو کا پروپیگنڈا کوئی صحت ور قومی تحریک نہیں کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کے رجحان اور علیحدگی کی پالیسی کو مدد ملتی ہے ۔ ہندوستان کی مشترکہ و عمومی زبان (لنگوا فرنیکا) میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزاء کی نمائندگی ہونا چاہیئے اور اس لیے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ پیدا کرے گی جو کسی ایسی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لیے کی جائے گی جس کی بنیاد ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو"

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلے پر آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجۂ ذیل خیالات کو بطور ثبوت پیش کیا ہے ۔ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ :-

" مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اُردو کو اب ایک دوسرے کے قریب تر آجانا چاہیئے "

مہاتما گاندھی نے اس بحث میں اس طرح حصّہ لیا ہے کہ :-

" میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کے ارکان دونوں بولیوں کو سیکھیں اور دونوں کے رسم الخط سے واقف ہوں اور اس کا پروپیگنڈا بھی کریں اور یہ سب اس اُمید پر کہ بالآخر دونوں مل کر ہندوستانی کے نام سے ایک بین الصوبجاتی زبان بن جائے گی ۔ پھر یہ تمیز نہ ہوگی کہ یہ ہندی ہے اور یہ اُردو ۔ بلکہ ہندی اور اُردو (جو اصلاً ایک ہی ہیں) مشترکہ ہندوستانی زبان کے طور پر ہر صوبے اور ہر گوشے میں استعمال کی جائیں گی "

حقیقت بھی یہی ہے کہ اُردو اور جدید ہندی کے افعال و مصادر، بناوٹ ، قواعد

اسلامی ریاستوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد جس قدر گہری تھی شمالی ہند کو بھی وہ خصوصیت حاصل نہ تھی اور اس کے کچھ تاریخی اسباب بھی تھے کیونکہ جنوبی ہند میں اسلامی حکومت کا قیام ایک برہمن اور ایک مسلمان کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا ۔

دکن میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ایک طویل داستان ہے ۔خود قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کے فرمانروا اس نئی زبان کے سرپرست تھے ۔جب قدرت نے دکنی عظمت و اقبال کی بساط اُلٹی اور بیجاپور اور گولکنڈے کی اسلامی ریاستیں تباہ ہوئیں تو اہل کمال کا یہ جمگھٹا منتشر ہو گیا ۔مغل حکومت نے جنوبی ہند میں اپنا مستقر جاہ و اقبال اور مرکز جاہ و جلال اورنگ آباد کو قرار دیا ۔جہاں عالمگیر کے موکب شاہی کے ساتھ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے تمام ارباب فضل و کمال اور شعراء جمع ہو گئے ۔

جدید اُردو ادب کا باوا آدم ولی دکنی کو سمجھا جاتا ہے (اگرچہ محققانہ زاویۂ نگاہ سے یہ صحیح نہیں) ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ بتلایا جاتا ہے ۔ممکن ہے کہ اورنگ آباد ان کا آبائی وطن نہ ہو لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اورنگ آباد اسکول کے ایک نامور رکن تھے ۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کے تمام ادبی حلقے اس نئی زبان کے ترانوں سے گونج رہے تھے مگر شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چلتا تھا اور شمالی ہند کے ہندو اور مسلم ارباب کمال اردوئے معلیٰ میں کچھ کہنا اپنے علم و فضل کی توہین سمجھتے تھے ۔ وہ اگر کبھی اس نئی زبان میں کچھ کہتے بھی تھے تو برسبیل نشاط و تفنن ـــــ لیکن جنوبی ہند میں دکنی اُردو کا ہی بول بالا تھا ۔ وہاں بادشاہ ، اُمراء اور عوام اپنی زبان ہی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے ۔شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ولی دکنی کا جنوبی ہندوستان سے دہلی آنا اُردو تاریخ کا ایک سُنہرا باب ہے ۔ ولی اپنے ساتھ اپنا اُردو دیوان بھی لائے اور اس شان سے آئے کہ دہلی میں ولی ہی ولی نظر آنے لگے ۔ہمیں اس موقع پر اُردو کی مفصل تاریخ پر نظر ڈالنا نہیں ہے ۔ سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، اس کا منشا صرف اتنا تھا کہ عہد مغل کی ادبی روح بے نقاب ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس زمانے کی ادبی فضا ، قومی اشتراک

ترکی خون میں ہندوستانی روح دَوڑ رہی تھی - انھوں نے ہندوستان کے درمیان سے ہر قسم کی غیریت اور بیگانگی ختم کردی تھی - مغل تاجداروں نے ہندو رسوم و عادات کو اپنا لیا تھا - ان کے درباروں پر ہندو مُسلم ملاپ کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا - مغلیہ حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اُورنگ زیب کے درباروں میں مسلمان شعراء اور اربابِ قلم کے پہلو بہ پہلو ہندو شعراء اور اہلِ فکر بھی دادِ سخن دیتے تھے - چنانچہ اس زمانے میں ہم اکثر ہندو شعراء کے نام دیکھتے ہیں۔ چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر تھا - ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

--- چندر بھان برہمن کا دیوان دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہا مگر تذکروں میں ان کے جتنے شعر بھی ملتے ہیں لاجواب اور انتخاب ہیں - چندر بھان برہمن کے علاوہ اور بہت سے ہندو شعراء ہندوستانی قومیت کے اس سُنہرے زمانے میں موجود تھے۔ کیا عجیب لطف ہے کہ اس زمانے میں ہم اکثر مسلمانوں کو سنسکرت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پاتے ہیں - ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور عہد اکبری کے دوسرے اُمراء سنسکرت اور ہندی ادب کے بہترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ درحقیقت مغلیہ عہد میں تمام فرقہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے - ہندو اور مسلم تہذیبیں اس طرح ایک دوسرے سے آمیز اور یکجاں ہوگئی تھیں کہ مذہب، خیالات، عقائد، فلسفے اور تاریخ کے تمام مختلف طریقے اور مظاہر فنا ہو گئے تھے - اس میں شک نہیں کہ اکبر اعظم نے متحدہ ہندوستان کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بہت جلد نکل آئی اور اب تک اُردو کے بھیس میں ہمارے سامنے یادگار کے طور پر موجود ہے -

جس زمانے میں اکبر شمالی ہند میں اس جدید ترقی پذیر ہندوستانی قومیت کی سرپرستی اور آبیاری کر رہا تھا اُس زمانے میں جنوبی ہند کے اسلامی فرمانروا بھی اس فرض سے غافل نہ تھے - عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے درباروں پر بھی ہندوستانی اثرات چھائے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جنوبی ہند کی

تاریخ اُن ناموروں کے تذکروں سے معمور ہے جو ہمارے لٹریچر میں بلند ترین درجہ رکھتے ہیں۔ اُردو کا کون بھی خواہ ایسا ہوگا جس کا سر عقیدت اُردو نثر کے زندۂ جاوید ادیب اور اُردو افسانہ نگاری کے موجد و پیشرو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سامنے خم نہ ہو جائے، جن کا فسانۂ آزاد اور سیر کوہسار اُردو ادب کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے سماجی زندگی کی تصویرکشی کی اور کردار نگاری کے اصول سے آشنا کیا۔ اگر اُردو ناول نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو اولیّت یا اولویت کا درجہ حاصل ہے تو اُردو مثنوی نگاروں کی تاریخ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا نامِ نامی بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں، جن کی مثنوی گل بکاؤلی، حسنِ بیاں، شکوہِ ادا، نزاکتِ تخئیل، کمالِ فن، قدرتِ سخن اور محاسن لفظی و معنوی کا ایک جمیل شاہکار ہے۔ یوں تو اُردو زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر جو شہرت اور مقبولیت سحرالبیان اور گلزارِ نسیم کو حاصل ہوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان میں سے اوّل الذکر مثنوی خدائے سخن میر انیس کے جدِ مرحوم میر حسن کی رعنائیِ فکر کا نتیجہ ہے اور ثانی الذکر پنڈت دیا شنکر نسیم کی موزونیتِ طبع کا شاہکار ——— پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد ادبی دنیا میں چکبست کا نام آتا ہے جو براہمنۂ کشمیر کے نامور رکن تھے۔ چکبست کا مقام ہمارے شعرا میں کس درجہ بلند ہے؟ اس حقیقت کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ مرحوم متاخرین شعرائے اُردو کے اس طبقے میں تھے جو جدید رنگِ سخن کے اعتبار سے سخنورانِ متقدمین میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی چکبست بھی اقبال، اکبر، حالی، اور شوق قدوائی کی ادبی بزم کے معزز رکن تھے۔ ان کی شاعری کا پس منظر قومی احساس کی کارفرمائی اور ہندوستان کے سیاسی انقلابات پر مشتمل ہے۔ پنڈت چکبست پر لکھنؤ کی سرزمین بجا طور پر نازاں ہے۔ چکبست کی نظمیں، چکبست کے مقالات اور چکبست کے مضامین، غرض چکبست کا تمام مجموعۂ نظم و نثر، علوئے تخئیل، عذوبتِ بیان، گیرائیِ نظر، ہمہ گیریِ طبع، حسنِ ادا اور لطافتِ اظہار کا ایک طلسم ہے۔ عہدِ جدید میں کون ہے جو سر تیج بہادر سپرو، علامہ برج موہن دتاتریہ اور پنڈت موتی لال مرحوم کی سیاسی ذہانت، ادبی خدمات اور قومی جوش و خروش کو نظرانداز کر سکے۔ پنڈت موتی لال مرحوم آج اگرچہ

اور ذہنی اتحاد کا کتنا مکمل نمونہ اور کتنا شاندار منظر تھی۔

اب ہمیں اس بحث میں ایک خاص نقطے تک پہونچنا ہے۔ یوں تو ہندوستانی قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت نے اپنی پیاری زبان اور اپنے قومی ادب کی تشکیل میں حصہ لیا لیکن اگر ہم اُردو ادب کے مشاہیر شعر و سخن کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا پڑیگا کہ اُردو شعراء کے ہندو طبقے میں کایستھ اور براہمنۂ کشمیر کا جس قدر حصہ ہے، اس کی مثال ہماری سوسائٹی کا کوئی دوسرا حلقہ مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ کایستھ حضرات اور کشمیری پنڈتوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے اُردو ادب پر غیر معمولی احسانات کیے۔ ان دونوں برادریوں میں اُردو فارسی کا ذوق اب تک عام ہے۔ آپ آج بھی کشمیری خاندان میں بہت سے فضلاء اور ادبا کو پا سکتے ہیں۔ کشمیر کی صحت مند، توانا اور ولولہ خیز آب و ہوا بے اثر نہیں رہ سکتی۔ کشمیر کی جو فردوس بداماں وادیاں، روح پرور پھول کھلاتی ہیں وہ ولولہ خیز دل و دماغ بھی پیدا کرتی ہیں۔ عرفی نے کہا ہے

هر سوخته جانے که به کشمیر در آید　　　گر مرغ کباب ست که با بال و پر آید

اللہ اللہ جس سرزمین بہشت آئین میں یہ خصوصیت ہو کہ وہ مرغ کباب کو دولت بال و پَر اور مشت خاک کو نعمتِ برگ و ثمر بخش دے، وہ انسانی دل و دماغ، انسانی ذہن و روح بلکہ انسانی وجدان و ضمیر کو کن کن الہامی طاقتوں اور روحانی تازگیوں سے معمور نہ کر دیتی ہوگی۔ کشمیری پنڈت اپنی غیر معمولی ذہانت، اپنی طبعی ذکاوت اور اپنی جودتِ فکر کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اسی خانوادۂ علم و ادب اور گہوارۂ ذہانت و ذکاوت سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی آپ اصلاً کشمیر کے ایک معزز برہمن خاندان کے رکن تھے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اپنے اس تعلق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

مرا بنگر که در هندوستاں دیگر نمی بینی　　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

علامۂ اقبال مرحوم کو اُردو اور فارسی ادبیات کی تاریخ میں جو بلند پایہ اور غیر فانی مقام حاصل ہے اس کا اظہار بے سود ہے۔ علامۂ اقبال سے قطع نظر کشمیری پنڈتوں کی

تو مجتہد ادب اور امام فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ۔ علمی نقادوں اور ادبی کارکنوں کی صف میں ان کے علمی ذوق اور ادبی سرگرمی کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے ۔ یہ تو وہ نام ہیں جو کشمیری ادیبوں کے تذکرے میں بے ساختہ زبانِ قلم پر آ گئے ۔ ان کے علاوہ کتنے ہی ادیب، کتنے ہی اہلِ قلم اور کتنے ہی مفکر اس خانوادۂ علم و ادب میں پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہیں گے ۔ آج مغربی علوم کی گرم بازاری نے عام ہندوستانیوں میں مشرقی ادبیات کا ذوق و شوق بہت حد تک کم کر دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیری اربابِ مذاق کا تعلق ہے وہ مغربی علوم میں دستگاہ کامل اور مہارت تام حاصل کر لینے کے باوجود بھی اپنے مشرقی علوم سے کسی نہ کسی حد تک دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں ؎

کسیکہ محرم بادِ صبا ست می داند   کہ باوجود خزاں بوئے یاسمیں باقیست

ہمارے ممدوح پنڈت سندر نراین مشران مرحوم کا تعلق بھی اسی نامور علمی برادری سے تھا ۔ پنڈت جی کی نظر کس قدر عمیق، فکر کس درجہ روشن اور ادبی فطرت کتنی ہمہ گیر اور رنگ رنگ تھی، اس کا اندازہ تو خطباتِ مشران کے مطالعے ہی پر موقوف ہے ۔ لیکن ان کی زندگی بھی علم و ادب اور خدمت و ایثار کے اعتبار سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے اور وہ ہر وقت ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے ۔ آئیے ان کے کمالات ادبیہ اور نوادر علمیہ کے تذکرے سے قبل پنڈت جی کی حیات مستعار کے بعض پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کہ اسلاف کی زندگی اخلاف کے لیے ایک درسِ عمل، ایک اُسوۂ ترقی اور ایک سیرت تمثیلی ہوتی ہے، جس کے آئینے میں آنے والی نسلیں اپنے خد و خال اور اپنے مستقبل کے نقش و نگار کا مشاہدہ کیا کرتی ہیں ؎

نام نیک رفتگاں ضایع مکن   تا بماند نام نیکت یادگار

پنڈت سندر نراین مرحوم فرخ آباد کے ایک معزز و موقر خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ آپ نے ایک ایسی فضا اور ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جو علم و ادب کے تذکروں سے معمور تھا ۔ ان کے والد ماجد پنڈت لچھمی نراین مشران، فرخ آباد کے مشہور رئیس اور بزرگ تھے ۔ آپ کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور مفتوں تخلص

ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے لائق فرزند اور ہندوستان کے جلیل القدر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے والد بزرگوار کے ذوق علم و ادب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ:۔

"بچپن میں انھوں نے رواج کے مطابق عربی و فارسی تعلیم حاصل کی تھی اور تمام عمر مشرقی لٹریچر کے مطالعے کا شوق انھیں دامنگیر رہا۔ اس معاملے میں اُن کی نظر بہت وسیع اور معلومات ہمہ گیر تھیں ۔ وہ قدیم ہندوستانی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے"

——خود پنڈت جواہر لال نہرو کی ابتدائی تعلیم ہدایوں کے ایک فارسی عربی داں منشی کے زیر اہتمام ہوئی تھی، جن کی شاندار داڑھی اور غدر کے بیان کردہ درد انگیز افسانوں کا تذکرہ پنڈت جی نے کمال دلچسپی سے اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے مورثِ اعلیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارے مورثِ اعلیٰ کو فرخ سیر بادشاہ دہلی اپنے ہمراہ کشمیر سے لائے تھے۔ وہ عربی فارسی کے علامہ تھے اور ہمارے خاندان میں ان کی جو تصویر محفوظ ہے وہ مغلیہ لباس میں ہے۔ اس تصویر میں وہ ایک شاندار مغل کے روپ میں نظر آتے ہیں"

ان بیانات سے کشمیریوں کی سماجی زندگی، مشترکہ ہندوستانی قومیت سے ان کا لگاؤ اور عربی فارسی کی طرف ان کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو فقط ملک کے ایک سرکردہ مدبر اور مقنن ہی نہیں ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو کے صدر مستقل بھی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کو اپنی قومی زبان، اُردو سے جو شغف ہے اس سے اُردو کا ہر بہی خواہ واقف ہے۔ اکیلے سر تیج بہادر سپرو نے اُردو کے لیے جو کام کیا ہے اُسے ہزار آدمی بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ تمام ہندوستانی رہنماؤں میں سر تیج بہادر سپرو کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زبان کے مسئلے کو اس کی صحیح اسپرٹ میں دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مشترکہ تمدنی ورثے کی حفاظت میں زبان اور قلم دونوں سے جہاد کرتے رہتے ہیں۔ علامہ برج موہن دتاتریہ

اور تحریر و تقریر کی یہ جامعیت اور زبان و قلم کی یہ مہارت بہت کم انسانوں کے حصّے میں آتی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ ہر بزم کی رونق اور ہر سبھا کا سنگھار تھے۔ عوام و خواص آپ کی تقریر سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ جب کسی جلسے میں آپ کی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو پبلک کا ذوق و شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی تقریر، فصاحت و بلاغت، حسنِ بیاں اور تاثیرِ ادا کا ایک طلسم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ و معانی کا ایک بحرِ بیکراں ہے کہ اُبل رہا ہے۔ آپ کو لفظوں پر قدرتِ کامل اور ادائے خیالات کی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے اور تقریر کے دَوران میں تاریخی لطائف اور ادبی نکتے اس خوبی سے پیش کرتے جاتے تھے کہ مجمع پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خشک سے خشک موضوع کو آپ کی سحر بیانی اور ہمہ دانی رنگین اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔

آپ کی تقاریر میں کس قدر ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور دلائل و براہین کی دربست، موضوع سے مطابقت اور علمی مواد کی کس درجہ فراوانی ہوتی ہے؟ اس کے ثبوت میں یہی خطبات پیش کیے جا سکتے ہیں، جن کے متعلق یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ اپنی اصل شکل میں ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی گئی۔ پنڈت جی کی زبان سے جو لفظ جس نہج و اسلوب سے ادا ہوا تھا، اس مجموعے میں وہ اسی نہج و اسلوب سے موجود ہے۔ درحقیقت یہ مرحوم کی تقاریر کا اصلی ریکارڈ ہے۔ انصاف کیجیے، کیا کسی معمولی اور غیر قادر الکلام خطیب اور مقرر میں یہ روانیِ بیان اور یہ تسلسل ادا پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے؟

آپ کی درخشاں زندگی کی یہ خصوصیت بیان کرنا لازم ہے کہ آپ قومی امراض کے صرف نبّاض ہی نہ تھے بلکہ چارہ گر بھی تھے۔ جہاں آپ کی زبان دردِ قومی کی مرثیہ خوانی کرتی تھی، وہاں آپ کا ہاتھ عقدہ ہائے ملک و ملّت کا گرہ کشا بھی تھا۔ دنیا میں علم و عمل کا امتزاج بہت کم دیکھا گیا ہے۔ فردوسی نے سیستان کے ایک شہزور کو قولاً رستم بنا دیا ؎

منش کردہ ام رستم داستاں — وگرنہ یلے بود در سیستاں

فرماتے تھے - پنڈت لچھمی نراین مشران مرحوم سماجی اعتبار سے بھی ایک بلند پوزیشن رکھتے تھے - آپ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج اور درویش صفت انسان تھے - اس اعتبار سے شعر و ادب کا علمی ورثہ بھی ذوق پنڈت سُندر نراین مشران مرحوم کے لیے نہ صرف ذاتی اور انفرادی دلچسپی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ وہ ان کے والد بزرگوار کا روحانی ترکہ اور معنوی ورثہ بھی تھا ، جس کی قدر و قیمت صرف وہی محسوس کر سکتے تھے - خود بھی اپنے والد مرحوم کی طرح علوم عربیہ میں دستگاہ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کے خطبات و تقاریر کے حرف حرف سے ملتا ہے -

پنڈت مشران مرحوم کا دل دردِ قومی اور سوز و گداز ملّی کا آتشکدہ تھا - انھیں سماجی اصلاح اور خدمت ملک و وطن کی سچی دُھن تھی - وہ فطرتاً ایک اعتدال پسند اور روشن خیال انسان تھے - شروع ہی سے انھوں نے اپنے آپ کو قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا اور چونکہ وہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہنگاموں سے گریز کرتے تھے اور جذبات کی اندھا دھند رہنمائی کے بجائے عقل و شعور کی روشنی میں قدم اٹھانے کے عادی تھے ، اسی لیے پبلک کے ہر طبقے میں ان کی قدر تھی - حکام ان کے پُر خلوص تعاون کے خواستگار رہتے تھے اور عوام ان کی مدبرانہ رہنمائی کے اُمید وار - اپنے مُلک کے اخلاقی انحطاط اور دماغی زوال کو دیکھ کر ان کا حساس دل برداشت نہ کر سکا اور انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات خطبات کے ذریعے ادا کرنا شروع کیے - سچائی ضایع نہیں جاتی ، خلوص رائگاں نہیں ہوتا ، پنڈت جی کی زبان پر سچائی ، دل میں خلوص اور ہر تیور میں عزم صمیم کی جھلک تھی - کیسے ممکن تھا کہ ان کی عظیم شخصیت اپنے معاصرین سے اپنی اہمیت و جامعیت کا لوہا نہ منوالیتی - تھوڑے ہی عرصے میں وہ فرخ آباد کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت بن گئے اور ہر انجمن ان کے تذکروں سے اور ہر سبھا ان کے چرچوں سے معمور نظر آنے لگی ؎

زفرق تا بہ قدم ، ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مرحوم کو قدرت نے فقط جادو نگار قلم ہی نہیں دیا تھا بلکہ سحر کار زبان بھی عطا کی تھی -

"مشران صاحب تاریخ، فلسفہ، سیاست، ادب اور عمرانیات
کے بہترین عالم ہیں، جن کی ادبی و علمی خدمات فرخ آباد میں پبلک لائبریری
قائم کرنے اور اس کی بقا کے اسباب فراہم کرنے کے باعث کبھی فنا نہیں ہو سکتیں"
یہ پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ ہیں، جو اُن دماغوں میں سے تھے، جن پر ہندوستان
کو بحیثیت مجموعی آج تک فخر ہے۔

مشران مرحوم بہ حیثیت انسان بھی اپنی مثال آپ ہی تھے۔ حد درجہ سیر چشم،
مہمان نواز، متواضع اور خلیق۔ ان کا مکان اہل کمال کا مرکز تھا اور ان کی صحبت بزرگانِ سلف
کی بزم آرائی کا نمونہ، فرخ آباد کے تمام ادارے بلا امتیاز مذہب و ملت ان کے دستِ کرم
کے ممنون اور چشمِ التفات کے محتاج تھے۔ وہ قومی کاموں میں جی کھول کر حصہ لیتے
تھے اور شاید ہی ملک کی کوئی ایسی مفید تحریک ہو جس میں مشران مرحوم پیش پیش نہ رہے
ہوں اور اپنی انتھک کوششوں سے اپنے دائرۂ اثر میں اسے کامیاب نہ بنایا ہو۔

پنڈت جی فطرۃً معتدل اور احتیاط پسند دل و دماغ کے مالک تھے اور غالباً وہ
تمام ہندوستانی رہنما، جو بعد میں سیاسی اعتبار سے انتہا پسند اور باغی کہے جانے لگے،
اپنی پبلک زندگی کے آغاز میں اعتدال پسند سیاست دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ گاندھی جی
کی سیاسی زندگی کا یہ واقعہ دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ پچھلی جنگِ عظیم میں انھیں جنگی خدمات
کے صلے میں خوشنودی سرکار کا پروانہ اور تمغا ملا تھا، مگر پچھلی لڑائی ختم ہونے کے بعد جو سنگین
واقعات رولٹ ایکٹ، پنجاب کی فوجی بھرتی اور جلیانوالہ باغ کی خونچکاں شکل میں
پیش آئے، انھوں نے ہندوستانی لبرل ازم کا خاتمہ کر دیا اور ماضی کے اعتدال پسند
حال و مستقبل کے سب سے بڑے باغی اور انتہا پسند بن گئے۔ پنڈت سندر نراین مشران
نے گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر مساعی جنگ کے سلسلے میں جو تقاریر کی تھیں وہ اس مجموعے
کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۸ء لغایت ۱۹۲۱ء کے حادثات
سے قبل وہ سیاسی حیثیت سے کس نظریے پر عامل تھے اور کس درجہ سلامت روی، سنجیدگی
اور خود ضبطی ان کا شعار تھا۔ لیکن لڑائی ختم ہونے پر ملک میں جو سیاسی زندگی شروع ہوئی

—— مگر عملاً خود دربار غزنوی سے اپنے لیے انصاف بھی نہ حاصل کر سکا۔ مقصد یہ ہے کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر پنڈت مشران مرحوم کی زندگی علم و عمل کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور محسوس کرتے تھے اُسے کرتے اور عمل میں بھی لاتے تھے۔ پنڈت جی تمام عمر فرقہ وارانہ کشمکش اور جماعت بندی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے مگر انھوں نے ع

نشستند و گفتند و برخاستند

پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ فرخ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے یونٹی بورڈ قائم کیا اور عرصے تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی قول و فعل کی صحیح عظمت اپنی پوری شان سے نظر آتی ہے۔

یوں تو مرحوم نے اپنے ادبی ذوق کی بہترین یادگار خطبات کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑی ہے لیکن فرخ آباد پبلک لائبریری کا ذرّہ ذرّہ بھی آپ کی علمی خدمات کا ایک مستقل نقش پیش کر رہا ہے۔ محض علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور پبلک کے مذاق کی اصلاح کے لیے، آپ نے ۱۹۰۰ء میں اس لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا اور اپنی زندگی ہی میں اس کی ترقی و بقا کے تمام سامان فراہم کر دیے۔ جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو ۱۹۳۳ء میں پبلک نے اعتراف خدمات کے طور پر لائبریری ہال میں پنڈت جی کے نام کا سنگ یادگار نصب کر دیا، جو ابد الآباد تک علم و ادب کے ساتھ مشران کی وابستگی کا مستقل و مستحکم ثبوت دیتا رہے گا۔ آپ نے اس لائبریری میں ہر علم و فن اور ہر زبان و ادب کی بہترین کتابیں جمع کر دی ہیں اور اس لائبریری کے ذخائر علم و ادب اور نوادر حکمت و تحقیق کو دیکھ کر پنڈت جی کے ذوق انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس لائبریری کا محل وقوع بھی بہت دلچسپ اور پُر بہار ہے۔ شاید حافظ کے اس مصرع کا صحیح استعمال اسی مقام پر ہو سکتا ہے کہ ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو نے آپ کی خدمات کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا کہ

کہ ناگہاں مشران کی زبان سے ایک شعر ادا ہوا اور خاموشی چھاگئی ۔ لوگوں نے سمجھا کہ وجد وحال کا غلبہ ہے مگر حقیقت اور کچھ تھی ۔ زندگی کا ساز آخری نغمے کے بعد خاموش ہوگیا ؎

مرگیا ۔ صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

کیا ایسی شاندار موت کسی اور شاندار زندگی کو بھی نصیب ہوئی ہے ؟ کیا شعروادب کی محفل میں کسی اور شاعر و ادیب نے بھی یوں جان دی ہے ؟ بیشک شہیدِ ادب کا خطاب مشران ہی کے لیے ہے اور وہ واقعی شہیدِ ادب تھا بھی ۔

یقیناً مشران کی موت قابلِ فخر موت ہے ۔ اگر زندگی فنا اور زوال کی کشمکش سے آزاد بھی ہوتی تب بھی جینے والے ایسی موت کی خواہش کرتے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خطباتِ مُشران پر ایک تنقیدی نظر!

تمہید ۔ فنِ خطابت ۔ ادب و سماج ۔ اُردو کے محرکات ارتقاء اور اسبابِ ظہور ۔ اُردو میں ہندو مسلم ادبا کا حصّہ ۔ ہندوستانی قومیت اور مشترکہ سماج کی تشکیل ۔ نونہالانِ کشمیر کی ادب نوازیاں اور پنڈت مشران مرحوم کی زندگی کے خصوصیات ۔ ان تمام ابتدائی اور وسطی مرحلوں سے گزر کر اب ہم اس بحث کے اختتامی یا مرکزی نقطے تک پہونچ رہے ہیں ۔ اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اُردو کی تاریخی اہمیت اور پنڈت جی کی انفرادی خصوصیات کی ایک دلچسپ داستان تھی ۔ ناگزیر تھا کہ مُشران کی ادبی روح اور ان کے خطبات کی صحیح اور حقیقی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان تمام نقاطِ بحث کو چھیڑا جائے ۔ کیونکہ ہم نے اپنے ممدوح (ہیرو) کو ایک ایسے ادیب کی شکل میں پیش کیا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا مکمل نمونہ اور ادب اُردو کا سچا خادم تھا ۔ ہم نے اس بحث کا خاصہ حصّہ ایک خاص مسئلے کی تشریح و وضاحت میں صرف کردیا ہے ۔ وہ مسئلہ بدقسمتی سے

اور پنجاب میں جو حادثات پیش آئے انھوں نے پنڈت جی کے صبر و احتیاط کے بند توڑ کر جذبات کی سیل تند رو کو آزاد کر دیا ۔ جس طرح جلیانوالہ باغ کے سانحۂ خونیں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر ربیندر ناتھ ٹیگور نے سر کا خطاب حکومت ہند کو واپس کر دیا، اسی طرح پنڈت جی نے بطور احتجاج سرکاری اعزاز و مناصب ترک کر دیے اور آنریری مجسٹریٹی اور منصفی سے دستبردار ہو گئے ۔

ایک مرتبہ سیاست کے میدان میں اُترنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ مشران کسی سے پیچھے رہیں ۔ اب وہ کانگریس کی روح رواں تھے ۔ تحریک خلافت کے دست و بازو تھے ۔ نوجوان ان کی جرات عمل پر دنگ اور پیران آزمودہ کار ان کے جوش و خروش پر انگشت بدنداں تھے ۔

بہت کم مشاہیر دنیا میں ایسے گزرے ہیں جن کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح شاندار اور پُرعظمت ہو ۔ مشران کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح موثر اور یادگار تھی اور یہ ان کی خصوصیت بھی بے نظیر اور عدیم المثال ہے ۔ ۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو فرخ آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ تھا جس کی شرکت کے لیے دیگر ارباب کمال کے علاوہ، شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی بھی فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی ۔ سخن فہموں، سخن سنجوں اور سخن گویوں کے اس بلند پایہ اجتماع کی مسند صدارت پر مشران جلوہ گر تھے ۔ مشاعرے کا آغاز پورے ذوق و شوق اور جوش و خروش کے عالم میں ہوا ۔ مشران خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے ۔ مجمع پر ایک نظر ڈالی ۔ موزوں لفظوں میں شعرا اور ارباب سخن کا تعارف کرایا، پھر مشاعرے کے اغراض و مقاصد واضح کیے ۔ اس کے بعد ادب اُردو پر ایک عالمانہ تقریر شروع کی ۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت پنڈت جی پر عجب کیفیت طاری تھی ۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تمام روح لب و دہن میں سمٹ آئی ہے اور علم و حکمت کے دریا بہا رہی ہے ۔ درمیان میں جا بجا موزوں اور برجستہ اشعار پڑھتے جاتے تھے ۔ خود بھی وجد میں تھے، سامعین بھی وجد و کیف کے عالم میں تھے۔

پنڈت جی نے اکبر اعظم کی مساعی اتحاد کی طرف اشارہ کر کے ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے اُن پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے جن پر ہم سطور بالا میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ آپ نے اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا ہے اور تاریخی اعتبار سے صحیح تر بھی یہی ہے کہ ہندی اور اُردو کی لسانی بناوٹ میں کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبات میں جا بجا اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود ان کے خیالات، اس حقیقت کی واضح تفسیر تھے۔ پنڈت جی کو اسلامی تاریخ، اسلامی ادبیات اور اسلامی روایات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے کس طرح ہندوستانی قوموں کے اتحاد کے لیے روایات، تہذیب، عقائد، فلسفہ اور خیالات کے مشترک سانچے بنائے تھے اور انہی مشترک سانچوں میں قومیت متحدہ کی پرورش ہوئی، جو آج ہم سب کے لیے باعث افتخار ہے۔

پنڈت جی کے خطبات و تقاریر کا مطالعہ گہرے ادبی مسائل کی واقفیت اور علمی، تاریخی نکات کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ چٹکلوں میں وہ گُر بتا جاتے ہیں جو مستقل علمی تصانیف کی ورق گردانی کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ان خطبات کے مطالعے سے نظر میں وسعت اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں پنڈت جی کے بعض خطبوں کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے جائیں۔ آپ نے شعر و شاعری کی عظمت پر جو خطبہ ۲۸ ر اپریل ۱۹۲۸ء کو ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، حقیقتہً وہ بجائے خود ایک جامع مقالہ ہے جو فن شعر کی عظمت اور شعراء کے اندازِ بیان پر تحقیقی روشنی ڈالتا ہے۔ ضمنی طور پر اس خطبے سے پنڈت جی کے زور بیاں اور تسلسل کلام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بغیر کسی تحریری یادداشت کی مدد کے، اتنے اہم موضوع کو کمال خوبی اور تسلسل سے کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

آپ نے اس خطبے کے آغاز میں شعراء کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ عرب اپنے شاعروں کو کس قدر عزیز و قابل فخر سمجھتے تھے۔ مثال میں پنڈت جی نے

اُردو اور ہندی کے فرقہ پرستانہ تصادم کا مسئلہ ہے - اس سلسلے میں ہم نے ڈاکٹر تارا چند ورسر تیج بہادر سپرو کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں - اب ہم پنڈت مُشران مرحوم کے زاویۂ نظر کی تشریح کرنا چاہتے ہیں -

تاریخی طور پر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ زبان جس کو ہم لوگ اُردو، ہمارے بزرگ ہندی اور غیر ملکی ماہرین السنہ (گیرسن و تاسی وغیرہ) ہندوستانی کہہ کر پکارتے ہیں، کوئی بدیسی بولی نہیں ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے - جس میں ایرانی، ترکی، عربی اور بعد کو عربی ادبیات کی رنگ آمیزیاں شامل ہوگئی ہیں - یہ زبان یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور یہیں بولی جاتی ہے - آپ اسے اُردو کے نام سے پُکاریے یا ہندی کہیے - ناموں کی تبدیلی سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا - یہ زبان ہزار برس کی سماجی ترقیوں اور تمدنی ملاپ کا نتیجہ ہے - آئیے دیکھیں، پنڈت مشران اس مسئلے میں کیا رائے رکھتے ہیں - آپ نے ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے اُردو ہندی مسئلے پر ان لفظوں میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ :-

"لوگ آج کل اُردو ہندی کے سوال کو مذہبی رنگ میں پیش کرکے غلامانہ ذہنیت کی بنیادیں مستحکم کر رہے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی زبان کاٹنے پر تُلا ہوا ہے - یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر دونوں گونگے ہوگئے تو متمدن اقوام کی نظر میں ہندوستان کی کیا وقعت رہ جائے گی - ہم کو قومی تعمیر اور ملکی تنظیم کے لیے اس غیر ضروری سوال کو چھوڑ کر دوسری سیاسی گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے - اُردو کہو یا ہندی، میرے خیال میں یہ دونوں ایک ہی زبان کے دو نام ہیں - اگر اُردو کو عربی اور ہندی کو سنسکرت نہ بنایا جائے تو نتیجے میں ہم ہندو اور مسلمانوں کی زبان وہی ایک رہ جاتی ہے، جو مصلح قوم اکبر اعظم کی تربیت کردہ اور ہندو مسلمان اتحاد کی بولتی ہوئی یادگار ہے"

درحقیقت پنڈت جی کے متذکرۂ بالا الفاظ ہماری تمام خامہ فرسائی کا نچوڑ ہیں -

وہ سناؤں گا "

——خطبے کا یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ (کاش سننے کا موقع ملتا!) آپ نے ماہیت شعر کی وضاحت ارسطو کے بیان سے کی ہے جس کی غیر فانی کتاب "بوطیقا" فن شعر پر دنیا کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ارسطو نے شعر کی جو تعریف کی ہے اُسے آپ نے بیان کیا ہے :-

" شعر ایک قسم کی نقالی یا مصوری کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور مادی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات و خیالات کی مصوری پر قادر ہے "

اس کے بعد آپ نے ادبی کتابوں میں شعر کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یعنی :-

" وہ کلام جو متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو "

——پھر اس منطقی تعریف کی جرح و تعدیل کر کے نظامی عروضی سمرقندی کے خیالات پیش کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جان اسٹوارٹ مل نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کا ایشیائی ناقدوں کی تعریف سے موازنہ کیا ہے اور اصل حقیقت اس طرح ظاہر کی ہے کہ :-

" شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب نے بیان کیا ہے اور نہ اس قدر وسیع ہے جتنا علمائے عرب و عجم کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ شعر کی ماہیت وہی ہے جو ارسطو نے بیان کی ہے یعنی جذبات انسانی اور مناظر قدرت کی تصویر کشی "

——اس کے بعد پنڈت جی نے اصول بلاغت کی رو سے شعر کی تحلیل کی ہے اور بتلایا ہے کہ شعر دراصل شعور و احساس کا نام ہے لہذا شاعر وہی ہے جو احساسات و تاثرات کی صحیح اور قدرتی ترجمانی کر سکے۔ ماہیت شعر کے بیان کے بعد آپ نے اجزائے ترکیب شعر کا ذکر کیا ہے کہ شعر دو عناصر پر مشتمل ہے ' مادہ اور صورت ' مادہ

کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا ہے جس سے شاعر کی قدرت وطاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ ؎

یکے را زمہ اندر آرم بچاہ   یکے را ز چہ برفرازم بماہ

—— جس کو چاہوں خاک میں ملا دوں اور جس کو چاہوں آسمان پر بٹھا دوں۔ عربی شعراء کے اثر واقتدار کے تذکرے کے بعد، آپ نے عجمی شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور بطور مثال فردوسی اور محمود کا واقعہ پیش کیا ہے کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتوں کا نام ونشاں مٹا دیا اور بڑے بڑے سلاطین کی ہستی کو خاک میں ملا دیا مگر دہقان[1] زادۂ طوس یعنی فردوسی کے چند شعر نہ مٹا سکا جو اس نے محمود کی ہجو میں کہے تھے۔ بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا   بماند ہجا تا قیامت بجا

پنڈت جی کی تاریخی نظر بہت وسیع اور بہت ہمہ گیر ہے۔ یہی نہیں کہ عربی وعجمی شعرا کے حالات ہی ان کے پیش نظر ہیں بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ہر ورق بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ چنانچہ اسی خطبے میں وہ ہندوستانی درباروں کی شاعر نوازی اور شعر فہمی پر ان لفظوں میں روشنی ڈالتے ہیں کہ:۔

"سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایران کے بڑے بڑے شعرا اپنا وطن مالوف چھوڑ کر ہندوستان کھنچے ہوئے چلے آتے تھے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ مراد قرار دے دیا تھا۔ مغل سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب وزینت سمجھتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے"

ان تاریخی واقعات کے اعادے کے بعد آپ نے حقیقت شعر کے علمی موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ آپ کے اپنے الفاظ میں:۔

"صاحبو! میں نے شعروشاعری کی عظمت اور شعراء کی قدرومنزلت آپ کی خدمت میں عرض کی۔ اب میں شعر کی حقیقت مختصراً بیان کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں

---

[1] غزنوی شعرا نے ازراہِ تحقیر فردوسی کو یہی خطاب دیا تھا ۱۲

وہ حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔ معترض کو یہ بتانے کے لیے کہ ایشیائی شاعری کا دامن اخلاقی موتیوں سے خالی نہیں ہے، پنڈت جی نے متعدد شعر پیش کیے ہیں، اور پھر ان سے جو اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، انھیں شمار کرایا ہے اور کہا ہے کہ:۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ ایشیائی شاعروں نے اخلاقی مضامین نظم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ گلستاں اور بوستاں ہی میں جتنے اخلاقی مسائل پیش کیے گئے ہیں ان کا شمار ناممکن ہے"

سلسلۂ بیاں کو نیا ربط دے کر آپ نے توارد، سرقہ، ترجمہ اور استنباط کے موضوع پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ضرورت ہے کہ ہمارے نوآموز یا نوخیز شعرا انھیں غور سے پڑھیں اور اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ اس بحث میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ توارد شعرا کے درمیان ممکن ہے اور وہ عیب نہیں۔ البتہ خیالات کا سرقہ ہو یا لفظوں کی چوری یہ دونوں چیزیں ادبی دنیا میں بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہیں جتنا قانونی دنیا میں۔ ہاں غیر زبانوں کے شعروں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے، مگر خوبی یہ ہے کہ غیر زبان سے کوئی مضمون اگر اخذ کیا جائے تو ترقی کے ساتھ کہ اس سے ادب مالامال ہوتا ہے۔ لیکن اگر سلیقے اور اہتمام سے ترجمہ نہیں کیا گیا تو وہ ایک حرکت باطل اور فضول محض ہے۔ دوسرے کے مضامین کو خود سلیقے اور اہتمام کے ساتھ نظم کرنا بجائے خود ایک صنعت ہے۔ پنڈت جی نے اس صورت کو مستحسن قرار دیا ہے اور مثال میں سعدی کا ایک شعر پیش کیا ہے

ترا ہر آشنا باید بہ شہر دیگر رفت — کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

——پنڈت جی اس شعر کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا ہے مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب کو یہ مشورہ دینا کہ تم اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں چلے جاؤ کیونکہ یہاں تمھاری دلبری کے لیے کوئی دل باقی نہیں رہا یہ ایک نازیبا سی بات ہے۔ لہذا انھوں نے اسی مضمون کو

یعنی مضمون اور صورت یعنی ترکیب و بندش۔ اسی ضمن میں محاکات اور تخئیل پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے اور محاکات اور مرقع نگاری کے درمیان جو فرق ہے اُسے واضح کیا ہے۔
مرقع نگاری کی مثالیں آپ نے سکندر نامے اور شاہنامے سے پیش کی ہیں اور فردوسی کے کمالات سخن کو جی کھول کے سراہا ہے اور یہ آپ کی سخن فہمی کی روشن دلیل ہے۔ پنڈت جی نے فردوسی اور نظامی کے درمیان ایک مرقع نگار اور فطرت شناس شاعر کی حیثیت سے جو فرق بیان کیا ہے اور جن قوی دلیلوں سے فردوسی کی عظمت سخن ظاہر کی ہے وہ موقع لاجواب ہے۔ یہ تمام چیزیں اگرچہ علامہ شبلی نے شعرالعجم میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں مگر دونوں میں حال دقال کا فرق ہے۔ پنڈت جی نے اُن تمام دلائل کو نئے انداز سے اپنے خطبے میں پیش کیا ہے اور جا بجا اپنی ذاتی بصیرت و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل سے ان بحثوں کو دُہرا سکیں اور نہ شاید اس کی ضرورت ہی ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ پنڈت جی کے خطبات ادبی نقطۂ نظر سے کس قدر جامع اور تاریخی اعتبار سے کس قدر مکمل ہیں ——
پنڈت جی کی سخن شناسی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُردو شعرا میں ان کا محبوب انیس ہے۔ انھوں نے انیس کو ہر موقع پر بطور مثال پیش کیا ہے۔ انیس کی فطرت شناسی انیس کی واقعہ نگاری، انیس کی منظر کشی، انیس کی رفعت تخئیل، غرض انیس کی شاعری کے ہر ہر پہلو کو ہر ہر موقع پر بے نقاب کرتے ہیں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کا شاندار ثبوت دیتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس خطبے میں بھی آپ نے جا بجا انیس کے مرثیوں سے مثالیں دی ہیں اور ضمناً شہدائے کربلا کا اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ان کی تاریخی بصیرت اور معلومات پر بے ساختہ تحسین و آفریں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کی ماہیت و ترکیب کے بیان اور مکمل بیان کے بعد ضمناً آپ نے ایشیائی شاعری پر اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ

"ایشیائی شاعری اخلاقی اور اصلاحی خیالات و مضامین سے تہی دامن ہے اور دور از کار باتوں سے بھری پڑی ہے"

—— اس اعتراض کا جواب پنڈت جی نے جس قابلیت اور وسیع النظری سے دیا ہے

ان میں یہ التزام رکھا ہے لیکن ہندوستانی شعرا اس التزام کو نہیں برتتے
اور یہ ان کی غلطی ہے ''

پنڈت جی نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے بعد بلاغت کی تعریف نقل کی ہے:۔

"صاحبو! بلاغت کی تعریف علما نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ (بعض نے) بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلاغت کا جزو اعظم ہے بلاغۃُ الکلامِ تطابقُ المقام، یعنی یہ کہ کلام حسب مقام ہو"

—— پھر بتلایا ہے کہ آخر علمائے معانی نے بلاغت کی یہ تعریف ناقص قرار دی اور اب بلاغت کا جزو فصاحت بھی قرار پایا۔ لیکن ہارون رشید عباسی کے عہد میں پھر اس تعریف پر اعتراض کیا گیا تھا۔ ہارون کا قول تھا:۔

"احسن الکلام ما قلّ و دلّ"

—— "اب بلاغت کی تعریف یہ قرار پائی۔ کلام حسب مقام ہو، کلام میں فصاحت ہو اور عبارت ما قلّ و دلّ ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں"

—— اس کے بعد پنڈت جی نے بلیغ نثر کی مثالیں پیش کی ہیں اور سالار عساکر عباسیہ طاہر ذوالیمینین کی ایک عبارت نقل کی ہے اور پھر اس عبارت سے جو بلیغ نکات اخذ کیے ہیں، حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہی نہیں کہ اصول بلاغت کی تشریح میں آپ نے صرف نثر ہی کے نمونے پیش کیے ہوں بلکہ نظم کی طرف بھی توجہ کی ہے اور مقبل و انیس کے مراثی کے بعض ٹکڑے پیش کیے ہیں کہ نہ صرف موضوع پر مکمل روشنی پڑتی ہے بلکہ کلام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

پنڈت جی کے خطبات میں بعض وقت افسانہ در افسانہ اور داستان پس داستان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بہت لطف دیتی ہے اور خطیب کی اصلی شان ہی

ترقی دے کر شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ؂

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

ایک دوسرے ادبی خطبے میں آپ نے نظم و نثر کے موضوع پر گلفشانی کی ہے اور بلیغ نکات پیدا کیے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فصاحت کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ:۔

"فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں....... مثالاً یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود فصیح ہے لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے۔ الفاظ کا بھی یہی حال ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اس کے گرد و پیش ایسے متناسب اور موزوں الفاظ جمع کر دیے جائیں کہ وہ آپس میں میل کھا جائیں اور یہ دلیل کمال فصاحت کی ہے"

—— اس کے بعد میر انیس کے بعض مصرعے آپ نے مثال میں پیش کیے ہیں اور اس قابلیت سے ان کی خصوصیاتِ فصاحت کو واضح کیا ہے کہ ہر نکتہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے علاوہ قاآنی کا ایک شعر بھی دلیل میں لائے ہیں ؂

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر — ملاطش نافۂ اذفر، حصاتش لولوئے لالا

—— پنڈت جی نے اس شعر کی جو فنی تحلیل کی ہے وہ ان کی ادبی بصیرت کا شاہکار ہے۔ اسی ضمن میں عجمی اور ہندوستانی شعرا کے فارسی کلام کا موازنہ کیا ہے اور بڑی دلچسپ مثالوں سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ عجمی اور ہندوستانی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مشرآن مرحوم نے ایک فنی نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"بعض شاعر صنعتِ سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی وہی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے " باید مطلع از صنعت سجع عاری باشد"، چنانچہ شعرائے فارس نے اس صنعت میں جس قدر قصائد لکھے ہیں

یعنی آواز نہ دے ۔ الخ"

اسی طرح پنڈت جی نے قرأت شعر کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے اور خصوصیت سے یورپ کے اہل کمال کا ذکر کیا ہے ۔ کہتے ہیں :۔

"پروفیسر ہارٹلے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس فن کے ماہر تھے۔ وہ جب شعر پڑھتے تھے تو خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے ۔میرے خیال میں ہندوستان میں خدائے سخن میر انیس فن انشاد و خوانندگی کے ماہر و امام تھے"

پنڈت جی ذوق سلیم اور مذاق صحیح کے مالک تھے ۔جہاں وہ ادبیات اُردو کے محاسن اور خوبیوں کو تمام و کمال سمجھتے تھے وہاں وہ اس کے نقائص اور اسقام پر نکتہ چینی اور تنقید کرنے میں بھی دلیر تھے ۔آپ اپنے خطبے میں اُردو شعراء اور ادیبوں کو اس طرح مشورہ دیتے ہیں :۔

" اب وہ وقت آگیا ہے کہ نظم اُردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں ۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اس کو پستی زوال سے ابھار کر اوج کمال پر پہنچانے والے جذبات ، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین ۔ اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں اور اس کے ساتھ آداب شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے تو عام طبائع کے نزدیک پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو۔ اگر یہ ترمیم نظم اُردو میں ہو جائے (جو بالفعل ہو رہی ہے) تو پھر اُردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی "

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ایشیائی ادب میں الفاظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ:۔

" ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھانا ہے ۔آداب و اخلاق کے مضامین، جن کی کمی ہرگز نہیں ہے ، ایسے پیرایے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا برتاؤ پورا پورا ہو جائے ۔جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور رہو ۔ ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ

یہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرے ۔ چنانچہ اسی خطبے میں فصاحت و بلاغت کی بحث کرتے کرتے انھوں نے فن انشاد (شعر خوانی) کے اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے ۔ اُردو ادب کے لیے یہ بحث شاید نئی ہے ۔ فن تجوید و قرات پر ہماری زبان میں اکثر کتابیں لکھی گئیں مگر فن شعر خوانی پر کوئی رسالہ موجود نہیں ہے ۔ البتہ مرحوم حامد علی خاں صاحب امروہوی بار۔ایٹ۔لا نے اپنے سفرنامۂ انگلستان میں ضمنی طور پر اس فن کا تذکرہ کیا ہے اور انگلستان کے بعض ماہرین فن کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے پنڈت جی فرماتے ہیں کہ

"کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا ۔ بہرحال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود تلاش مجھے نہیں ملا ۔ میں اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی[1] ہوگا "

اس کے بعد پنڈت جی نے اس فن کے اصول بیان کیے ہیں اور چند شعر بطور مثال پیش کیے ہیں اور ان کی خوانندگی اور قرأت کا طریقہ بتلایا ہے ۔ مثلاً

نہال باغ علتیں ۔ بہار مرغزار دیں ۔۔۔ نسیم روضۂ یقیں ۔ شمیم دوحۂ طاہا

اس شعر کی خوانندگی کا آپ نے جو طریقہ بتلایا ہے ۔ اُسے آپ کے ہی لفظوں میں سُنیے :۔

" مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم روضہ اور شمیم دوحہ پر زور دینا چاہیئے ۔ جب یہ شعر اس طرح پڑھا جائے گا تو شعر کی خوبی دہ چند نہیں ہزار چند ہو جائے گی "

پنڈت جی نے خوانندگی شعر کے عیوب ان لفظوں میں بیان کیے ہیں :۔

" یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظی کی جگہ مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظی پڑھتے ہیں "

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست ۔۔۔ بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

۔" بہ " کی " ہ " ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیئے کہ " بہ " کی (ہ) " از " کی (ز) میں مل کر آواز دے اور " از " کا (ا) گر جائے

---

[1] خدا معلوم یہ رسالہ مرتب ہوا یا نہیں بہرحال مرحوم کے کتب خانے میں دستیاب نہیں ہوا ۔ البتہ پنڈت جی کا دوسرا رسالہ فن تذکیر و تانیث ملا ہے ۔ اُمید ہے جلد اشاعت پذیر ہوگا ۔

بقیہ خطبات میں چار خطبے خالص اسلامی مباحث پر ہیں۔ سیرۃ النبیؐ، عید قرباں، علمائے اسلام کا شکریہ اور مصطفےٰ کمال کی فتح --- ہم ان خطبات پر آیندہ سطور میں روشنی ڈالیں گے۔ اسلامی خطبات کے علاوہ مذہبی رنگ کے چند خطبات اور ہیں۔ ان میں سے دوؔ خطبے تھیا سوفی کے موضوع پر دوؔ خطبے مسیحیت کے متعلق اور بقیہ راماین اور دسہرے وغیرہ کے موضوع پر دیے گئے تھے۔ تھیا سوفی کے موضوع پر پنڈت جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دلی خیالات کا عکس ہے کیونکہ تھیا سوفی (ویدانت یا تصوف) سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ ان کی زندگی کا نصب العین ایک شعر تھا ؎

کفر ست در طریقت ما کینہ داشتن   آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اور تھیا سوفی ازم، صلح کل کا علمبردار ہے۔ لہٰذا پنڈت جی کو تھیا سوفی ازم سے دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ اسلامی موضوعات پر پنڈت جی نے جو کچھ فرمایا ہے شاید ہی کوئی اسلامی خطیب اس پر کچھ اضافہ کر سکے۔ ہم نے مقدمے کی ابتدا میں ژاں ژاک روسو کا ایک مقولہ نقل کیا تھا۔

"ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے الخ"

--- آپ خطبات سرشار کو اس مقولے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ ان کے حرف حرف کو پڑھ جائیے۔ آپ کو حقیر ترین تعصبات کی گندگی اور امتیازات آئین و ملت کی آلودگی کہیں نظر نہ آئے گی۔ وہ یقیناً اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ:-

"اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ کہیں مذہب کے نام پر لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں"

--- واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جی کا مذہب انسانیت اور عقیدہ بین الاقوامیت تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ان کے اسلامی خطبات سے ہو سکتا ہے۔ موصوف یوم میلاد النبیؐ کے خطبے کا آغاز ان لفظوں سے فرماتے ہیں کہ:-

"صاحبان ذیشان! آج کا روز دلفروز خود نوروز ہے اور یہ روزِ سعید بجائے خود یوم عید ہے۔ ہندو مسلم بھائیو! جناب پیغمبر صاحب کے اوصاف حمیدہ

کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش میں حقیقت واقعہ سے دور جا پڑتا ہے ——
انگریزی نظم ہرگز زبان نہیں سکھاتی ۔ نہ اس میں ردیف وقافیہ کی پابندی ہے ۔
اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہوتا ہے "
ہندوستانی اور فارسی شعراء کی پوزیشن ان لفظوں میں صاف کرتے ہیں کہ :۔

" شعرائے ہندو پارس میں بہت شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید و بکار آمد مضمون باندھے ہیں ۔ اور بایں ہمہ صفت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے "

اس کے بعد اسیر لکھنوی کے بہت سے شعر بطور استناد پیش کیے ہیں اور اپنے نظریے کو بدلائل واضح ثابت کیا ہے ۔

مختصر یہ کہ پنڈت جی کا ادبی نظریہ ، ان کی جامعیت تنقیدی ، ان کی استعداد علمی اور ذوق کے شایان شان ہے ۔ ان کے خطبات ، لطیف ادبی نکتوں سے معمور ہیں ۔ سب سے بڑی خوبی ان کی قوت تمثیل ہے ۔ چونکہ ان کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا اس لیے وہ جس نکتے کو بیان کرتے تھے اس کے ثبوت میں صدہا تاریخی حکایات اور متقدمین کے اقوال نقل کر دیتے تھے ۔ وہ عربی ، فارسی اور مغربی ادبیات سے کما حقہٗ آگاہ تھے اور اس منطقی ترتیب سے اپنے دلائل پیش کرتے تھے کہ قبول کر لینے کے سوا چارہ نہ تھا ۔
—— یہ سب کیا تھا ؟ ۔ درحقیقت یہ کرشمہ تھا اُس ماحول کا جس میں ہمارے علم دوست ہیرو نے آنکھیں کھولی تھیں ۔ وہ ماحول جس میں ، ہنود ، اسلامی علوم ، کمال رغبت سے حاصل کرتے تھے اور مسلمان ہندو ادبیات اور ہندو روایات سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے ۔ دونوں کی رسوم مشترک تھیں ۔ دونوں کا فلسفہ مشترک تھا ۔ من و تو کا امتیاز مٹ گیا تھا اور کامل اتحاد و اتفاق کا دَور دَورہ تھا اور اُردو اس وحدت کاملہ کا مظہر تھی جس کے متعلق پنڈت جی نے کہا ہے کہ :۔

" اُردو مصلح قوم اکبر اعظم کا عطیہ اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے "

ہم بیان کر چکے ہیں کہ پنڈت جی کا مجموعۂ خطبات ۱۵ خطبوں پر مشتمل ہے ۔ جس میں ادبی خطبات تین ہیں ۔ ادبی خطبات پر ہم ایک سرسری نظر گزشتہ سطور میں ڈال چکے ہیں ۔

اس کا اندازہ ناممکن ہے کہ آپ کو اساتذۂ عرب و عجم کے کتنے منتخب اشعار حفظ تھے نثر میں
برمحل نظم کا استعمال کرنا بھی ایک فن ہے اور سپرو مرحوم بلاشبہ اس فن کے مجتہد تھے -
معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شعراء میں فردوسی، سعدی اور میرزا حبیب قاآنی ان کے محبوب شاعر
تھے اور اسی چیز سے ان کی سلامتی طبع اور صحت مذاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے -

یہاں تک موصوف کے جن خطبوں کا ذکر ہوا ان کے علاوہ بقیہ خطبات گو کہ اپنے موضوعات
کے لحاظ سے مختلف اور رنگ رنگ ہیں لیکن زبان و بیان کی پاکیزگی، روانی اور سلاست و
فصاحت کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ پنڈت جی کی زبان میں بلا کا
لوچ ہے، غضب کی آمد ہے - وہ کہیں محاورہ بندی اور روزمرّہ کا کمال دکھلاتے ہیں اور
کہیں مسجع عبارت لکھتے ہیں - دونوں جگہ زبان کی گھلاوٹ اور قدرت کلام مزہ دیتی ہے -

اس سلسلے میں اگر ان کے خطبات کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کیے جائیں تو بحث
کا دامن بہت وسیع ہو جائے گا اور وقت کی کمی اور فرصت کا اختصار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔
مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ان کا ہر خطبہ اپنی جداگانہ ادبی اہمیت رکھتا ہے - وہ نہ صرف
اپنے بیش بہا علمی مواد کے لحاظ سے اپنے مطالعے کی خاموش سفارش ہے بلکہ اپنے حسن ادا
اور زبان و بیاں کے اعتبار سے بھی اپنی دلچسپی کی منہ بولتی شہادت ہے -

تاریخی خطبات جو جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے
موضوع کی عظمت کے لحاظ سے ہماری خاص توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور جی چاہتا
ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے مگر ہم اس وقت صرف ان کا خاکہ پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے
تاکہ نکتہ رس ماہرینِ فنِ تاریخ اس خاکے کو پڑھ کر اندازہ کر لیں کہ مضمون نگار نے اس موضوع
کے کسی بھی دقیق اور اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا - یہ بتایا جا چکا ہے کہ پنڈت جی اپنی پبلک
زندگی کی ابتدا میں ایک اعتدال پسند اور محتاط شخص تھے چنانچہ ان خطبات میں حرف حرف
سے آپ کی معتدل و محتاط سیاست دانی کا پتہ چلتا ہے اور مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہی
ہوتی ہے کہ قائل کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہو - اس زمانے میں ہندوستانی
سیاست جس نقطے پر تھی اس کے لحاظ سے لبرل ازم ہی مناسب تھا - ہر سہ خطبات کا

اور اخلاق پسندیدہ کا احصا کرنا اس ضیق وقت میں محال بلکہ لاطائل خیال ہے۔
دریا کو کوزے میں بند کریں کیا مجال ہے۔ لہذا بطور مشتے از خروارے اور قطرۂ از
دریا بارے عرض کروں گا "

——— اور پھر اس مرصع تمہید کے بعد بطور مشتے از خروارے آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کہیں سیرۃ رسولؐ پر فلسفیانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ کہیں جذبات عقیدت سے مجبور ہو کر نغمۂ نعت چھیڑ دیا ہے۔ کہیں تاریخی تبصرہ ہے تو کہیں اخلاقی نقطۂ نظر۔ الغرض یہ خطبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ اس بہترین لٹریچر میں شامل کرنے کے قابل ہے جو سیرۃ نگاروں نے سیرت رسولؐ پر دنیا کی کسی زبان میں مرتب کیا ہے۔

پنڈت جی اسلامیات کے بہترین عالم تھے اور آپ اسلامی تاریخ کے جزو وکُل سے باخبر تھے۔ ادبی خطبات میں کلام انیسؔ پر بحث کرتے کرتے آپ نے واقعۂ کربلا کی جن تلمیحات کو بے نقاب کیا ہے وہ آپ کی وسعت نظر کا ثبوت ہے۔ آپ اپنے خطبات میں جا بجا تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور نمایاں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ضروری نکات کی تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ خطبات موسیقی میں، اسحاق موصلی، عریبؔ (مغنیہ) ہارون رشید اور معتز باللہ کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور عہد عباسیہ میں فن موسیقی کی جو قدر و منزلت تھی اُسے سراہا ہے۔ ادبی خطبات میں عربی شعراء کے اثر و نفوذ پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ علمائے اسلام پر جو خطبہ دیا ہے وہ اہم تاریخی معلومات سے لبریز ہے۔ آپ نے اپنے خطبوں میں ——— حجاجؔ بغدادی، ابوحاتمؔ رازی، ابوالعلاء ہمدانی، ابونصر فارابی، ابوالعباسؔ رازی، ابوالبرکات، ابوالحسن طبیب، ابوبکر بن بشار اور عبداللہ اصفہانی کی شخصیتوں اور ان کی مصنفات کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے اور علمائے اسلام کی ادبی، طبی اور تحقیقی خدمات کی داد دی ہے۔

یہ کہنا کہ آپ عربی کے علامۂ اجل تھے، آپ کے کمالات علمی کے اظہار میں بخل کرنا ہے کیونکہ اس مجموعے کا ناظر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان پر آپ کو اسی قدر عبور حاصل تھا جتنا کہ کسی خالص ولایتی (عجم نژاد) کو ہو سکتا ہے۔ آپ ادبیات فارسی کی اُن فنی خوبیوں سے واقف تھے جن تک بہت کم نگاہیں پہونچتی ہیں۔

ان لفظوں میں گنایا ہے کہ :۔

"ہمارے ملک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس نے اس جنگ عظیم میں کافی حصہ لیا ۔ اس کی فوجوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کی فوجوں کے سامنے بہادریاں دکھائیں اور دادِ شجاعت دی"

اس کے بعد آپ نے برطانوی مدبّرین کے وہ پیغام نقل کیے ہیں جو انھوں نے ہندوستانیوں کی امدادِ جنگ کے شکریے میں حکومت ہند کو ارسال کیے تھے اور اس چیز پر خوشی ظاہر کی تھی کہ بین الاقوامی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو بھی اپنی نمائندگی کے لیے سرایس، پی، سنہا کو بھیجنے کا استحقاق دیا گیا ہے ۔

اس تقریر کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے :۔

" یا الٰہی ! تو نے ہمارے وطن مالوف کو اس لڑائی کی آگ سے محفوظ رکھا اور اس موقع پر تو نے ہم کو برٹش قوم کے سایۂ عاطفت میں پناہ دی جس کی بدولت تمام دنیا کی تہذیب و آزادی برقرار رہی ۔ یا الٰہی تو سالہا سال ہمارے شہنشاہ معظم کو تخت برطانیہ پر حکمراں اور تندرست و خوش و خرّم رکھ !"

ان خطبات سے پنڈت جی کی سیاسی زندگی کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے ۔ غالباً اس چیز کے دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس زمانے میں مشران مرحوم نے یہ خیال ظاہر کیے تھے اُس وقت ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر اس سے زیادہ کچھ کہنے کا عادی نہ تھا ۔ انتہا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی بھی (جنھیں وائٹ ہال نے ۱۹۳۱ء میں باغی فقیر کا خطاب دیا تھا) گزشتہ جنگ عظیم کے موقع پر انہی لوگوں کی صف میں تھے جو مساعی جنگ سے کامل تعاون کر رہے تھے ۔ لیکن جب لڑائی ۱۹۱۸ء میں حکومت برطانیہ کی عظیم الشان فتح پر ختم ہوئی اور وہ اُمید پوری ہونے کا وقت آیا جو دَورانِ جنگ میں ہندوستان کی سیاسی اصلاحات اور حقوق کے متعلق اہل ہندوستان کیے بیٹھے تھے تو صورت حال پلٹ گئی ۔ ایتلاف ثلاثہ کی شکست اور ترکی کے زوال سے مشرق وسطیٰ میں نیا سیاسی نظام قائم ہوا، جس سے مسلمانان ہند کو سخت اندیشے پیدا ہو گئے ۔ اُدھر عام ہندوستانیوں نے یہ محسوس کیا کہ مساعی جنگ کا انعام

مجموعی خاکہ یہ ہے ۔

اوّل آپ نے جنگ عظیم کے تاریخی اسباب اور متحارب فریقین کے سیاسی روابط پر قیمتی روشنی ڈالی ہے ، پھر سرویا ، روس ، آسٹریا ، جرمن اور فرانس کے باہمی تعلقات ، یورپ کی گزشتہ تاریخ ، ریاستہائے بلقان کی سیاسی حالت اور جنگ عظیم کے اسبابِ ظہور پر عالمانہ بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح سرویا اور آسٹریا کی رقابت نے دوَل یورپ کو زندگی اور موت کی جدوجہد میں مبتلا کر دیا ۔ ضمناً برطانیہ کی معدلت گستری اور انصاف پسندی کا شاندار لفظوں میں قصیدہ بھی پڑھا ہے ۔

—— پھر اتحادیوں کی اخلاقی برتری اور آسٹریا اور جرمن کی وحشیانہ حرکات کا مہیب افسانہ بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آخری فتح کا دارومدار گاڑ زوری یعنی مادّی طاقت کے بیدردانہ استعمال پر نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی طاقت پر ہوتا ہے ۔

آگے چل کر اتحادی فوجوں کی شاندار کامیابیوں کی تفصیل پیش کی ہے اور ترکی کی شرکت جنگ کو اسلامی مفاد کے لیے مضر بتایا ہے ۔ ترکی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جی نے ترکی کی جرمن نوازی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان کی سچائی صرف آج کا مؤرخ ہی جان سکتا ہے جبکہ اس لڑائی کی ہر تفصیل منظر عام پر آچکی ہے ۔ اسی خطبے میں آپ نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کا تذکرہ کیا ہے اور بلجیم میں جرمن مظالم کی خوفناک روداد سنائی ہے ۔

—— آسٹریا ، سرویا اور روس کی لڑائیوں کا تذکرہ کر کے ایک پختہ کار جنگی مبصر کی طرح محاذ جنگ کی مکمل ڈائری پیش کی ہے ۔

—— لکسمبرگ کے تاریخی حالات ، بلجیم کی مختصر تاریخ اور دول یورپ کے باہمی عہدناموں کا ذکر کیا ہے اور ان تمام جزئیات کو بیان کر دیا ہے جو لیج ، اینٹورپ اور بلجیم کے دوسرے جنگی مورچوں پر فوجی نقل و حرکت کے سلسلے میں پیش آئیں ۔ یہ تمام تفصیلات تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں ۔

—— اس سلسلے کا آخری خطبہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں آپ نے یوم فتح کے موقع پر ٹاؤن ہال (فرخ آباد) کے ایک جلسۂ تہنیت میں ارشاد فرمایا تھا ۔ اس خطبے میں آپ نے ہندوستانی خدمات کو

کرانے میں بڑی مدد حکومت برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو یہی ہدایت کرتے رہے۔
چنانچہ ۲۲ لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر برطانیہ کے لیے
فتح حاصل کی۔ لیکن جب مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو
مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکی بلکہ ڈومینین اسٹیٹس (یعنی درجہ نوآبادیات)
بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم ع

پھر آ گئے اُسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق ہو کر رہ گئے تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہو کر ترک موالات
کی تحریک شروع کی"۔

—— ہم نے قصداً ان کے خطبے کا مذکورۂ بالا اقتباس پیش کیا ہے کیونکہ اگرچہ اس عبارت
میں انھوں نے گاندھی جی کے زاویۂ نظر کی تبدیلی کے اسباب واضح کیے ہیں، مگر ان لفظوں
میں ہم خود ان کے سیاسی خیالات کے محرکاتِ تغیر و انقلاب کو کارفرما پا رہے ہیں۔

—— اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کے اخلاقی پہلوؤں کو بے نقاب کیا
ہے اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد اور نظریۂ لاتعاون کی تفسیر کی ہے۔

پنڈت جی کا دوسرا سیاسی خطبہ وہ ہے جو آپ نے فرخ آباد میں پنڈت موتی لال
کی تقریب خیر مقدم میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبے کا آغاز آپ نے تِلک کے ایک
مقولے سے کیا ہے۔

"سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے ضرور حاصل کروں گا"۔

—— اس کے بعد آپ نے پنڈت موتی لال کے ایثار و قربانی کا تذکرہ کیا ہے اور تحریک
لاتعاون سے پنڈت جی کی زندگی میں جو انقلاب آ گیا تھا اس کو اس شعر سے ظاہر
کیا ہے کہ ؎

ادراکِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود ۔۔۔ حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

—— پھر ہنٹر کمیشن کی تحقیقات کے سلسلے میں آنجہانی پنڈت موتی لال نے جو قربانیاں کی
تھیں ان کی داد دی ہے اور قوم کو اس عظیم المرتبت انسان کے نقشِ قدم پہ چلنے کی ہدایت

انھیں نا امیدی، مایوسی اور حرماں نصیبی کی شکل میں بلا ہے تو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک بے اطمینانی، بے اعتمادی اور تشویش کی لہر دَوڑ گئی اور ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ اُس شاندار تحریک کی شکل میں نکلا جسے ہم خلافت ایجی ٹیشن کہہ کر پکارتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ قومی حادثہ تھا جس نے ہندوستان کے سیاسی خیالات کے دھارے کو بدل دیا۔ مہاتما گاندھی نے ملک کو لاتعاون کا حربہ دیا اور ہندو مسلمان کے کامل اتحاد نے ہمارے قومی شعور کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

پنڈت جی ایک سچے قوم پرست اور پکے وطن دوست تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ان ہنگاموں سے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات نہ پڑتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش (جنم دن) پر جو خطبہ دیا ہے اور اس میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو خاتمۂ جنگ پر برطانی شہنشاہیت کا دُعاگو اور قصیدہ خواں تھا۔ مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی تین سال کی مختصر مدت میں ہندوستان کا سیاسی قافلہ کہیں سے کہیں جا پہونچا تھا اور پچھلے دَور کے ماڈریٹ، عہد نو کے سب سے بڑے انقلابی بن گئے تھے ؎

طے میشود ایں رہ بدرخشیدن برقے   ما بیخبراں منتظر شمع و چراغیم

گاندھی جی کے جنم دن پر پنڈت جی نے جو خطبہ دیا ہے، اس میں پہلے ان کے خاندانی حالات بیان کیے ہیں اور پھر خود ان کے ابتدائی حالات کا تذکرہ کرکے ان کی وفائے عہد، سچائی اور دیانت کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کے اُن حوادث کا خاکہ پیش کیا ہے جنھوں نے گاندھی جی کو ستیاگرہی بنایا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ہوتے تھے ان کی طرف اشارے کیے ہیں اور ٹرانسوال میں گاندھی جی نے ہندوستانی آبادکاروں کے تحفظ حقوق کے لیے جو مہم شروع کی تھی اس پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی اس امداد کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے دَوران جنگ میں حکومت کو پیشکش کی۔ ان کے اپنے الفاظ میں:۔

"جب یورپ کی جنگ چھڑی، اس وقت مہاتما گاندھی نے رنگروٹ بھرتی

کرتے ہیں۔ ہم اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے اپنے مقالے کا ایک جزو مزید توضیح وتشریح کے ساتھ دوہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ واضح کرسکیں گے۔ اس مقالے کی ابتدا میں کہا جاچکا ہے کہ اگرچہ اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے اعتبار سے شاعر، مصنّف اور خطیب بظاہر ایک ہی صف میں آتے ہیں مگر شعرا و مصنفین، اظہارِ خیال و بیانِ مطالب کے وقت صرف اپنے نفس سے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے روبرو کوئی مجمع نہیں ہوتا اور نہ اُن کو عوام کے نفسیات کا چنداں لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ لا محدود وقت اور بے پایاں فرصت کے مالک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ایک لفظ کی تہذیب و اصلاح پر وہ ایک ایک دن صرف کردیں یا ایک مطلب کو واضح کرنے کے لیے ہزاروں صفحات استعمال کرڈالیں۔ شعرا اپنے موضوعِ نظم اور مصنفین اپنے نقطۂ بیان کے سلسلے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں، مگر خطیب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ شاعر اور مصنّف کا مقام خلوت و عزلت ہے اور خطیب و مقرّر کی جگہ محفل و جلوت۔ خلوت و عزلت میں انسان کے ضمیر، خیال، اور قلم پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا لیکن ہنگامۂ محفل اور گرمیِ جلوت کے وقت زبان کھولنا، مطالب کی دلنشینی برقرار رکھنا، محدود وقت کا بہترین استعمال کرنا، حاضرین کو درمیان میں جگہ جگہ تروتازہ کردینا، تقریر کی روانی میں، بیان کے بے کیف تعطل کو پاس نہ آنے دینا، موضوع پر قائم رہتے ہوئے مختلف مطالب سے ایسے نتائج استخراج کرنا جو موضوعِ بحث کو اور زیادہ قوت دیں، سننے والوں کو اُکتانے نہ دینا، بیان کے دَوران میں جا بجا ظرافت کا رنگ پیدا کرنا، دلچسپ نکات و لطائف سے اپنے کلام کو رنگین وجاذب بنانا، اثنائے کلام میں موزوں اشعار و اقوال کی چیست بندش کرنا، حاضرین کے خیالات و احساسات کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہنا، تقریر کے اجزاء و عناصر کو منطقی مہارت سے جُدا جُدا کرنا اور پھر ہر جزو کی خصوصیات واضح کرنا، اُن سے نتیجہ نکالنا، ان کے باہمی روابط کو روشنی میں لانا، پھر ان منزلوں سے گزر کر اپنے موضوع کو ہاتھ لگانا اور سننے والوں کی کامل دماغی تائید حاصل کرنا، یہ ہیں ایک خطیب کے فرائض، جنھیں وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں میں بیک وقت انجام دیتا ہے۔ گوکہ

کی ہے ۔ مشران مرحوم کے سیاسی خطبات کی پہلی کڑی وہ تقریر ہے جو آپ نے نومبر ۱۹۱۳ء میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن (اسپیکر یو پی اسمبلی) کے مکان پر جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف کے موضوع پر کی تھی ۔ اس خطبے میں اگرچہ جذبات کی وہ تلخی نہیں ہے جو قدرۃً اس کے بعد عام ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئی تھی لیکن خیالات میں انقلابی رنگ جھلک رہا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ پنڈت جی شروع ہی سے خالص قوم پرست اور نڈر طبیعت کے مالک تھے ۔

اس خطبے میں انھوں نے گاندھی جی کی اُس تحریک کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی آباد کاروں کے حقوق و مطالبات کے حصول کے لیے شروع کی تھی اور پھر حکومت افریقہ کے مظالم کو بیان کیا ہے ۔ ضمنی طور پر انھوں نے حکومت برطانیہ کی توجہ ملکۂ وکٹوریہ کے "میگنا چارٹا" (منشور آزادی) کی طرف مبذول کرائی ہے اور سختی کے ساتھ اُن قوانین کے خلاف احتجاج کیا ہے جو حکومت افریقہ نے ہندوستانیوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے بنائے تھے ۔

بہرحال پنڈت جی کے سیاسی خطبات سے ان کے قومی شعور کے درجہ بدرجہ ارتقاء کا بخوبی پتہ چلتا ہے ۔ شروع میں وہ لبرل عقائد رکھتے تھے ، لیکن حالات نے آخر میں انھیں انتہا پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور ان کی زندگی اس شعر کی عملی تفسیر بن گئی ؎

وفا کیسی ۔ کہاں کا عشق ۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اب ہم خطباتِ مُشران کا وہ اہم ترین وصف منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ حسن فطرت کے نباضوں کی نگاہ میں بھی جملہ خصوصیات کلام سے زیادہ مدح و ثنا کا مستحق ہے کسی خطیب کے خطبات (یا شاعر کے کلام) پر نقد و نظر کرنے میں سب سے عجیب اور دلکش نکتہ جس پر خطبے یا کلام کے مقبول یا غیر مقبول و مردود ہونے کا انحصار ہے، وہ ہے جو اہل بلاغت کی اصطلاح میں "مقتضائے حال کی مطابقت" سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر علم النفس کے ماہرین اس کو "نفسیاتی مصوری" کے نام سے موسوم

موضوع تک پہونچتا ہے ، یہ تقریر اور خطبے کا ایک معرکۃ الآرا جزو ہے ، جو آہستہ آہستہ کلام
کو اپنے عروج و ارتقا تک پہونچا کر، حسن بیان کو دلائل و براہین سے مرصع کر دیتا ہے -
جوں جوں تقریر اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی جاتی ہے ، مقرر کے کلام میں جوش و خروش اور
سامعین کے قلوب میں ذوق و شوق کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے ۔ تقریر کا یہی حصہ جانِ خطابت
کہلاتا ہے ۔ کسی خطیب کے کمالِ فن کو جانچنے کا ایک بہتر طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی گریز کی لطافت
اور رجوع الی الموضوع کی نزاکت کو دیکھا جائے -

۳۔ خاتمہ ۔ ماہرین فن کا اتفاق ہے کہ کلام کی ابتدا جتنی شاندار ہوگی ، اس کا
مرکزی یا عروجی نقطہ ، اتنا ہی دلچسپ اور جاذب، توجہ ہوگا اور خاتمۂ کلام میں اُتنا ہی وہ زور اور
اثر پیدا ہوجائے گا کہ تقریر کے بعد بھی سامعین ، لطافت کلام سے سیر نہ ہوں گے ۔ خاتمۂ کلام
پر تمام دلائل و براہین سمٹ کر کسی ایک نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں اور موضوع واضح ہوجاتا ہے ،
لیکن اس موقع پر کمال خطابت یہ ہے کہ پایانِ تقریر میں اضمحلالی کیفیت اور افسردگی نہ پیدا ہو۔
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقریر کے آخری مراحل میں نہ صرف یہ کہ سننے والے اُکتا جاتے ہیں ۔ بلکہ
بولنے والا بھی تھک جاتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا ،
اس لیے جلدی جلدی نقطۂ آخر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس عجلت و سراسیمگی کے
عالم میں بسا اوقات پوری تقریر بے لوچ ہوکر پھیکی پڑ جاتی ہے اور آغازِ تقریر نیز وسطِ تقریر کا
تمام اثر و کیف مہمل ہوکر رہ جاتا ہے -

اپنے ہیرو کی نفسیاتی نبّاضی کا کمال ظاہر کرنے کے لیے سطور بالا میں تمہیداً جو کچھ لکھا
گیا ، اس کے ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مختلف مضامین کے لیے شاعر
یا مصنف جداگانہ نوعیتوں کے اسلوب اور الگ الگ قسم کے محاورات و الفاظ انتخاب کرتا ہے ،
غزل کے الفاظ اور محاورات ، نازک ، نرم ، سبک اور لچکیلے ہوتے ہیں ، قصائد میں شکوہ الفاظ
اور عظمت تراکیب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے ، مرثیے کے لیے پرسوز الفاظ اور مانوس الحس محاورے
استعمال کیے جاتے ہیں یا افسانوں کی زبان جداگانہ ہوتی ہے ، تاریخی و علمی مضامین کا اسلوب
کچھ اور ہوتا ہے ، عورتوں اور بچوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اُس کی بولی اور طرز بیان

ایک مصنف بھی اپنی تصنیف کو انہی چیزوں سے سنوارتا ہے اور ایک شاعر بھی اپنی نظم میں قریب قریب انہی قواعد کی پیروی کرتا ہے، لیکن وہی فرق، کہ شاعر و مصنف ایک نظم یا ایک مقالے کی ترتیب و تکمیل کے وقت کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے - وہ اگر اپنی پوری عمر صرف ایک موضوع پر گزار دیں، جب بھی ان پر کوئی معترض نہیں ہو سکتا ـــ لیکن خطیب کو یہ سہولت کہاں نصیب - ایک خطیب اپنی تقریر میں کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے یا اسے کن کن قواعد کی پیروی کرنا پڑتی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے علمائے منطق و کلام نے تقریر کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے -

۱- تمہید - یعنی تقریر کا وہ ابتدائی حصہ جس میں وہ اپنے موضوع کی مبادیات واضح کرتا ہے اور حاضرین کو آیندہ تقریر کے لیے آمادہ کرتا ہے- اس حصے میں دلائل و براہین کی بھرمار نہیں ہوتی بلکہ ابتدا ہوتی ہے - خطیب سادہ لفظوں میں اپنے موضوع کلام کا تعارف کراتا ہے اور ان ضروریات کو واضح کرتا ہے جن کی بنا پر اس نے حاضرین کو اپنے گرد و پیش مجتمع کیا ہے- اکثر خطیب خطبے کی ابتدا میں اپنی ہیچمدانی اور ژولیدہ بیانی کا اعتراف بھی ضروری سمجھتے ہیں- اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگے چل کر تقریر میں کوئی خامی پیدا ہو جائے تو خطیب کا عجز و انکسار ان نقائص کا کفارہ بن کر سامعین کے تنغص کو دور کر دے - اس ہیچمدانی اور خاکساری کے ساتھ موضوع کی اہمیت و عظمت کا بھی پُرتاثیر لفظوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ سننے والوں کے دل میں مُقرّر کے لیے جذبۂ ہمدردی اور موضوع کے لیے جذبۂ عظمت پیدا ہو جائے اور ان پر استعجاب و اشتیاق کی کیفیت طاری ہو جائے - زور بیان، طلاقت زبان اور جوہر ادا کے کمالات دکھلاتا ہے تاکہ یہ استعجاب و اشتیاق برابر بڑھتا رہے- ایک مُقرّر کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دوران کلام میں برابر اپنے سامعین کے جذبات شوق و حیرت میں اضافہ کرتا رہے تا اینکہ تقریر ختم ہو جائے اور نہ ان کا شعلہ اشتیاق فرو ہو اور نہ حیرت و تعجب میں کمی آئے-

۲ - تمہید کے بعد گریز شروع ہوتی ہے - یعنی رجوع الی الموضوع- تقریر کا سب سے نازک اور اہم حصہ یہی ہے- خطیب کس طرح گریز کرتا ہے اور کس عمدگی اور بیساختگی سے اپنے

معشوقِ چمن کے جلترنگ بجانے کا ذکر، کس قدر برمحل اور دلچسپ ہے اور سامعین کے
احساسات نغمہ کو کس نزاکت اور لطافت سے بیدار کیا جارہا ہے تاکہ وہ آیندہ موضوعِ تقریر
سے پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے مُقرر کے دمساز اور گوش اور بر آواز ہوجائیں -
—— اس کے بعد موصوف نے انسانی حواس کی لذت پذیری کے خواص کو واضح کیا ہے
اور بتلایا ہے کہ حُسنِ صورت اور حُسنِ صوت (جنّتِ نظارہ اور فردوسِ گوش) کے اثرات
دل و دماغ پر کیا ہوتے ہیں - پھر حُسنِ نغمہ وصوت کو رعنائیِ شکل وصورت پر ترجیح دی ہے۔
فرماتے ہیں -

"حُسنِ ظاہر سے حظ نفسانی اور حُسنِ صوت سے لذت روحانی حاصل
ہوتی ہے"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سند کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

به از روے زیباست آواز خوش — که آں حظ نفس است وایں قوتِ روح

—— اس کے بعد نہایت رنگین ودلآویز پیرایے میں حسن صورت کے ساتھ خوش گلوئی
اور خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فن موسیقی وکمال رقص کو حُسنِ ظاہر کی دلکشی
اور دلربائی کا نقطۂ عروج وکمال بتلایا ہے، جو حقیقت اور رجحانِ نفس دونوں کے لحاظ
سے مسلم الثبوت اور ناقابل تردید ہے -

ہم نے کمالاتِ خطابت کی وضاحت کے سلسلے میں اس چیز پر خاص طور سے زور
دیا تھا کہ عوام کے جذبات اور ان کے نفسیات کو تاریخی لطائف وظرائف اور اقوالِ مشاہیر
سے اُبھار کر تقریر کی کامیابی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا، خطابت کی کامیابی کے لیے
کس درجہ ضروری ہے - مُشران مرحوم اس گُر سے اچھی طرح واقف تھے - چنانچہ آپ اُن کے
ہر خطبے میں، خطابیات کا یہ فنی کمال پوری طرح دیکھ سکتے ہیں - اسی خطبے میں حُسنِ صوت،
خوش آوازی اور لحن رقص کے امتزاج کی لطافتیں بیان کرتے ہوئے رامائن کی ایک روایت
کو بطور مثال پیش فرماتے ہیں اور وہ نثر میں نہیں، نظم میں ؎

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ — زباں پر تھا قیامت کا ترانہ

بھی مختلف ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس فن پر قلم اُٹھایا جائے اُسی کی مناسبات اور اصطلاحات استعمال کی جائیں، فن بلاغت کے یہ اصولی لوازم ہیں، جن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح خطیب کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے لب کشائی کرے۔ جس فن پر وہ بحث کر رہا ہے اسی کے مناسبات و اصطلاحات سے، براعۃ الاستہلال و ایہام کے طور پر اپنے کلام کو سجائے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے مذاق اور معیار ذوق کو بھی پیش نظر رکھے۔ بزم میں فقط اہل نظر ہی نہیں ہوتے۔ تماشائی بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ اہل نظر کی اقلیت ہوتی ہے اور تماشائیوں کی اکثریت۔ کمال خطابت یہ ہے کہ مُقرّر دونوں کے مذاق کی تسکین کر سکے۔ مسئلہ زیرِ بحث کتنا ہی دقیق و پیچیدہ کیوں نہ ہو، طرزِ ادا اس درجہ سلیس، رواں، برجستہ اور دلچسپ ہونا چاہیے کہ عوام و خواص دونوں اس سے یکساں لطف اٹھائیں۔ آئیے اب متذکرہ فنی اصول اور نفسی رجحانات کی روشنی میں خطباتِ شرران پر ایک نظر ڈالیں۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں موصوف نے آل انڈیا موسیقی کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے ان کے مطالعے سے ہمارا مقصد بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم، عوام کی نفسیات کو سمجھ کر اپنے موضوع کو شگفتہ و پربہار بنانے کا کس قدر ملکہ رکھتے تھے۔ خطبۂ موسیقی کی ابتدا ایک رنگین نظم سے ہوتی ہے۔ موسیقی کو نظم سے فطرۃً جو لگاؤ ہے اس کے لحاظ سے یہ ابتدا کس قدر برمحل اور موزوں ہے۔ اس نظم کے چند شعر پڑھ کر دیکھیے اور غور کیجیے کہ موضوع موسیقی کی تمہید کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور کہاں مل سکتے ہیں ؎

وہ بہار آئی ۔ نوا سنج ہیں مرغانِ چمن
غیرتِ باغِ اِرم آج ہے صحنِ گلشن

جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار
کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبانِ سوسن

آبِ شبنم سے کہاں کا سۂ گل ہیں لبریز
جلترنگ آج بجانے کو ہے معشوقِ چمن

—— انصاف کیجیے کہ فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے خطبے کی ابتدا میں ایک مترنم نظم کے ذریعے، مرغانِ چمن کی نوا سنجی، طیور بہار کی زمزمہ سرائی، زبان سوسن کی گویائی اور

وسعت نظر کے ساتھ عربی موسیقاروں اور عہد عباسیہ کی فنی ترقیوں کا بیان فارسی مغنیوں
(بار بد نکیسا) کے دوش بدوش اسحاق موصلی، ابراہیم اور مشہور عرب مغنیہ غریب کا تذکرہ اور
پھر اموی اور عباسی خلفاء کی قدردانی فن کے بعض واقعات، غرض موسیقی پر فنی اور تاریخی
نقطۂ نظر سے مختصر وقت اور محدود پیرایۂ بیان میں عوام کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی
بیان کیا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ اپنے اس خطبے میں بیان کر دیا ہے۔ حقیقۃً کمال خطابت اسی کو
کہتے ہیں۔ مشران مرحوم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

موضوع کلام کتنا ہی عالمانہ کیوں نہ ہو، مگر انداز بیان ایسا پر کیف و پرتاثیر ہونا چاہیے کہ
نظر بازوں اور نظر والوں کی تسکین مذاق کر سکے اور دونوں کے نفسی رجحانات کے مطابق ہو۔
کہنے میں یہ چیز جتنی آسان ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ علمی تحقیق اور حکیمانہ مسائل کے
بیان میں، زبان و بیان کی شگفتگی قائم رکھنا اور عوام کے نفسیات کے مطابق کلام کرنا،
خداداد ذہانت رکھنے والے خطیبوں کا کام ہے۔ فن خطابت کی رو سے خطیب وہی ہے جو
زور بیان اور حسن کلام پر قادر ہو، ورنہ بعض علمی مسائل کا بیان تو کسی آدمی کو خطیب بنانے
کے لیے کافی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے واعظ یا ذاکر کہہ سکتے ہیں، خطیب اور چیز ہے۔
خطیب کا مقصد اصلی صرف تحقیق علمی نہیں ہے بلکہ فن تقریر کا کمال بھی ہے۔ یوں سمجھیے کہ
غایت خطابت خود خطابت ہے۔ پند و وعظ اور ذکر و فکر، بعد کی منزلیں ہیں۔ عربی خطباء
محض اسی شخص کو خطیب کہتے تھے جو سحر بیان اور جادو بھرے تقریر سے سامعین کو مسحور کرنے کی
طاقت رکھتا ہو اور حقیقۃً خطیب ہے بھی وہی۔ فن خطابت؛ فنون لطیفہ کے شمار میں آتا
ہے۔ یہ بھی موسیقی، مصوری اور شاعری کی طرح ایک وہبی ملکہ ہے جو قدرۃً انسان کو ودیعت
ہوتا ہے۔ مشق و مزاولت سے مہارت کلام پیدا ہو سکتی ہے، مہارت کمال نہیں۔ دنیا میں
جتنے مشہور خطیب گزرے ہیں سب قدرت کی طرف سے اس ملکہ کو لے کر آئے تھے۔ سحبان وائل
وغیرہ اپنے کمال فن کے لیے کسی مشق و تعلیم کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ خطبات مشران کے
مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشران مرحوم بھی مبدءِ فیاض سے یہ ملکۂ وہبی لے کر پیدا ہوئے تھے

لباس پُرتکلف تن میں پہنے   تنِ گلرنگ میں پھولوں کے گہنے
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں   بہار آئی ہر اک نخل کہن میں
یہ بھولے اپنی درویشی کا لٹکا   تصوّر بندھ گیا ناگن سی لٹ، کا

—— یہ وہ موقع ہے جب مہاراجا دسرتھ نے اپنے دربار کی ایک اُپسرا کو شنگی رکھ کے لانے کے لیے بن میں بھیجا ہے ۔ شنگی رکھ ایک مشہور سادھو تھے ۔ اُپسرا نے اپنے حسن و جمال کے افسوں اور رقص و موسیقی کے جادو سے شنگی رکھ کو تسخیر کرلیا۔ مُشران مرحوم نے اس واقعے کو حسن و موسیقی کے بے پناہ کمالات کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جو شعر سُنائے ہیں وہ منشی شنکر دیال صاحب فرحت کی منظوم راماین کا ایک ٹکڑا ہیں ۔

—— اس کے بعد مُشران مرحوم نے خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بجائے خود فن موسیقی ساز و بربط کی قید سے آزاد ہے ۔ اگرچہ چنگ و رباب کی ہمسازی سے اس کا اثر ضرور بڑھ جاتا ہے مگر موسیقی اور ساز و مزامیر لازم و ملزوم نہیں ، بایںہمہ مزامیر کے بغیر نغمے میں محویت کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی ۔ موصوف اس بحث میں فرماتے ہیں :-

> "گانے کے ساتھ طبلے کی تھاپ ، بائیں کی گمک ، مجیروں اور گھونگھروؤں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے ۔ گانے کے ساتھ ساز بھی ہوں تو بعض وقت لَے بندھ جاتی ہے اور لطف نغمہ دوبالا ہوجاتا ہے ۔"

—— اس کے بعد موصوف نے ایک ماہر فن کی طرح مختلف راگنیوں کے اوقات اور تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہندوستانی موسیقی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں ۔ اسی سلسلے میں تال اور سُر نیز کلاسیکل موسیقی اور عوامی مذاق کا فرق بیان کیا ہے ۔

مُشران مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی موضوع کو لیتے تھے تو اس کے باریک سے باریک جزئیات کو بھی بیان کرجاتے تھے ۔ چنانچہ موسیقی سے تعلق رکھنے والے اس خطبے میں مشکل ہی سے انھوں نے کسی گوشے کو تشنۂ اظہار چھوڑا ہوگا۔ فن موسیقی کی اہمیت، ہندوستانی موسیقی، رقص و موسیقی کا باہمی ربط ، راگنیوں کے اوقات ، ہندوستانی موسیقاروں کے کمالات اور پھر اس ضمن میں موجودہ، نیز گزرے ہوئے بعض ارباب کمال کا ذکر، عالمانہ تبحّر اور

ابرِ سیاہ کے ٹکڑے مجتمع ہیں کہ اشک ریزی کریں - آج دو پہر سے آسمان کی آنکھیں
اشک آلود نظر آتی ہیں - قریب ہے کہ فرطِ غم سے اس کے آنسو ٹپک پڑیں،
آپ لوگ خاموش ہیں اور سکتے کے عالم میں ہیں "

اس دردناک اور پُراز جذبات تمہید کے بعد وہ نفسِ مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں - دیکھیے گریز کس قدر برمحل اور قدرتی ہے :-

" یہ خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ کسی بڑے ہر دلعزیز، حبیبِ وطن، بہی خواہِ ملک اور راستباز بزرگ کا ماتم ہے "

—— اس گریز کے بعد متوفی کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف و کمالات گنائے ہیں جو ہر شخص کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں - مثلاً ان کی ایمانداری، حب الوطنی، عزمِ محکم، قوم پرستی اور راستبازی وغیرہ وغیرہ -

متوفی کا ذکر کرتے کرتے نثر میں نظم کی شان پیدا ہوگئی ہے - تاثیرِ بیان، منظر نگاری اور سامعین کے جذبات کو اُبھارنے کی ایک شاندار مثال حسبِ ذیل فقرات میں مل سکتی ہے - فرماتے ہیں اور کس درد سے فرماتے ہیں -

" صاحبو! اُس وقت (جب متوفی کی رسوم آخر ادا ہو رہی تھیں) عجیب عبرت انگیز سماں تھا - سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ جسم جو ملک کے قالب کے لیے روح رواں تھا، بے حس و حرکت پڑا ہے اور قریب ہے کہ آگ اس کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دے "

آخری دیدار میت کی منظر کشی ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

" تمام عزیزوں کا لاش کے گرد جمع ہونا، ستم رسیدہ بیوہ، مظلوم ماں اور چھوٹے چھوٹے بچّوں کا گریۂ و زاری کرنا، سر دھننا، سینہ کوبی کرنا، یہ ایسا سماں تھا کہ خیال کرنے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں - ہر شخص کی یہ کیفیت تھی ؎

نہاں چہرہ در گردِ مظلومیئے ز مژگاں رواں اشکِ محرومیئے

البتہ مشق و مزاولت اور وسعت علم اور مطالعے نے اس شراب کو دو آتشہ اور اس ملکے کو دو چند کر دیا تھا۔

آپ پنڈت جی کے تمام خطبات پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال جائیے اور پھر یہ غور کیجیے کہ یہ شخص کس طرح خطبے کا آغاز کرتا ہے، پھر آہستہ آہستہ کس طرح موضوع کو چھیڑتا ہے اور گریز کی نزاکت قائم رکھتے ہوئے نفس مضمون کو ہاتھ لگاتا ہے، درمیان میں دلچسپ اشعار سے کلام کو مزین اور بامزہ کرتا جاتا ہے، خاتمے کی طرف کس غیر محسوس طور پر رجوع کرتا ہے اور پھر اچانک کس طرح ختم کر دیتا ہے کہ طبیعت پر انقطاع بیان ذرا بار نہیں ہوتا، بلکہ اشتیاق کی آگ شعلہ زن رہتی ہے، نہ صرف یہ، بلکہ جس مسئلے پر بحث کرتا ہے اس کے مطابق، زبان میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مسئلۂ متعلقہ کی جزئیات اور مناسبات کس طرح واضح ہوتی چلی جاتی ہیں، تو آپ یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب سے پچاس برس قبل یعنی فروری ۱۸۹۲ء میں پنڈت جی نے، آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو وکیل ہائی کورٹ کی بے وقت وفات پر ایک تعزیتی تقریر کی تھی۔ اس تعزیتی تقریر کو پڑھنے کے بعد کون شخص ایسا ہوگا جو فاضل مقرر کے انداز خطابت سے متاثر نہ ہو جائے۔ ملحوظ رکھیے کہ یہ ایک تعزیتی تقریر ہے، اس لیے پنڈت جی نے اس کی ابتدا ایک مرثیے سے کی ؎

ہر ایک گلشن عالم میں مُو پریشاں ہے　　چمن میں سنبل تر زلف سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اُٹھائے ہے ہاتھ ماتم کا　　ہر ایک نخل پہ بلبل بھی مرثیہ خواں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک　　برنگ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے

رواں ز دیدۂ نرگس سرشک شبنم شد
فغاں کہ ہر شجر باغ نخل ماتم شد

ان پُرتاثیر اشعار کے بعد انھوں نے نثر میں اس طرح مرثیہ خوانی کی ہے:-

"جس طرف دیکھیے حسرت و غم کے آثار نظر آتے ہیں - در و دیوار سے ماتم کی آواز آ رہی ہے - ہر شخص کے چہرے پر حزن و ملال ہے - آسمان[1] پر

---

[1] اتفاق سے اُس روز ابر فضائے سماوی میں محیط تھا ۱۲

بلا قصد و اہتمام کے۔ اگر بامعان مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہر ایک خطبے میں یہی خصوصیات کم و بیش نظر آتی ہیں۔ پنڈت جی کا ہر خطبہ نظم و نثر کا ایک دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ انتخاب شعر اور پھر نثر کی روانی میں پسندیدہ اشعار کا برمحل استعمال بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لیے زبردست حافظہ، غیر معمولی ذوق سخن اور برمحل یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پنڈت جی کے ذوق سخن کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرحوم نے نثری فقرات میں شعروں کو اس طرح کھپایا ہے کہ نثر مئے دوآتشہ کا مزہ دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ مثال میں معمولی اشعار پیش نہیں فرماتے بلکہ اساتذہ عرب و عجم اور ہندوستان کے مشاہیر شعرا کا، اعلیٰ درجے کا کلام ان کی زبان پر ہے اور وہ بے تامل اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں جابجا انگریزی شعرا کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔

پنڈت جی، عامیانہ اور پیش پا افتادہ مضامین میں اپنے زور تخیل اور حسن بیان سے ایسی جدت پیدا کر دیتے ہیں کہ خاص و عام اس سے مزہ لیتے ہیں۔ ایک الوداعی خطبے میں اپنی ہیچدانی اور اپنے پیشرو مقررین کی عظمت کا اعتراف (جو کہ ایک فرسودہ مضمون ہے) اس طرح کرتے ہیں:۔

" ان فصیح و بلیغ مضامین کے بعد جو آپ سُن چکے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لیے زیادہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند   تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

میں اپنے خیالات کو شاید اس خوبی سے ظاہر نہ کر سکوں، جس خوبی سے میرے دوستوں نے ظاہر فرمائے ہیں کیونکہ میں فصاحت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ چڑیا اگرچہ شاہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم چار و ناچار اسے اڑنا ہی پڑتا ہے ؎

دانم نہ رسد ذرہ بخورشید و لیکن   شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

ایک اور وداعیہ خطبے میں اپنے ممدوح کے لیے جو مدحیہ اور دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں اُن کو ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرنا خالی از لذت نہ ہوگا کیونکہ ان میں

نہ از رنج کف ہا بسرمی زنند　　بسوئے عدم بال و پر می زنند

—— اس کے بعد متوفی کے وارثوں کو تسلی و تشفی دینے کے لیے جو کلمات ارشاد کیے ہیں وہ وقتی تاثیر کے علاوہ حقیقت موت کے مشکل ترین فلسفے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور خود ان کی شاندار موت پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"موت حقیقت میں مادی جسم کو ہلاک کر سکتی ہے، نام نیک کو فنا نہیں کر سکتی۔ دولت و حشمت سب فانی چیزیں ہیں، مگر نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا ؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت　　نوشیرواں نہ مرد کہ نام نکو گذاشت

تمہید، گریز، نفس مطلب اور کلام کے عروجی نقطے سے گزر کر خاتمے کے چند لفظوں میں اپنے تمام جذبات تعزیت اس طرح سمو دیتے ہیں:۔

"صاحبو! اب فرط رنج و الم، طول بیان سے مانع ہے اور طوالت کلام اس محل پر خلاف ادب بھی ہے، لہذا اپنے ماتمی بیان کو اس رزولیوشن پر ختم کرتا ہوں"

—— اس مختصر سے جملے میں پنڈت جی نے تمام سامعین کے جذبات کو اپنا لیا ہے اور ختم بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر کو سننے والوں کے تعزیتی احساسات کا مرقع بنا دیا ہے۔

خطبات نشران کی ابتدائے تقریر، وسط کلام اور خاتمۂ بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت جی، تقریر کے آرٹ سے بخوبی واقف تھے، عوام کی نفسیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، وہ دلوں کو تڑپانے اور دماغوں کے متحرک کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی زبان میں لوچ تھا۔ لفظوں میں روانی تھی، نثر کو نظم سے سجاتے تھے اور نظم کو نثر سے تقویت دیتے تھے، دوران تقریر میں عوام کے معیار انتخاب کو مدنظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی تاثیر اپنے حرف حرف میں رکھتے ہیں۔

ہم نے سطور بالا میں ان کے خطبوں کے چند اقتباسات پیش کیے ہیں اور وہ بھی

خطبات

جدت پسندی اور حق پسندی، جو کہ بظاہر ضدین ہیں، پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں خاقانی یا انوری نہیں ہوں کہ ثنا یا دعا میں شاعرانہ مبالغہ کروں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ فیاضی میں ابرِ نیساں یا ایثار و کرم میں حاتمِ دوراں ہیں۔ میں نہ کہوں گا کہ آپ کی عمر ہزار برس کی ہو —— یہ کہوں گا کہ جب تک آپ اس دارِ فانی میں زندہ رہیں، با کام و بامراد زندگی بسر کریں۔"

مختصر یہ ہے کہ جدتِ ادا، حسنِ بیان، لطفِ زبان، ادبی چاشنی، علمی عظمت، روانی، چستی بندش، ندرتِ تراکیب، معانی و مطالب کی تسہیل اور سب سے بڑھ کر عوام کے نفسیات سے لگاؤ، ان خطبات کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کی توضیح و تشریح کے لیے ہم نے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے ہیں جن کے مطالعے سے خطیب کی ذکاوت اور ذہانت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے لیکن قارئین پر ظلم ہوگا کہ انھیں دیر تک پنڈت جی کے خطبات سے محروم رکھا جائے اور تمہید کو اس قدر طول دیا جائے کہ اہلِ محفل اُکتا جائیں ع کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند —— البتہ اتنا بتلا دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ پنڈت جی کی جامعیتِ علمی اور خطابیاتی عظمت کو ان ہی چند خطبوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے میں ۱۵ خطبے شامل ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ع جو ذرہ جس مقام پہ ہے آفتاب ہے —— یقیناً خطباتِ مُشران کی اشاعت سے ادبِ اُردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے جس کی اشاعت کے لیے ہم مرحوم کے خلف الرشید پنڈت جگموہن نراین صاحب مُشران، سابق ڈسٹرکٹ جج کے مرہونِ منت ہیں کہ موصوف کے علمی شوق نے اس نگارخانۂ سخن کو منظرِ وجود پر آراستہ کیا ؎

تو مپندار کہ ایں نغمہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آواز من است

ناچیز نسیم امروہوی

شعراء کا خیر مقدم

اور

شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ

بھارتی پاٹھشالا فرخ آباد کی نمایش کے سلسلے میں حسب دستور ایک بزم مشاعرہ منعقد ہوئی، جس کی مسند صدارت پر جناب منشی نصیرالدین صاحب علوی (منصف مین پوری) جلوہ افروز تھے اور مُشران صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ موصوف نے اس جلسے میں شعراء و سامعین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شعر و سخن پر حسب ذیل عالمانہ اور محققانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ درحقیقت موصوف کا علمی و ادبی شاہکار ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بطور صدر استقبالیہ کمیٹی کے آپ صاحبوں کا خیر مقدم کروں۔ پہلے مجھے کمیٹی کا شکریہ اپنی طرف سے ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کے واسطے انتخاب فرمایا۔ ع منت شناس ازاد کہ بخدمت بداشتت۔ کاش یہ کام کمیٹی کسی شاعر کے سپرد کرتی جو نظم میں یا شگفتہ نثر میں آپ کا شکریہ

میں اس وقت فصاحت و بلاغت کے موضوع پر کچھ عرض کروں گا اور فنِ شعر خوانی کے کچھ اصول بھی بیان کروں گا۔ یہ سب موضوع بزم مشاعرہ سے تعلق خاص رکھتے ہیں۔ میں بہت خوشی سے دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی جماعت بھی یہاں موجود ہے جو مشقِ سخن کرنے والے ہیں۔ ان کو بہت ضرورت ہے کہ شاعری کے آداب سیکھیں، اگر شاعر بننا چاہتے ہیں۔ یہ ابھی نو آموز ہیں، میں ان کی خاطر بھی ملحوظ رکھوں گا اور ایسی باتیں عرض کروں گا جو ان کے سمجھنے اور غور کرنے اور عمل کرنے کے قابل ہوں گی۔ ان کو بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا چاہیے:۔

ع کاندریں راہ خارہا باشد

ان کو بھی وہی آداب و قواعد سیکھنا چاہیے، جو فصحاء کے نزدیک مسلّمات سے ہیں۔

میں پہلے فصاحت کا ذکر کروں گا۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سادہ، سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں۔ غریب و ثقیل اور قلیل الاستعمال لفظوں سے پرہیز کیا جائے، باہم الفاظ میں تنافر نہ ہو۔ اگر کوئی لفظ غریب یا ثقیل آجائے تو اس ترکیب سے استعمال ہو کہ اس کی غرابت یا ثقالت جاتی رہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود فصیح ہے، لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدّین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے اور نغمہ بگڑ جائے گا۔ کہیں ضرورت ہے کہ گندھار سُر، الاپا جائے اور مغنّی وہاں کوئی

ادا کرتا! بخلاف اس کے یہ خدمت ایک شخص غیر شاعر کو تفویض کی گئی ہے، جو ٹوٹی پھوٹی نثر میں آپ، کا خیر مقدم کرے گا۔

میں استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے تمام ارباب سخن کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس بزم سخن کو رونق تازہ اور زینت بے اندازہ بخشی ہے۔ جو اصحاب دور سے تشریف لائے ہیں وہ خاص طور پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم سب کو جناب صدر مشاعرہ اور میزبان مہرباں کا شکریہ نہایت گرمجوشی سے ادا کرنا چاہیے، جن کی صدارت اور رہنمائی سے اور جن کی مہمانداری اور خوش انتظامی سے یہ بزم سخن آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ آپ دونوں صاحبوں کا اخلاق عمیم اور اُس کا جذب مقناطیسی ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے۔

صاحبان والاشان! اب مشاعرے کی طرف لوگوں کا ذوق بڑھتا جاتا ہے کسی تقریب سے کوئی انجمن کیوں نہ ہو وہ مشاعرے پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے لوگوں کو عمدہ کھانے کھلائے جائیں اور بعد میں اور لذیذ میوے انواع واقسام کے میز پر چُنے جائیں تو باوجودیکہ لوگ سیر ہو چکے ہیں تاہم اُن لذیذ میووں کو نہایت شوق سے کھاتے ہیں، یہی حال مشاعرے کا اہل ذوق کے ساتھ ہے کہ باوجودیکہ پہلی تقریبوں اور جلسوں کا لطف اُٹھا چکے ہیں لیکن آخر میں بزم مشاعرہ میں نہایت شوق سے شریک ہوتے ہیں اور اس کا لطف علیحدہ حاصل کرتے ہیں۔

صاحبان ذیشان! مجھ سے میرے دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ شعر وسخن کے موضوع پر بھی کچھ بیان کرنا چاہیے۔ اگر میں تعمیل نہ کروں تو وہی بات ہوگی کہ "آزردن دل دوستاں جہل ست"۔

توازن ہو جائے ۔ گارے کو نانے سے اور سنگریزوں کو موتیوں سے تشبیہ دے کر بھی غرابت اور ثقالت کو کم کر دیا ۔

فصاحت کے تحت میں مطلع کا حال عرض کروں ۔ اکثر شاعر نہیں جانتے کہ مطلع میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے ۔ اکثر اچھے شاعروں سے بعض دفعہ چوک ہو جاتی ہے ۔ واضح ہو کہ مطلع میں بہت سلیس اور فصیح الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہیں استعمال ہونا چاہیے اور ثقیل اور قلیل الاستعمال اور دقیق الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے ۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور اچھے فارسی گو تھے اور ذی علم بھی ، اُنھوں نے اپنی غزل کا مطلع کہا ہے ؎

نہ باشد چوں منے در ملک ہستی کامل و یکتا لئیق و ازکی و ارشد طلیق و عاقل و دانا

مشہور شاعر سنجر شیرازی جو میرزا سپہر لسان الملک کا شاگرد رشید تھا ، اُس وقت بریلی اور مُراد آباد کی سیر و سیاحت کر رہا تھا ۔ اُس کے ہاتھ یہ غزل کسی طرح لگ گئی ۔ اُس نے اس غزل کے ایک ایک مصرع میں اصلاح دی اور ایسی اصلاح دی کہ باید و شاید ۔ اُس نے یہ استدلال کیا کہ ہندیوں کے لہجے میں واوِ مجہول اور یائے مجہول ہے ، لیکن ایرانیوں کے لہجے میں معروف ہے ، مجہول قطعی نہیں ۔ لہٰذا گو ہندی لہجے میں "منے" کی یا کا لہجہ مجہول کیا جائے گا ، مگر ایرانی اُس کو یائے معروف ہی پڑھیں گے ۔ پس 'منی' کا لفظ اکراہ پیدا کرے گا ۔ کیونکہ قرینہ دوسرے معنی کا موجود نہیں ہے ۔ البتہ خسرو اقلیم سخن سعدی نے کہا ہے ؎

مر اُو را رسد کبریا و منی کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

دوسرا سُر پنچم، دھیوت، نکھاد، رکھب وغیرہ شروع کردے تو نغمہ بگڑ جائے گا۔ یہی حال الفاظ کا ہے۔ لازم ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اُس کے گرد و پیش کے الفاظ کو اُس کے ساتھ ایک قسم کا تناسُب یا توازُن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ ایک مصرع لیجیے ع ۔ جنگل کے شیر گونج رہے ہیں کچھار میں۔ جنگل، دشت، صحرا اور بادیہ سب مرادفات ہیں، لیکن اگر مصرع مذکور میں بجائے جنگل کے صحرا کہیں تو فصاحت کا خون ہو جائے گا۔ حالانکہ چاروں الفاظ مذکورہ بالا سب بجائے خود یکساں فصیح ہیں، اور کثیر الاستعمال بھی ہیں۔ اسی طرح اس مصرع میں کہ ع "تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا"۔ بجائے صحرا کے جنگل کا لفظ نہیں آسکتا اور مُخِلِّ فصاحت ہے۔ دامن دشت، دامن بادیہ، روزمرہ کے خلاف ہے۔ قاآنی نے اپنے ایک شعر میں قلیل الاستعمال لفظ نظم کیے ہیں، مگر ثقالت و غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ اوّل چند الفاظ کی تشریح سُن لیجیے پھر شعر عرض کروں گا۔ قصر کی جمع قصور صحیح ہے، لیکن کثرت سے استعمال نہیں ہوتی۔ فارسی میں قصور بمعنی فروگزاشت یا کمی اکثر استعمال ہوا ہے۔ جیسے حور، دوراز قصور۔ اسی طرح ملاط بمعنی گارا اور حصات بمعنی سنگریزہ یا روڑا۔ شاعر کہتا ہے ۔ہ

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر ملاطش نافۂ اذفر، حصاتش لولوئے لالا

غور کیجیے، قصور کے بعد الفاظِ "با فلک ہمسر" کو سُن کر سامع سمجھ لے گا کہ یہاں قصور بمعنی خطا نہیں ہے کیونکہ الفاظِ "با فلک ہمسر" موجود ہیں۔ اسی طرح روڑے اور گارے کی مناسبت سے اینٹ کا لفظ لکھ دیا کہ ایک قسم کا تناسُب یا

خمارازاوست درسرہانشاط ازاوست دردلہا ہمو مینا ہمو ساقی ہمو ساغر ہمو صہبا

ملاحظہ کیجیے، سب کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے حالانکہ یہ نظمیں تمام و کمال صنعت سجع میں ہیں - ایک ہندی شاعر نے جس کی غزل بلکہ نظم مثل اہل عجم کے گرانمایہ ہے، صنعت سجع میں قصیدہ کہا ہے لیکن مطلع کو صنعت مذکور سے عاری نہیں رکھا - یہ بمقتضائے بشریت تھا یا ممکن ہے کہ ہندی نژاد ہونے کا نتیجہ تھا - کیونکہ ع " زبان غیر کیا، آتی نہیں اپنی زباں برسوں" وہ کہتا ہے ؎

گزشتم بوستانے راشبے در عالم رویا چہ بستانے مشام آرا طرب انگیز روح افزا

اب میں بلاغت کا ذکر کروں گا -

صاحبو! بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے - میں آپ کے روبرو بلاغت کی تعریف اس طرح کروں گا کہ سب کے ذہن پر مرتسم ہو جائے اور جو کچھ فصحاء نے لکھا ہے اس کا لب لباب ہو - جب اول اوّل بلاغت کے اصول مدوّن کیے گئے تو واضع نے بلاغت کا جزو اعظم یہ قرار دیا کہ " بلاغۃُ الکلام تطابقُ المقام " یعنی یہ کہ کلام حسب مقتضائے مقام ہو - چونکہ مقتضائے مقام کے لحاظ سے بلاغت کے اسلوب بےشمار ہو سکتے ہیں، لہذا ایک جامع و مانع اصول واضع نے قرار دے دیا - جب زمانے نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا تو علماء نے دیکھا کہ یہ تعریف بلاغت کافی نہیں ہے - بلکہ ناقص ہے - یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا کلام حسب مقتضائے مقام ہو لیکن بہت بھدّے اور بھونڈے طریقے سے کہا ہو تو کیا وہ عبارت بلیغ

کبریا کے بعد داو عاطفہ موجود ہونے سے دوسرے معنی کا قرینہ صاف ہے۔
پس یہ مصرع نواب کو یوں کہنا چاہیے تھا ۔ ع

نباشد ہمچو من در ملک دانش کامل و یکتا

اسی طرح دوسرا مصرع الفاظ غریب وثقیل کو شامل ہے ۔ یوں بدلنا چاہیے ۔

فصیح و خوش بیان و بذلہ سنج و عاقل و دانا

چونکہ میں مطلع کا بیان کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بعض شاعر صنعت سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی صنعت لے آتے ہیں ۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے ۔" باید کہ مطلع از صنعت سجع عاری باشد" ہمپایۂ انوری و خاقانی میرزا حبیب اللہ قاآنی (ملک الشعرائے فتح علی شاہ قاچار والی ایران) نے صنعت سجع میں ایک لاجواب قصیدہ کہا ہے ، جو کسی وقت بی ، اے کے کورس میں داخل تھا ۔ اس کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے ؎

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

اور بھی بیسیوں شعرائے عجم نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے ۔ سبھوں نے مطلع کو صنعت سجع سے عاری رکھا ہے ۔ میرزا سپہر لسان الملک ملک الشعرا کہتا ہے ؎

چہ سودا در سر افتادم کہ نے سر ماندو نے سودا چہ طوفاں کند بنیادم کہ ہم شد کلبہ ہم کالا

میرزا فتح علی خاں صبائے کاشانی کہتا ہے ؎

بنازد اے تخت اسکندر ببال اے مسند دارا کہ شد اسکندر دیگر بدارائی سریر آرا

میرزا فضل اللہ خاور شیرازی کہتا ہے ؎

ہیں جہاں تک ایسی فوج کا ہونا ممکن ہے جس کی تنخواہیں چڑھی ہوں اور وہ تباہ حال ہو رہی ہو۔" اس جملے کے چھ معنی ہو سکتے ہیں کہ (۱) ظاہر شکایت کرتا ہے کہ آپ کیوں تنخواہیں چڑھائے ہوئے ہیں جس سے فوج تباہ حال ہو رہی ہے۔ تنخواہیں ادا فرمائیے۔ (۲) فوج گو بظاہر مطیع ہے اور بغاوت نہیں کرتی ہے لیکن بہت بیدل ہے، اگر تنخواہوں کے ادا کرنے میں دیر ہوگی تو آمادۂ بغاوت ہو سکتی ہے۔ (۳) یہ میری کارگزاری بحیثیت سپہ سالار کے ہے کہ فوج مطیع و منقاد ہے اور باوجود اس کی بے دلی اور تباہ حالی کے، میں اس کو بغاوت سے روکے ہوئے ہوں۔ (۴) فوج کی تنخواہیں فوراً ادا ہونا چاہیے تاکہ اس کی تباہی دور ہو، ورنہ وہ جلد بغاوت اختیار کرے گی۔ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ حضور کو اطلاع دے کر اپنے فرض سے ادا ہوتا ہوں۔ بہت اندیشہ ہے کہ ملک میں شورش پیدا ہو جائے۔ (۵) فوج گو مطیع ہے لیکن بے دلی کے ساتھ اطاعت بظاہر کر رہی ہے۔ اس اطاعت و انقیاد پر اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ ایسی فوج ہرگز جاں نثاری نہیں کر سکتی اور وقت کی منتظر رہے گی اور دھوکا دے گی۔ (۶) اگر تنخواہیں ادا ہو جائیں گی تو فوج کی بے دلی اور تباہی دور ہو جائے گی اور مثل سابق فوج اطاعت شعار فرماں بردار اور جاں نثار ہو جائے گی۔

اب نظم کی مثالیں سنیے۔ بلاغت کے تمام اسلوب کا احصا کرنا بوجہ ضیق وقت کے ناممکن ہے۔ صرف چند اسلوب کافی ہوں گے۔

— مقبلؒ نے فارسی میں مرثیہ کہا ہے۔ چنانچہ ایک شعر اُس کا ملاحظہ ہو۔

کہی جائے گی ؟ ہرگز نہیں ۔ لہٰذا ضرور ہے کہ عبارت فصیح بھی ہو۔ اب دوسرا جزو بلاغت کا یہ قرار پایا کہ کلام فصیح بھی ہونا چاہیے ۔ جب ہارون رشید خلیفہ عباسی کا عہد آیا تب اُس نے کہا کہ ہنوز بلاغت کی تعریف ناقص ہے ۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کلام حسب مقتضائے مقام کرے اور فصاحت بھی ہو، لیکن اگر وہ تکرار لفظی کرتا ہے یا مضمون کی تکرار اُس کے کلام میں ہے یا وہ تھوڑے سے مضمون کو بہت مطول عبارت میں کہتا ہے تو کیا اُس کا کلام، بلاغت التزام کہا جاسکتا ہے ؟ نہیں ہرگز نہیں، اُس کا قول تھا "اَحسنُ الکلامِ مَا قَلَّ و دَلَّ" یعنی سب سے اچھا کلام وہ ہے جس میں تھوڑی عبارت میں وسیع معنی پیدا ہوں ۔ چونکہ ہارون رشید اقسام علوم میں یگانۂ روزگار تھا اور مجتہد کا درجہ رکھتا تھا، اس کا قول علماء نے پسند کیا اور تیسرا جزو بلاغت کی تعریف میں حسب تجویز ہارون رشید اضافہ کیا گیا ۔ اب بلاغت کی تعریف مکمل ہوگئی ۔ یعنی (۱) کلام حسب مقتضائے مقام ہو ۔ (۲) کلام میں فصاحت بھی ہو اور (۳) عبارت "ما قَلَّ و دَلَّ ہو ۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں ۔

میں آپ کو پہلے بلیغ نثر کی ایک مثال دوں جو مورخوں کے نزدیک بہت مشہور ہے ۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی کا قائد اعظم طاہرِ ذوالیمینین تھا جو سیف و قلم دونوں کا مالک سمجھا جاتا تھا ۔ اُس نے مامون کو ایک خط لکھا ۔ مورخوں نے اُس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے ۔ وہ یوں ہے " میں امیرالمومنین کو خط لکھ رہا ہوں ۔ فوج اور سرداران فوج اطاعت و انقیاد کے اُس اعلیٰ درجے پر

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبرؑ سا لالہ فام　　شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للہ رو کیے نہ اب اے خواہرِ امام　　وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام
بیکس ہوں، ساتھ ماں نہیں، سر پہ پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

صاحبو! یہ بند بظاہر اس قدر صاف ہے اور سلیس اور عام فہم اور الفاظ اس قدر سادہ اور دلنشیں ہیں کہ بلاغت کے نکتوں کی طرف ذہن یکایک انتقال نہیں کرتا۔ مگر نکات کو ملاحظہ فرمائیے۔ بند کے تیسرے مصرع میں "خواہر امام" کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں۔ حضرت عباسؑ حضرت زینب کو امام حسینؑ کی بہن کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ حضرت عباسؑ کی بھی بہن تھیں۔ ان الفاظ سے اُن کی شان رفیع دکھانا مقصود ہے اور در پردہ تعریض ہے کہ آپ مجھ سے وہ محبت نہیں رکھتیں جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے۔ چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ اُن کی حقیقی بہن نہیں، یہ تعریض زیادہ چبھتی ہوئی ہے۔ تعریض وہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے، جس میں واقعیت کا پہلو ہوتا ہے۔ پھر ٹیپ کا آخری مصرع نہایت کارگر ہے۔ "میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں"، یعنی آپ مجھ کو اگر بیٹا سمجھتیں تو مجھے بھی اپنے صاحبزادوں کی طرح میدان کارزار میں جانے کی اجازت دیتیں تاکہ میں بھی جناب امام حسینؑ پر نثار ہو جاتا اور شہادت کی دولت حاصل کرتا۔ پس مجھے اپنا غلام ہی سمجھ کر اجازت دے دیجیے۔ کیا خوب اپنا انکسار دکھایا ہے اور حضرت زینبؑ کی شان بلند۔

تشبیہ مرکب کا حسن ملاحظہ فرمائیے۔ جب حضرت عباسؑ پر چاروں طرف سے

بلند مرتبہ شاہے زصدر زیں افتاد　　اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امام حسینؑ کو شاہ بھی کہتے ہیں۔ جیسے جناب رسالتمآب صلعم کو شہنشاہ عرب۔ فقط شاہ کہنا شاعر نے کافی نہ سمجھا۔ بلند مرتبہ کے الفاظ بڑھائے۔ پھر کہا 'زصدر زیں افتاد'، زین کو صدر قرار دیا۔ اگر شاہ کی جگہ فقط 'حسینؑ' کہتا اور یہ کہتا کہ " ززین اسپ افتاد"، تو مطلب نکل آتا۔ مگر وہی بات ہوتی کہ ؎

دندان تو جملہ در دہان اند　　چشمان تو زیر ابروان اند

جو الفاظ شاعر نے مصرع اول میں کہے اُن سے جناب امام عالی مقام کی شان رفیع دکھائی پھر دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ گویا عرش زمین پر گر پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب عرش گرے گا تو زمین کے اندام میں لرزہ آجائے گا بلکہ زمین پاش پاش ہوجائے گی۔ شاعر کا مقصود ان الفاظ سے یہ ہے کہ سننے والوں کے دل ہل جائیں کہ بڑا سخت واقعہ ہوا۔

اب حضرت انیسؔ مرحوم فردوسی ہند کے کلام سے بلاغت کے اسلوب ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے موقع عرض کر دوں تاکہ پورا لطف حاصل ہو۔ موقع یہ ہے کہ حضرت زینبؑ کے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ شربت شہادت نوش فرما چکے ہیں۔ حضرت عباسؑ علم بردار حضرت زینب علیہا السّلام سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت مانگتے ہیں، مگر وہ انکار کرتی ہیں۔ اس بنا پر کہ اگر تم مارے گئے تو میرے ماں جائے کا یار و یاور کون باقی رہے گا جو تمھاری مثل جاں نثار اور اُن کا قوت بازو ہو، لیکن حضرت عباسؑ اصرار کرتے ہیں کہ میں جاؤں گا۔ حضرت انیسؔ حضرت عباس علیہ السلام کی زبان سے کہتے ہیں کہ اے بہن ؎

ایک ترک بادشاہ نے اپنے دشمن پر فتح پائی اور وہ قید ہو کر پا بجولاں دربار میں لایا گیا۔ پایہ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پیش کیا۔ اُس میں ایک شعر کی بلاغت پر غور فرمائیے ؎

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام　　　گرفتی و آزاد کردی ز دام

بادشاہ نے اس شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا۔ قیدی نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ شاعر کو میری طرف سے دس ہزار روپیہ انعام دو۔ شاعر نے پوچھا کہ تم مجھے کس بات کا انعام دیتے ہو۔ میں نے تمھاری شکست لکھی ہے۔ قیدی نے جواب دیا کہ تم نے مجھے ہُما کہا۔ اگر تم مجھے شغال کہتے تو میں تمھارا کیا کر سکتا تھا۔ غور فرمائیے کہ شاعر نے دشمن کی تعریف میں کس قدر مبالغہ کیا۔ پہلے تو اُس کو ہُما کہا جو ایسا جانور ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے وہ بادشاہ ہو جائے۔ پھر اُس کی شان رفیع دکھائی کہ وہ عرش پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن اپنے بادشاہ کی شان کس قدر بلند کی کہ اُس نے ایسے بلند پرواز ہما کو گرفتار کر لیا اور پھر اُس کی طرف سے ایسا بے پروا اور مستغنی ہے کہ اُس کو چھوڑ بھی دیا۔ کیا اچھا اسلوب بلاغت ہے۔

صاحبو! یہاں فتح گڑھ میں ایک جلسے میں ایک اسپیکر نے اپنی تقریر میں بلاغت کا ایک اسلوب نئی طرح کا برتا۔ وہ آپ کے سننے کے لائق ہے۔ ۱۸۸۷ء میں نواب محمد اسحاق خاں جنٹ مجسٹریٹ ہو کر آئے تھے (یہ وہی اسحاق خاں تھے جو ۱۹۰۷ء میں یہاں ججی کے عہدے پر تھے) تھوڑے ہی عرصے میں وہ تبدیل ہوئے تو ان کا رخصتی جلسہ کیا گیا۔ ایک شخص نے

برچھیاں چلنے لگیں تو اس منظر کو کس قدر خوشنما اور رفیع کر کے دکھایا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے   جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

یا جب اہل بیت ایک رسّی میں باندھے گئے تھے تو اس اہانت آمیز صورت کو کس قدر خوشنما کر کے دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن   جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

ایک اسلوب بلاغت یہ بھی ہے کہ دشمن کا بیان اپنے ممدوح کے مقابلے میں کیونکر کیا جائے۔ یہ نازک موقع ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ذلیل، کمزور اور حقیر کہا جائے تو اُس پر فتح حاصل کرنا شان کو بلند نہیں کرتا اور اگر اُس کی شان و شوکت بیان کی جائے تو مرثیے میں حضرت امام کا تقدس مذہبی اُس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت انیس دشمن کی مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر   روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

ناوک پیام مرگ کے، ترکش اجل کا گھر   تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر

دل میں بدی، طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

چہرہ مہیب، غیظ سے آنکھیں لہو کے جام   تھرائے سام خوف سے، کاندھے پہ وہ حُسام

موذی سیاہ بخت سیہ دل سیاہ فام   کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام

کُندہ سقر کے قعر کا، پُتلا گناہ کا

دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

پڑھتے ہیں، جیسا کہ میں مثالوں کے ذریعے سے ظاہر کروں گا -

(۱) یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظ کی جگہ ہائے مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظ پڑھتے ہیں -

گدائے کہ برخاطرش بند نیست بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

-- بہ کی 'ہا' ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیے کہ 'بہ' کی (ہ) 'از' کی (ز) میں مل کر آواز دے اور 'از' کا ہمزہ گر جائے یعنی آواز نہ دے۔ اگر اس کی آواز نکالی جائے گی تو 'بہ' کی (ہ) تقطیع میں نہ آئے گی - 'بہز' کی آواز نکلنا چاہیے - اسی طرح اس مصرع میں " دایہ مہر و راہبر بلوغ سہ پسر" سہ کی (ہ) کو ملفوظ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ یہ ہائے مختفی ہے اور سین کی حرکت کو اشباع ہے - گو یہ (ہ) تقطیع میں محسوب ہو لیکن کچھ مضائقہ نہیں - چونکہ ہائے ملفوظ و مختفی کا امتیاز مشکل ہے، ان کے کچھ قواعد عرض کردوں -

واضح ہو کہ 'ہا' کی دو قسمیں ہیں - ایک مختفی اور دوسری ہائے ملفوظہ یا مظہرہ۔ سرمہ، نشانہ، خامہ اور شانہ میں ہائے مختفی ہے اور مہ، شہ، رہ، گنہ اور سیہ میں ہائے ملفوظ ہے - ان دونوں 'ہا' کا قافیہ جائز نہیں - قدماء کے یہاں مثلاً سعدی، صائب، حزیں کے یہاں شاذو نادر دونوں کا اجتماع ہوگیا ہے۔ مگر متاخرین کے یہاں جواز نہیں - ہائے مختفی اپنے ماقبل کی حرکت کا اظہار کرتی ہے - خود 'ہا' کا اظہار کسی طرح روا نہیں - اکثر لکھنؤ والے مژہ کو سیہ اور گنہ کی طرح بہائے ملفوظ بولا کرتے ہیں - مژہ کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ لفظ تقطیع میں دو حرفی محسوب ہو 'ژے' کی حرکت دبی زبان سے پڑھتے ہیں جیسے

وداعی تقریر میں معمولی مدح و ثنا کے بعد اُن کے شوق شکار کی تعریف بھی کی۔
لوگوں میں سرگوشی ہونے لگی کہ یہ عامیانہ تعریف کیسی - شوق شکار کیا قابل تعریف
چیز ہے، لیکن اُس شخص نے اس عامیانہ بات کو شاعرانہ پہلو سے بیان کیا۔
یعنی اُس نے یہ کہا کہ ہمارے نواب صاحب ممدوح کو شکار کا شوق ہے اور یہ
اُن کی شان کے شایاں ہے - نہ اس لیے کہ جانوران صحرائی ہلاک ہوں اور
آپ کی تفریح طبع ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اس شکار کے ذریعے آپ کو دلوں کا شکار
کرنے کی مشق بہم پہونچ جائے ؂

شہاں را ضرورست مشق شکار — کہ آید پئے صید دلہا بکار

—— اس تقریر کے بعد سامعین نے بہت داد دی اور کہا کہ ہم نے پہلے بیان کو
عامیانہ سمجھا لیکن تم نے آخر میں شاعرانہ پہلو اختیار کر کے کلام کو بلیغ کر دیا - اب
میں بلاغت کے موضوع کو ختم کرتا ہوں اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول عرض کروں گا۔

فن شعر خوانی

آپ صاحبوں کو میری زبان سے یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ لوگوں کو
فارسی شعر پڑھنا نہیں آتا - بعض لوگ فارسی میں خوب استعداد
رکھتے ہیں مگر شعر غلط پڑھتے ہیں - یعنی جو فن شعر خوانی کے قواعد ہیں اُن سے
واقف نہیں - پھر اُن پر عمل کرنا یعنی چہ؟ کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن پر
یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا ہے - بہر حال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود
تلاش کے مجھے نہیں ملا - میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی
ہوگا - اس میں مجھے اپنے اجتہاد اور ایجاد و اختراع سے تمام تر کام لینا پڑا۔
اُردو کے اشعار میں جب فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں تو لوگ اکثر اُن کو بھی غلط

پڑھنے والا نہ ٹھہرے اور الفاظ کو ملاتا ہوا پڑھے۔ جیسے اس شعر میں ؎

دمہ، دم فرو گیر چوں چشم گرگ   شدہ کارگر گینہ دوزاں بزرگ

اگر دمہ کے لفظ پر ذرا دم نہ لیا جائے تو سامع سمجھے گا کہ پڑھنے والا دما دم کہہ رہا ہے اور دمبدم، معمولی معنی قیاس کرے گا جو غلط درغلط ہو جائے گا۔ دمہ کے کئی معنی ہیں۔ ایک معنی سردی کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔ نظامی نے جاڑے کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے، جشن نوشابہ کے ذکر میں۔ جب دمہ کا لفظ ملایا نہ جائے گا تو سامع اگرچہ کہ دمہ کے معنی نہ جانتا ہو لیکن ذرا بھی ذہن سلیم رکھتا ہوگا تو اتنا سمجھ لے گا کہ کوئی چیز ہے جو دم گھونٹے دیتی ہے، چشم گرگ کی طرح۔ پھر آگے کے اشعار جب کہ پڑھے جائیں گے تو اُن میں صاف صاف جاڑے کا ذکر ہے۔ سامع قیاس کرے گا کہ دمہ سردی کے معنی میں ہے۔ لیکن جب کہ دمہ کو دم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو سامع سوائے دمادم کے کچھ معنی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ آگے کے اشعار اس کو دمادم کے معنی سمجھنے میں مدد دیں گے۔

(۳) اسی طرح کسی موقع پر ایک مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع میں ملا کر پڑھے جائیں گے جیسے ان اشعار میں ؎

الا تا نگرید کہ عرش عظیم   بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم

الا تا نخفتی بغفلت کہ نوم   حرام ست بر چشم سالار قوم

ان اشعار کے لفظوں کی تقسیم اس طرح پر کرنا چاہیے۔

الا تا نہ گرید، کہ عرش عظیم بلرزد   ہمی چوں بگرید یتیم

ع ستم ست برنگاہم مژہ را نقاب کردن

—— دوسرے یہ کہ سہ حرفی محسوب ہو مگر مضاف یا موصوف واقع نہ ہو تو جس طرح 'دل' بحالت اضافت جب سہ حرفی محسوب ہوتا ہے اُس وقت لام کے کسرے کو اشباع کرتے ہیں جیسے ۔

دلِ عاشق برنگِ برق تڑپا

—— اسی طرح مژہ کی ژے کی حرکت کھینچ کر پڑھیں گے جیسے

ع ۔ ہوگئی نوکِ مژہ نشتر مجھے

—— تیسرے یہ کہ مضاف یا موصوف واقع ہو تو وہاں اس 'ہا' کو ہمزہ سے بدل دیں گے جیسے

ع ۔ مژۂ یار نوکِ پیکاں ہے

—— یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ دو حرفی لفظ والی "ہا" کبھی ہمزہ سے نہیں بدلتی۔ یہ بھی جاننے کے لائق ہے کہ ہائے ملفوظ بحالت جمع قائم رہتی ہے ۔ جیسے راہ ہا ، چاہ ہا ، زرہ ہا ، گرہ ہا ، اور ہائے مختفی بحالت جمع ساقط ہو جاتی ہے جیسے میوہا ، جاہا ، خاہا ، وغیرہ ۔ اور بحالت تصغیر ہائے مختفی کاف عجمی سے بدل جاتی ہے جیسے جامگک ، خامگک وغیرہ ۔ اور بحالت اضافت ہمزہ سے بدل جاتی ہے جیسے جامۂ من ، خامۂ من ، جامۂ نو وغیرہ ۔ چونکہ دونوں 'ہا' کے غلط لہجے سے ادا کرنے میں شعر غلط ہو جاتا ہے اس لیے میں نے یہ حالات بالتفصیل آپ حضرات کی دلچسپی کے لیے بیان کیے ۔

(۲) دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ کسی جگہ ذرا ٹھہرنا چاہیے مگر وہاں

کسوت، وخلعت پر زور دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام الفاظ جن پر زور دیا گیا ہے شاعر کا کمال شاعری ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سجع کے تین قوافی عموماً زور دینے کے لائق اس وجہ سے نہیں ہوتے کہ شاعر اُن کے لانے کا پابند ہے اور وہ اُن کو تلاش کر کے لانے پر مجبور ہے۔ اُن میں آورد بھی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے علاوہ جو اور قوافی شعر میں آ گئے ہیں وہ اُس کی روانی اور سلاست طبعی پر دلیل قاطع ہیں اور اُس کی قادرالکلامی ظاہر کر رہے ہیں اور محض آمد ہی آمد دکھا رہے ہیں لہٰذا زور دینے کے لائق ہیں۔ غرض کہ وجدان صحیح اس معاملے میں اچھی رہنمائی اور رہبری کرے گا۔

(۵) شعر پڑھنے کے لیے ضرور ہے کہ الفاظ کے اعراب غلط نہ کیے جائیں۔ میں صرف دو لفظوں کا ذکر اس وقت کروں گا جو عموماً غلط بولے جاتے اور غلط پڑھے جاتے ہیں۔ "مطلع اور موقع" اُردو میں بلا ترکیب فارسی جب یہ لفظ بولے جائیں گے تو عموماً 'لام' اور 'قاف' پر فتحہ کہا جاتا ہے اور یہ ٹھیک ہے، اِلّا اُس حال میں کہ جملے میں یہ الفاظ مفعول یا مجرور[1] پڑیں۔ اس صورت میں 'لام' اور 'قاف' پر کسرہ بولا جائے گا۔ لیکن فارسی میں چاہے بلا ترکیب یا مع ترکیب ان کا استعمال کسی طرح ہو 'لام' یا 'قاف' مکسور[2] ہی بولا جائے گا۔ اُردو میں بھی جب یہ لفظ ترکیب فارسی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو غلطی سے لہجے میں 'لام' اور 'قاف' کو مفتوح کہا جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کرنا چاہیے۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ ہیں

---

[1] جیسے موقع کو، مطلع سے۔ [2] از غیاث اللغات و منتخب۔

الا تا نخفتی بغفلت، کہ نوم حرام ست   بر چشم سالار قوم

——شعر اول میں لفظ "گبرید" اور شعر دوم میں لفظ "غفلت" پر زرا ٹھہرنا چاہیے۔

(۴) بعض الفاظ پر زور دینا چاہیے جس کو انگریزی میں emphasis کہتے ہیں۔ اُس کے قواعد کا احصاء کرنا مشکل ہے۔ صرف مذاق سلیم سے امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون کون الفاظ زور دیے جانے کے قابل ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جو عام فہم ہیں۔ موشگافیوں سے قطع نظر کی جاتی ہے ؎

امام ثامن ضامن۔ حریمش چوں حرم آمن   زمین از حزم او ساکن۔ سپہر از عزم او پویا

——پہلے مصرع میں حریم اور حرم پر اور دوسرے مصرع میں حزم اور عزم پر زور دینا چاہیے۔ مذاق سلیم بتاتا ہے کہ حزم اور عزم قوافی ہیں اور حریم اور حرم میں بڑی جنسیت ہے لہذا انہی پر زور دینا چاہیے۔ شاعر کی قادر الکلامی یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں ؎

تنش از قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ   بروں پُر سرمہ سودہ درون پُر لولوئے لالا

——مصرع اول میں 'قیر' اور 'شیر' پر زور دینا چاہیے۔

نہال باغ علیین۔ بہار مرغزار دیں   نسیم روضہ لیسین۔ شمیم دوحہ طاہا

——مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم، روضہ اور شمیم، دوحہ، گویا چھ الفاظ پر زور دینا چاہیے ؎

خرد شد ہر دم از گردون کہ پوشد بر تن ہامون   ز سنبل کسوت اکسون ز لالہ خلعت دیبا

——اس شعر کے مصرع اول میں 'خرد شد' اور 'پوشد' اور مصرع آخر میں

لوگوں کے دل ہلنے لگتے تھے۔ پھر جب وہ مرثیے کا بستہ ہاتھ میں لیتے تھے تو رقیق القلب سامعین کو رقّت شروع ہونے لگتی تھی۔ اور جب وہ پڑھنا شروع کرتے تھے تو سیکڑوں سامعین چہروں کو رومال سے پونچھتے دکھائی دیتے تھے اور بَین پڑھتے وقت تو گریہ وزاری اور آہ و بُکا کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

اس بیان میں کوئی بات مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے یا کسی کے پھوڑا نکلتا ہے اور ڈاکٹر عمل جرّاحی کرنے کے واسطے آتا ہے، تو اُس وقت عزیز و اقربا دوست و احباب جو مریض کے پاس ہوتے ہیں ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُن میں بعض کے دل دھڑکنے لگتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ چیر پھاڑ کا وقت قریب ہے۔ پھر جب ڈاکٹر نشتر کا بکس جیب سے نکالتا ہے تو رقیق القلب لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کون دیکھے، حالانکہ ابھی ڈاکٹر نے کوئی کام جرّاحی کا نہیں کیا ہے۔ پھر ڈاکٹر اپنی جگہ سے اُٹھ کر مریض کے پاس جاتا ہے۔ اُس وقت اشخاص موجودہ میں سے چند شخص اور منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے سرک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمل جرّاحی کے وقت شاید ہی دو ایک شخص ایسے کڑے جی کے ہوتے ہوں جو چیر پھاڑ دیکھنے کی ہمت کرتے ہوں۔ یہی حال ذاکر کا سامعین کے ساتھ ہے کہ اُس کو منبر پر پڑھنے کے لیے تیار اور آمادہ دیکھ کر سامعین کے دلوں پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کی ایک کیفیت طاری ہوتی ہوگی اور ہر شخص جوش مذہب سے لبریز ہو کر شہدائے کربلا کی شہادت کے حالات سننے اور اہل بیتؑ کی مصیبتوں کا

جن کے اعراب اگر صحیح معلوم نہیں ہیں تو ان کا لہجہ غلط ہو جائے گا اور شعر غلط پڑھا جائے گا۔ اس موضوع کو ختم کر کے اب میں حرکات اور اشارات کا ذکر کروں گا جن سے شعر خوانی میں کام لیا جاتا ہے۔

حرکات وسکنات و اشارات

یورپ میں ایسے ماہرین فن ہیں جنھوں نے تمام عمر کسی ایک فن کے حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ پروفیسر ہارٹلی فن شعر خوانی کے ماہر آکسفرڈ یونیورسٹی میں تھے۔ جنھوں نے ستر برس کی عمر تک صرف یہ ایک کام کیا کہ شعر پڑھا اور پڑھایا۔ شعر پڑھتے وقت وہ شعر کی صورت بن جاتے تھے اور شعر میں جو جذبات ہوتے تھے اُن کا مجسمہ گویا نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ چہرے کی جھرّیاں مِٹ جاتی تھیں اور خون کا دَورہ چہرے کی رگ و پئے میں اس قدر ہوتا تھا کہ چہرے پر جوانی کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ چشم و ابرو کے اشارات اور تیور سے شعر کے جذبات بتاتے تھے۔ ہاتھ کو یا جسم کے کسی اور حصّے کو جنبش نہیں دیتے تھے۔ شعر میں اگر رنج، خوشی، تعجب، حیرت، آرزو، غصّہ، رحم، سوگ وغیرہ کا ذکر ہے تو اُس کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی تھی۔ اس فن کے ماہر ہندوستان میں حضرت انیسؔ مرحوم تھے بلکہ ماہر ہونے کے ساتھ اس کے موجد بھی تھے۔ میرے لڑکپن میں ایک بوڑھے آدمی نے جس نے انیسؔ و دبیرؔ کی مجالس عزا دیکھی تھیں، حضرت انیسؔ کا حال شعر پڑھنے کا بیان کیا کہ پہلے وہ جس وقت منبر پر جاتے تھے تو مجلس میں خاموشی اور سنّاٹا ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کسی سے نہ کرتا تھا۔ پہلے وہ آستین چڑھاتے تھے۔ یہ دیکھ کر

مظالم ہوئے اور سخت تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا وہ حالات سُن کر پتھر دل بھی پانی ہو جائیں اور رقیق القلب لوگوں پر رقّت کا طاری ہونا تو معمولی بات ہے! اور پھر ذاکر بھی کون حضرت انیس مرحوم جن کے پڑھنے کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور جن کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کرتا تھا، جن کے ایک ایک لفظ میں خونِ جگر کی چاشنی ہوتی تھی۔

حضرت انیس صرف چشم و ابرو کے اشارے سے جذبات کو ادا کرتے تھے۔ کبھی خاص موقعوں پر ہاتھ کو بھی جنبش دیتے تھے لیکن اُن کے اشارات و حرکات نہایت متانت کا پہلو لیے ہوتے تھے۔ ایک ذاکر نے اُن کی نقل کرنا چاہی اور چاہا کہ مرثیہ پڑھتے وقت ایسا بتائے کہ ہر بات اور ہر جذبے کو حرکات سے ادا کرے۔ ایک پہلوان کا ذکر آیا۔ مصرع یہ تھا کہ " آیا تھا جھبکتا یہ دبکتا ہوا بھاگا " اس کو انھوں نے یوں بتایا کہ پہلے تو جھبکے اور پھر دب کر اور سمٹ کر پیچھے ہٹے۔ اُن کا جھبکنا اور دبکنا لوگوں کو ایسا بھونڈا اور بیہودہ معلوم ہوا کہ سب ہنس دیے اور بہت دیر تک ہنسی بند نہ ہوئی۔ جب اُنھوں نے بَین پڑھے تو کسی کو رقت نہ ہوئی۔ سامعین منہ پر رومال رکھے ہوئے ہنس رہے تھے اور ضبط نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ذاکر کا جھبکنا اور پھر دب کر پیچھے ہٹنا سب کے پیش نظر تھا۔ غرض کہ ذاکر کو بہت شرمندگی ہوئی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ کجا وہ اور کجا انیس ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا —

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ شعر پڑھتے وقت زیادہ بتانا اور خلاف تہذیب

جانکاہ منظر دیکھنے کو آمادہ ہوجاتا ہوگا، اور آمادہ ہوجانا، ہے بھی ایک فطری امر،
کیونکہ کربلا کے خونیں میدان میں خاندان رسولؐ کے بوڑھوں، نوجوانوں اور بچوں
کو جس بیدردی سے تڑپا تڑپا کر بھوکا پیاسا شہید کیا گیا، اُس کا حال سُن کر
اپنے تو اپنے اغیار بھی رُو دیتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِس وقت چند ہی
کلمات سُن کر بعض حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ مناسب ہے کہ
تھوڑا یہ حال بھی سُنا دیا جائے کیونکہ انیسؔ کی داد دینا ان واقعات کے جاننے
پر منحصر ہے۔ لکھا ہے کہ جب امام حسینؓ کربلا پہنچے تو آپ کے ہمراہ صرف بہتّر
آدمی تھے۔ جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ کم سن بچے تھے۔ کچھ مخدّراتِ عصمت
تھیں۔ حضرت امام عالی مقام مسلمانوں کے آخری نبی حضرت محمد صلعم کے چہیتے
نواسے، بی بی فاطمہؓ کے لاڈلے بیٹے اور حضرت علیؑ کے پیارے فرزند تھے۔
کربلا کا جب واقعہ رونما ہوا تو ۶۱ھ تھا۔ اس وقت مذہب کی آڑ میں مسلمان
وہ سب کچھ کر رہے تھے جوان کے رسولؐ نے منع کیا تھا۔ وہی لوگ اولادِ رسولؐ
کے دشمن تھے۔ اُنہی لوگوں نے امام عالی مقام کو بُلا کر مع عزیز و اقارب و احباب
تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا۔ سب سے اہم واقعہ چھ مہینے کے شیر خوار بچے
کا ہے کہ امام عالی مقام اس کو ہاتھوں پر لے کر میدان میں آئے اور اشقیا سے
بچے کے لیے پانی کا سوال کیا۔ ایک ظالم نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ وہ بیزبان
بچّہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر شہید ہوگیا۔ میرے خیال میں تو ایسا ظلم ازل
سے اب تک نہیں ہوا اور قیامت تک نہ ہوگا۔ یہی وہ دردناک واقعات
ہیں جن کو سُن کر ہر ایک روتا ہے اور امامؑ کے اہلبیتؑ پر شہادت کے بعد جو

کا کلام سننے کے مشتاق ہوں گے تاکہ تفریح طبع ہو -

اب میں صرف بزم مشاعرہ کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ ایسی انجمنوں میں شاعروں اور سخن شناسوں کا جمع ہونا علم و ہنر کے حق میں نہایت مفید ہے اور جو حضرات فن شعر گوئی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پہ تازیانے کا کام کرتا ہے - ایک دوسری خوبی بزم مشاعرہ میں یہ ہے کہ مختلف مذاہب و مراسم و عقائد کے اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور باہم برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں جس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ علم و ہنر کی ترقی کے سوا اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے -

دو اب مجلس اشارات وحرکات کرنا اہل مجلس کے لیے موجب ریش خند ہوتا ہے۔
اس سے پرہیز چاہیے بلکہ چشم و ابرو کے اشارے بھی اعتدال کے اندر رہیں۔
ورنہ ان میں بھی مبالغہ کرنا رقاصہ اور مُغنیہ کے بھاؤ سے مشابہ ہو جائے گا ۔
بزم مشاعرہ ہو کہ مجلس عزا سامعین کے نزدیک قابل استہزا سمجھا جائے گا۔
ممالک یورپ میں اس فن کے ایسے ماہر ہیں کہ اگر ایک ہی مصرع یا شعر میں
متضاد الفاظ پاس پاس جمع ہوں تو ان کو بھی اشارات وحرکات سے اس خوبی
کے ساتھ ادا کریں گے کہ تصنع معلوم نہ ہوگا ۔ مثلاً رنج وخوشی، آرام وتکلیف،
محبت ونفرت کو اس طرح بتائیں گے کہ رنج کے لفظ پر جو لہجے میں غم ہوگا تو
فوراً خوشی کے لفظ پر آواز بدل جائے گی ۔ اسی طرح محبت کے لفظ پر ایسی
آواز نکلے گی کہ جس سے محبت ٹپکے اور فوراً نفرت کا لفظ آتے ہی آواز اور
صورت ایسی بدل جائے گی کہ نفرت برسے ۔ یہ تبدیلی آواز اور تغیر صورت
بلا قصد ہوگی ۔ یہ بات نہایت مشکل ہے ۔ عمر بھر محنت کرے تب حاصل ہو سکتی
ہے ۔ چونکہ اشارات وحرکات سے جذبات کا ادا کرنا فن شعر خوانی سے متعلق
ہے اور اس میدان میں قدم رکھ کر لوگ بے راہ چلنے لگتے ہیں اس لیے
میں نے بطور مختصر اس کا ذکر کر دیا ۔

صاحبان والا شان! میں نے جو موضوع قرار دیے ۔ مجھے وہ وقت مقررہ
کے اندر عرض کیے ۔ شرح و بسط کے ساتھ عرض کرنے کے واسطے تو کئی روز
درکار ہیں ۔ اب میں زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا ۔ اکثر حضرات سادہ جی "چند الشعرا"[۱]

---

[۱] ایک مشہور ظریف شاعر کا تخلص ہے ۱۲

آج کا جلسہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔ میں نے اس شہر میں بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں۔ کسی میں ہندو مسلمان دونوں اس کثرت سے جمع نہیں ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہندوؤں کا جلسہ ہے تو مسلمانوں کو اس کثرت سے شریک ہوتے، میں نے نہ دیکھا تھا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ خاص مسلمانوں کا جلسہ ہے تو یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو ایسے جلسے میں اس کثیر تعداد سے جمع ہوئے ہیں۔ صاحب کلکٹر بہادر کی رونق افروزی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ جلسہ سرکاری طور پر کیا گیا ہے کہ جس کے باعث اتنا مجمع ہے۔ اصل یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے نام کا جادو ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے اور اُسی شہید قوم کے کارناموں کا نقش ہمارے دلوں پر سویدا کی طرح ہے، جو جذبِ مقناطیسی سے اس وقت ہم سب کو اس جلسے کی طرف کھینچ رہا ہے۔

میرے نزدیک ہندوؤں نے جوق در جوق آکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب لیاقت یا حُسنِ عمل کی داد دینے کا موقع آتا ہے تو وہ فیاضانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں اور دریا دلی سے کام لیتے ہیں اور خود غرضی یا مذہب یا قومیت کا خیال چھوڑ دیتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ دوستی کالے گورے کا امتیاز نہیں جانتی، اسی طرح قدردانی اور شکرگزاری بھی مذہب اور قومیت کا فرق نہیں رکھتی۔ اگر قابلیت، قومی ہمدردی اور حسن عمل قابل قدر چیزیں ہیں تو ہر شخص کو بلا خیال مذہب و قومیت کے اس فنڈ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں خود اپنی نسبت نہیں

سر سیّد میموریل فنڈ

اور

مسلم یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل

ماہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں بمقام ٹون ہال فرخ آباد ایک جلسہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کا زیر صدارت جناب مسٹر آر، پی ڈیوہرسٹ صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ سرسید میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ علی گڑھ سے ایک ڈپوٹیشن بسرکردگی جناب آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر آکر فتحگڑھ میں ٹھہرا تھا۔ مرزا عرفان علی بیگ ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد، یہاں کی لوکل کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور میر کرار حسین مرحوم مختار عدالت اُس کے سکریٹری تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے مُنشی صاحب سے ڈپوٹیشن کی تائید میں اسپیچ دینے کی فرمائش کی۔ میموریل فنڈ کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کو بیادگار سر سید مرحوم، یونیورسٹی کے درجے پر پہونچایا جائے۔ جو اسپیچ دی گئی، درج ذیل ہے:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

سجدے کی جا ہے شکر خدا کا مقام ہے ۔۔۔ موقع ہے آج کیجیے کرنا جو کام ہے
کالج کے حامیوں کا یہاں ازدحام ہے ۔۔۔ اب حسن اتفاق میں کس کو کلام ہے

وہ کام ہو کہ روم سے تا شام نام ہو • وہ عزم ہو کہ بخت سکندر غلام ہو

کرتا تھا۔ مسٹر فریکلن سیاح نے جو سعدی کی قبر کا حال اپنے سفرنامے میں لکھا ہے ہیں نے وہ بچشم خود دیکھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:-

"حقیقت میں قبر بہت بوسیدہ ہوگئی ہے اور عنقریب کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر، جو زہد و تقویٰ، ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔ مجھے جو حسن عقیدت شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ تھا، اُس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرا دوں، مگر حسین علی مرزا نے، جو شاہ ایران کا پانچواں بیٹا اور فارس کا گورنر تھا، مجھ سے بہت اصرار اور سرگرمی سے یہ کہا کہ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، میں خود سعدی کی قبر کی مرمت اُسی خوش اسلوبی سے کرادوں گا جس طرح کریم خاں زند نے حافظ شیرازی کے مقبرے کی مرمت کرائی تھی، لیکن افسوس کہ اُس شہزادے نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔"

صاحبو! کیا عبرت کی جگہ ہے کہ ایک عیسائی مذہب اپنے ملک سے ہزاروں کوس نکل کر ایک اجنبی ملک میں اپنے کار خاص پر جاتا ہے اور وہاں سفر کی حالت میں ایک مسلمان مصنف کی یہ قدر کرتا ہے کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے اُس کے مقبرے کی مرمت کرانا چاہتا ہے، حالانکہ کوئی واسطہ مذہب یا قوم یا ملک کا اُس کے ساتھ نہیں رکھتا، اور ایک مسلمان شاہزادہ

کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کس فرقے اور کس جماعت کی طرف سے اپیل کر رہا ہوں ۔ آیا ہندوؤں کی طرف سے یا مسلمانوں کی جانب سے ۔ بہر حال میں اس وقت ایسے لوگوں کا قائم مقام ہوں جو انصاف پسند ہیں اور قومی ہمدردی اور لیاقت کی داد دینے والے ہیں اور ملک کی خیر خواہی اور گورنمنٹ کی وفاداری کی قدر کرنے والے ہیں ۔ لیاقت کی قدر شناسی کا سبق ہم کو انگریزوں سے سیکھنا چاہیے ۔ ابھی حال میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ مسٹر منموہن گھوش کی یادگار منانے کے لیے انگلستان میں چندہ کیا گیا ہے ۔ ذرا غور فرمائیے گا ، کجا بنگالہ کجا انگلستان ، سمندر پار ہزاروں میل کا فرق ع
ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا ۔ مذہب و ملت اور قومیت کا فرق ، اس سے بھی زیادہ گویا سیاہ اور سفید کا فرق ۔ اس پر مستزاد ، جیسا کہ کہا جاتا ہے ، کہ بنگالیوں سے انگریز بہت جلتے ہیں ۔ اس بنگالی کی یادگار منانے میں ، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ قابلیت کی قدر دانی کرنے میں اور دوست کے ساتھ دوستی کا سچا برتاؤ اور اخلاص برتنے میں ہم ، ذات ، مذہب ، قوم ، جماعت کا کچھ خیال نہیں کرتے ، نہ کالے گورے نہ فاتح مفتوح میں کچھ تمیز کرتے ہیں ۔

سر گور اُوسلی صاحب کا حال آپ نے پڑھا ہوگا ، جب ۱۸۱۱ء کے شروع میں بعنوان سفارت انگلستان کی طرف سے صاحب موصوف فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں گئے ، اُس وقت کچھ عرصے تک شیراز میں اُن کا قیام ہوا ۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ " میں وہاں اکثر شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کیا

اور وفاداری کرنا سیکھیں اور اُن نعمتوں کی قدردانی کریں جو دولت برطانیہ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں۔ وہ یہ بات چاہتے تھے کہ قوم کا ہر فرد، نہایت صلح جو اور بکار آمد سٹیزن (متمدن) بن جائے۔ وہ دلدادۂ اسلام یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور حمیت اسلامی پیدا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالج کے یہ اغراض قابل پسند نہیں۔ علی گڑھ کالج اس بات کی یادگار ہے کہ سرسید نے اپنی قوم کی خدمت یوں نمایاں طور پر کی اور اب جو متفقہ کوششوں سے اُس کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہونچائیں گے، تو وہ اس بات کی یادگار ہوگا کہ قوم نے سرسید کے احسانات کا شکریہ یوں نمایاں طور پر ادا کیا ہے۔

صاحبو! کالج کی عمارتوں کو خوب وسیع اور عالیشان کیجیے، بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ کی تعداد بڑھائیے۔ وظائف اور انعامات کثرت سے قائم کیجیے۔ غرضکہ کالج کو تعلیم کا مرکز بنا دیجیے تاکہ وہ مثل بغداد کے مدرسۂ نظامیہ یا قرطبہ کی یونیورسٹی یا غرناطہ کے دارالعلوم کے تمام اسلامی دنیا میں مشہور و معروف ہو جائے۔ عہد سلطنت عباسیہ میں مدرسۂ نظامیہ نے اور دولت بنی اُمیّہ کی بدولت تعلیم گاہ قرطبہ و غرناطہ نے وہ فروغ پایا تھا کہ اسلامی دنیا کے سوا یورپ و افریقہ کے دُور دراز ملکوں سے طالب علم وہاں پہونچا کرتے تھے اور جو شخص اُن درسگاہوں سے پڑھ کر نکلتا تھا اُس کے مستند سمجھنے میں کسی کو کلام نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ علی گڑھ کالج جب محمڈن یونیورسٹی کے درجے پر پہونچ جائے گا، تو تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو سکتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے حق میں بڑی رحمت ثابت ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے اور مکتب جابجا قائم

باوجودیکہ اس مصنف کا ہم وطن ، ہم مذہب اور ہم قوم ہے ، یہ بے اعتنائی عمل میں لاتا ہے ! انہی سرگور کے ایک چھوٹے بھائی اور اہل کمال کے قدرشناسوں کا ایک نمونہ ، ہمارے میر مجلس مسٹر ڈیوہرسٹ صاحب بہادر ہیں ۔ باوجودیکہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے سوائے انسانیت کے رشتے کے ، کوئی دوسرا واسطہ قوم یا مذہب یا ملک وغیرہ کا نہیں رکھتے ، لیکن سرسید کی قدردانی میں آپ ، اُن کے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یقیناً اُسی خوشی سے چندے میں شریک ہوں گے جیسے ہم سب لوگ ۔

صاحبو ! جب کہ مہذب قوموں میں غیر قوموں کے ساتھ یہ قدردانی ہے ، جس کی مثالیں ابھی عرض کی گئیں ، تو سرسید ہمارے تو بھائی تھے ۔ ہم اُن کے عمدہ کاموں کی داد دیتے ہیں ، تو کیا بڑی بات ہے ۔ اُس فدائے قوم نے کتنا بڑا احسان اپنی قوم پر کیا ہے کہ اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچا دیا ہے ۔ سرسید پہلا شخص تھا جس نے یہ کہا : "الاسلام ھوا لفطرۃ والفطرۃ ھی الاسلام" ۔ وہ جس ملک اور جس قوم میں پیدا ہوتا ، اُس کے لیے باعث افتخار ہوتا ۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے سے سرسید کا منشا یہ تھا کہ ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں معلم نہ صرف اُستاد کا تعلق شاگردوں کے ساتھ رکھیں ، بلکہ اُن کے ولی اور والدین کے قائم مقام ہوں ۔ ایسی تعلیم گاہ ہو کہ جہاں تعلیم نظری و عملی دونوں میسر آئیں ، جہاں طلبہ آپس کی خیر خواہی اور ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سیکھیں ، جہاں خویشتن داری سکھائی جائے ، جس کو انگریزی میں "سیلف ریسپکٹ" کہتے ہیں ۔ ایسا دائرالعلم ہو جہاں طلبہ گورنمنٹ کی خیر خواہی

بجائے موجودہ عظیم الشان عمارتوں کے چند جھونپڑیاں مکتب خانوں کی ہوتیں، جن میں ملا لوگ بوریا بچھائے ہوئے لڑکوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور اہل محلہ کی خیرات سے اُن کا گزارہ ہوا کرتا اور علی گڑھ سے باہر اُن مکتبوں کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

صاحبو! چھوٹی اور بڑی تعلیم گاہوں کا باہم مقابلہ کیجیے۔ ایک مڈل اسکول لیجیے اور ایک ہائی اسکول۔ دونوں میں مڈل کلاس ہے، دونوں جگہ یکساں کتابیں ہیں، مگر ہائی اسکول کے مڈل کلاس کے طالب علم بمقابلہ مڈل اسکول کے مڈل کلاس کے طلبہ کے، زیادہ لائق ہوں گے۔ پھر ہائی اسکول لیجیے اور کالیجیٹ اسکول۔ دونوں میں انٹرنس کلاس اور دونوں درجوں میں یکساں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر کالیجیٹ اسکول کے انٹرنس کے طالب علم بمقابلہ ہائی اسکول کے انٹرنس کے طالب علم کے، زیادہ ہوشیار اور لائق ہوں گے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ ایک معمولی کالج ہے اور ایک یونیورسٹی کالج۔ دونوں جگہوں کے ایف، اے۔ بی، اے۔ ایم، اے کے طلبہ کا باہم مقابلہ کیجیے، تو یونیورسٹی کالج کے طلبہ کو آپ زیادہ لائق پائیں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی بڑی تعلیم گاہ ہوگی اور جتنے زیادہ لائق اور بیدار مغز اُستاد ہوں گے اُتنے ہی زیادہ لائق اور روشن دماغ اور بلند خیال شاگرد ہوں گے۔ پس آپ لوگ اگر اپنے کالج کو محمڈن یونیورسٹی کے درجے تک پہونچائیں گے تو یقیناً اور بھی زیادہ عمدہ تعلیم و تربیت آپ کے کالج میں میسر آئے گی اور مسلمانوں کو تعلیمی فائدے اس وقت کے مقابلے میں بہت زیادہ پہونچیں گے۔

کرنے سے احتراز کیجیے، ورنہ قوت تقسیم ہوجائے گی۔ ہر شخص کو چاہیے کہ درمے، قدمے، سخنے اسی کالج کو مدد دے، تاکہ یہ بڑا کام جو آپ نے ہاتھ میں لیا ہے، انجام پا جائے۔ ورنہ چھوٹا مدرسہ چلے گا نہ بڑا کالج، دونوں بے ثبات ہوکر نیست و نابود ہوجائیں گے۔ فرض کیجیے کہ آفتاب کے بہت سے ٹکڑے کرکے تمام آسمان مری پر پھیلا دیے جائیں تو کیا اُس کا یہ جاہ و جلال باقی رہے گا، اور پھر کیا وہ اپنی روشنی و تمازت سے حیوانات و نباتات کو وہی فائدہ پہونچا سکے گا جو اس وقت پہونچا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر سو مدرسے ایسے ہوں جو ناکافی تعلیم دیتے ہوں، اُن کے مقابل میں ایک کالج اچھا جو کامل تعلیم دے سکے۔

جب سرسید نے یہ کالج قائم کرنا چاہا تھا تو اُن کے مددگاروں کی رائے یہ تھی کہ کالج کی عمارتوں میں زیادہ روپیہ نہ لگایا جائے، بلکہ وہ تعلیم کی دوسری اغراض کے لیے محفوظ رکھا جائے، مگر واہ رے سرسید! صرف وہی شخص تھا جس نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کالج کی عمارتیں کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پر شاندار اور وسیع بنوائیں اور کالج کو بہت بڑا مرکز تعلیم بنا کر ایک زبردست دارالعلوم بنا دیا جو تمام ملک میں مشہور ہوکر ہندوستان کے ہر حصے سے طالب علم کھینچ لایا۔ حسن اتفاق سے سرسید کا اپنے مشیروں کی رائے سے اختلاف کرنا، مسلمانوں کے حق میں ایسا ہی رحمت کا باعث ہوا، جیسا جنگ پلاسی کے وقت جنرل کلائیو نے اپنی کونسل کی رائے پر عمل کیا ہوتا اور پلاسی کی لڑائی نہ لڑی ہوتی تو بنگالہ فتح نہ ہوا ہوتا اور سلطنت انگلشیہ کی بنیاد نہ پڑی ہوتی۔ اسی طرح اگر سرسید نے عام رائے سے اتفاق کیا ہوتا تو اس وقت یقیناً

خدمت میں اسلام کے نام سے اپیل کرتا ہوں جس کا حامی و مددگار سرسید تھا
اور جس کی شان و شوکت زمانۂ سابق میں بے نظیر تھی۔ آپ مسلمانوں سے اُمید
ہے کہ علوم و فنون کی اشاعت اور حکمت و فلسفہ کی سرپرستی میں وہی ذوقِ علمی
ظاہر کریں گے جو زمانہ متوسط میں خلفائے عباسیہ و بنی اُمیہ کے عہد میں
عروجِ اسلام کا باعث ہوا تھا۔ میں تمام ہندو صاحبوں اور آریا بھائیوں
کی خدمت میں یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کارِ نیک میں اُسی مستعدی اور
فیاضی کے ساتھ شریک ہوں، جو آپ کے آبائے اجداد اور برگزیدہ اسلاف کا
مشہور طریقہ تھا۔ آپ لوگوں میں دیش اوپکار یعنی رفاہ ملکی اعلیٰ درجے کا عمدہ کام
سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا اچھا کام ہو سکتا ہے کہ آپ کچھ کر کر مسلمانوں
کو بے شمار تعلیمی فائدے پہونچائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ملک کی فلاح و
بہبود کریں گے۔ آخر میں ہر قوم و ملّت اور ہر طبقہ و جماعت کی طرف سے میں
آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ اس وقت، بلا خیال مذہب و قوم کے،
نہایت سچے دل سے اُس حبیب وطن کی زندہ یادگار بنانے میں شریک ہوجیے۔

صاحبان والا شان! یہ کہنا غلط اور سراسر غلط ہے کہ سر سید صرف مسلمانوں کے بہی خواہ تھے اور قوموں سے اُن کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سر سید کی تقریریں جو وائسرائے کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ پر اور البرٹ بل کے پُر آشوب زمانے میں ہوئی ہیں، ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شخص تمام ہندوستان کا وکیل ہو کر گفتگو کرتا تھا۔ ہمارے صوبے میں وہ پہلا شخص تھا جو ہندوستان میں پارلیمنٹ ہونے کی ضرورت انگریزوں پر ظاہر کرتا تھا۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم چند مسائل پر اختلاف رائے تھا تو سر سید یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا کر وہ اختلاف دور کر دیں تاکہ مسلمان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ملک کے خیر خواہ بنیں اور ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر فرقہ آج کل ملکی اور قومی ترقی کو مدنظر رکھتا ہے، لہذا آزادی کے سبب کوئی فرقہ ایک طریق کو اور کوئی گروہ دوسرے اصول کو باعث عروج سمجھتا ہے۔ بہرحال نیک نیتی سے مختلف راہیں اختیار کرنے میں مآل وہی ہے کہ ایک منزلِ مقصود پر پہونچیں۔

صاحبو! مجھے احتمال ہے کہ مبادا میری گفتگو نے طول کھینچا ہو اور یہ بھی خیال ہے کہ ہنوز عملی کارروائی چندے کی ہونا باقی ہے، لہذا میں آپ کو اب زیادہ منتظر نہ رکھوں گا اور بالآخر میں آپ لوگوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ ایسے کار خیر میں شریک ہو کر داخل حسنات ہوجیے اور اُس فدائے قوم کے مانند جنہوں نے قومی ہمدردی کا سبق آپ کو پڑھایا ہے، اس وقت فیاضی اور دریا دلی سے کام لے کر نام نیک بلکہ ثواب دارین حاصل کیجیے۔ میں آپ کی

مگر میرے دل میں دونوں فرقوں کے لیے ایک سی جگہ ہے اور میں دونوں کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو دونوں جماعتوں کا نمایندہ سمجھتا ہوں اور مجکو یہاں دونوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہے۔ میں اوّل ہندؤوں کی نمایندگی کے طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ یہاں (ہمارے شہر میں) ہنود کی اکثریت ہے اور وہ کسی دوسرے گروہ کی معاونت کے محتاج نہیں، مگر بایںہمہ وہ تنہا بغیر اپنے پڑوسی کی شرکت کے، کوئی کام کرنا نہیں چاہتے اور مسلم بھائیوں کو اپنا برابر کا شریک، بلکہ شریک غالب بنانا چاہتے ہیں۔ ہندؤوں کی محبت و مروت، جو مسلم بھائیوں کے ساتھ ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے۔ اگلے زمانے کو چھوڑیے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں ہندو، مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوکر "اللہ اکبر" کے نعرے لگا چکے ہیں، جو کہ خالص اسلامی نعرہ ہے۔ مہاتما گاندھی اس ایجی ٹیشن کے قائد اعظم تھے۔ ہندؤوں کی یہ رواداری اور مواسات و غمخواری اس بات کا کھُلا ہوا ثبوت ہے کہ ان کا دل کس قدر کشادہ، حوصلہ کتنا بلند اور ظرف کس درجہ عالی ہے۔

اب میں مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہوے کہتا ہوں کہ مسلم بھائی بھی ہندؤوں کی اس یگانگت و ہمدردی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ شکر گزار قوم ہیں، حق پسند ہیں، ان کی رگ رگ میں محمدؐ عربی کے اخلاق کی روح دوڑ رہی ہے، وہ معاشرت و تمدن میں اپنے نبیؐ برحق کی ہدایات کا قدم قدم پر لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ نبیؐ برحق، جس کی بزم میں یہود، نصاریٰ اور بت پرست سبھی آتے تھے اور

ہندو مسلم اتحاد

بماہ ستمبر ۱۹۲۷ء، ایک جلسۂ عام میں، جو ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے منعقد ہوا تھا، مشران صاحب نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:-

جناب صدر و حضرات انجمن!

آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کے جلسۂ عام میں، جو کہ ٹاؤن ہال میں اس غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ہندو مسلم اختلاف کی زہریلی ہوا سے فرخ آباد کو محفوظ رکھا جائے اور یہاں مزید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، چار اشخاص کو عملی اقدامات کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، جن میں خاکسار بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں جو جلوس نکلتے ہیں، اُن میں بجائے ایک فرقے کے، دونوں فرقے برابر کا حصہ لیں اور اس طرح یکجہت و یکدل ہو کر جلوس اٹھائیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہو سکے کہ یہ ہندوؤں کا جلوس ہے یا مسلمانوں کا۔

فی الحال رام لیلا کا جلوس نکلنے والا ہے۔ اس موقع پر ہم کو ایسی یگانگت کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے کہ معمولی انتظامات جو پولیس کیا کرتی ہے، اُن کے علاوہ حکام کو کسی قسم کی مداخلت کی گنجایش باقی نہ رہے اور وہ بھی ہمارے مہذب و متمدن قوم ہونے کا اعتراف کر لیں۔

بھائیو! گو کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان نہیں ہوں،

اب سے پندرہ سال قبل محرم الحرام اور رام لیلا ایک ہی وقت میں پڑے تھے اور اتفاق سے امام حسینؑ کے سیوم اور بھرت ملاپ کا دن ایک تھا۔ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے جذباتِ غم کا احترام کرکے، اپنی طرف سے بغیر کسی تحریک کے مسلمان لیڈروں کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اول ہم آپ کے یہاں، امام کے تیجے میں شریک ہوں گے، بعد ازاں بھرت ملاپ کی رسم ادا کریں گے۔ یہ ہے یہاں کے ہندوؤں کی رواداری۔ اب مسلمانوں کی کیفیت سنیے۔ محرم کے دس دن، سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں سوگ اور ماتمداری ہوتی ہے اور اُن کے گھروں میں، بلکہ دلوں میں بھی، خوشی کے اسباب و لوازم کا گزر نہیں ہوتا، مگر بھرت ملاپ کے مراسم میں علی العموم مسلمانوں نے شرکت کی اور جان و دل سے حصّہ لیا۔ یہ بات تو ہمارے شہر میں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے کہ یہاں کے ہندو، محرم میں جابجا سبیلیں رکھتے ہیں اور شربت پلاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ہولی وغیرہ میں ہندو احباب کی تواضع عطر، الائچی اور سگریٹ وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہ باہمی سلوک، یہاں عام ہے کسی خاص طبقے سے خصوصیت نہیں رکھتا ـــــ میں اس موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں کو نیز ہندوؤں کو شاہ افغانستان کا ایک قول، جو میں نے اخبار میں پڑھا ہے، سُنانا چاہتا ہوں، جس کو سُن کر آپ بہت خوش ہوں گے۔ شاہ موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندو مسلم، میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں"

حضرات! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے ضلع کے اور تمام ہندوستان کے

مسلمانوں کے شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے تھے۔ اپنے پرائے کا امتیاز بالکل نہ تھا، بلکہ بسا اوقات حضرت محمدؐ ان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنی عبائے مبارک کا فرش بچھا دیتے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر رواداری کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ، جھوٹ موٹ کسی ذاتی مفاد کی غرض سے، آنحضرت کی بزم میں آکر شریک ہوتے تھے اور دھوکا دینے کے لیے مسلمان بن گئے تھے، جن کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے اور پورا سورۂ منافقون انہی کے بارے میں موجود ہے، رسول صلعم ان کو جانتے اور پہچانتے تھے، مگر آپ نے صرف اپنی وسعت اخلاق سے مرتے دم تک اپنے صحابہ کو ان لوگوں کے نام و نشان سے آگاہ نہیں کیا۔ میں آج کل سیرتِ نبوی پڑھ رہا ہوں، جو سر ولیم میور نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ اس میں جا بجا رسول مقبولؐ کے اخلاق کا ذکر ہے، جس کو پڑھ کر، میں بہت خوش ہوا۔ اُن کی مروّت، غمخواری، ہمدردی اور فیاضی فقط دوستوں کے ساتھ نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ اُن کی طبیعت میں بہت پُرشور جذبات تھے، مگر نفس کشی سے وہ اپنے غصّے کو ایسا فرو کرتے تھے کہ یہ جذبات اوپر کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے پاتے تھے۔ پس ایسے خلیق نبیؐ کی امت سے سوائے خوش خلقی اور رواداری کے کبھی ہرگز کسی دوسرے سلوک کی امید نہیں کی جا سکتی۔

ہندو مسلم، ہر دو فریق کی رواداری کے جو مظاہرے، ہمارے فرخ آباد میں ہوتے رہتے ہیں، ان پر نظر کر کے ہم کو اس وسوسۂ باطل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہاں کسی قسم کی کشمکش، کبھی پیدا ہوگی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ

جھگڑے آپس میں ہو گئے ہیں یا خدانخواستہ آیندہ ہوں، وہاں کے لوگوں کو مصالحت کی طرف آنا چاہیے اور مصالحت کے وقت ایک گُر یاد رکھنا چاہیے کہ دائمی اور پائدار صُلح اُسی وقت ہوتی ہے، جبکہ متخاصمین کو مساوات کے حقوق مِل جائیں۔ پس اگر کسی فرقے کے لیڈر، اپنی اکثریت کی بنا پر، مساوات کے حقوق دوسرے فرقے کو نہ دیں تو یہ اُن کی نادانی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مِل جُل کر رہنا نہیں چاہتے۔ مساوات بہترین چیز ہے۔ اگر ایک فریق نے اکثریت کے زعم میں دباکر صلح کرنا چاہی تو اوّل تو یہ صلح ہونا ہی ناممکن ہے اور اگر کسی مصلحت یا مجبوری سے دوسرے فریق نے دب کر صلح کرلی تو وہ دیرپا نہیں ہوگی اور بات بات پر ٹوٹتی رہے گی اور دونوں فریق میں محبت کبھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ یاد رکھیے کہ محبت کا اصول ہی برابری ہے۔ ایک بہت بڑا ہے اور دوسرا بہت چھوٹا، تو ان دونوں میں دلی محبت نہیں ہو سکتی۔ سچی اور مستقل محبت اُنھی دو شخصوں یا گروہوں میں ہو سکتی ہے جو باہم برابری رکھتے ہوں یا اُن دونوں میں یہ بات قرار پا جائے کہ ہم ہمیشہ برابری کا برتاؤ کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ اگر آپ اس اصول کو ملحوظ رکھیں گے، تو کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔

ہندو اور مسلمان، شاہ ممدوح کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اُن کی توقعات سے زیادہ ثابت کر دکھائیں گے اور جو قوت درپردہ اختلاف پیدا کرنے کی حامی ہے، اُس پر واضح کر دیں گے کہ ہندوستان، ایک جسم ہے اور ہم اس کی داہنی، بائیں، آنکھیں ہیں۔ ہم میں کسی قسم کا اختلاف ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔

صاحبان ذیشان! اس وقت چونکہ اختلاف کا منحوس لفظ میری زبان پر آگیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی چند کلمات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ دو پڑوسیوں میں اختلاف کبھی نہیں ہوسکتا، البتہ اُس صورت میں کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں خودغرضی کو دخل دے۔ پڑوسیوں کا تو کیا ذکر ہے، اس خودغرضی کی وجہ سے تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ پس یہ اختلافات جو فرقہ وارانہ، جا بجا ہوتے رہتے ہیں اسی قسم کی خودغرضیوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن کی ہوس میں، دنیا کے حریص و طماع اپنے سگے بھائی کی خونریزی میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی بیچ ہی ڈالیں جو یوسفؑ سا برادر پائیں

غرض اس بحث سے یہ ہے کہ ان نزاعات و فسادات کا باعث، مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی صاحب، ہندو یا مسلمان، بتائیں کہ ان دونوں میں سے کسی کا مذہب یا دھرم یہ حکم دیتا ہے کہ تم کسی وقت اور کسی حال میں بھی، بنی نوع انسان کا خون بہاؤ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دفاع کے لیے ہر مذہب نے اجازت دی ہے اور اس میں جو خون بہہ جائے، وہ روا بھی ہوتا ہے، مگر خود سے بہیمانہ طور پر حملہ کر دینے کو کوئی مذہب گوارا نہیں کرتا۔ بہرصورت جہاں جہاں، اس قسم کے

درخواست کی تو مجھے بہت تامل ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے میں موزوں نہیں ہوں ؎

نہ ہر کس سزاوار باشد بصدر صدارت بجاہ است و منزلِ بقدر

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور بزم مشاعرہ میں نثار ی معمول کے خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن میرے دوستوں نے اصرار کیا اور فرمایا کہ تمھاری نثر میں نظم بھی ہوتی ہے اور شعر و سخن کے موضوع پر بھی تم ضرور کچھ کہو تاکہ شعرا کو دلچسپی ہو اور صحبت مشاعرہ بکار آمد ہو۔ مجھ کو بجز منظور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا بفحوائے "المامور معذور" آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں کمیٹی کی طرف سے آپ سب مہمانان عظیم الشان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تشریف آوری سے ہم کو فخر حاصل ہوا ہے۔ جو صاحبان غیر اضلاع سے تشریف لائے ہیں وہ ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کی شان کے لائق آسائش و مہمانداری کا انتظام کرنے سے قاصر رہے ہیں، اس کی ایک وجہ تو ضیق وقت ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو لوگ زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ اتفاق سے اس وقت اپنے مشاغل کو چھوڑ نہ سکے۔ تاہم ہم نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع آپ سب مہمانان ذیشان کی خدمت گزاری کر سکیں اور ہم کو پوری اُمید ہے کہ حالات موجودہ پر نظر کر کے آپ سب حضرات ہماری فروگزاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔

شعر و شاعری کی عظمت

اب میں دوستوں کی فرمائش کی تعمیل میں شعر و سخن کا ذکر کروں گا۔ واضح ہو کہ زمانۂ قدیم سے اب تک

حاضرینِ مشاعرہ کا خیر مقدم

آدابِ شاعری اور حالاتِ شعراء

۲۸ر اپریل سنہ ۲۳ء کو ایک بزمِ مشاعرہ بمقام مدرسہ مفتی صاحب قرار دی گئی تھی۔ جس میں چند اضلاع کے شعراء شریک ہوئے تھے اور میر مجلس ایک رئیس بینا پوری تھے۔ مشران صاحب کو استقبالیہ کمیٹی کی صدارت تفویض کی گئی تھی اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے موضوع پر بھی کچھ بیان ایسا کیا جائے جو شعراء کے لیے کارآمد اور اُن کی دلچسپی کا باعث ہو۔ موصوف نے احباب کے اصرار پر انکار مناسب نہ سمجھا اور حاضرین کا خیر مقدم کرنے کے بعد آدابِ شاعری اور حالاتِ شعراء بیان کیے اور شعرائے ہند و عجم کے کلام کی مخصوص خوبیاں پیش کیں۔ خطبۂ صدارت درج ذیل ہے۔ یہ تقریر ایک گھنٹے سے کچھ زائد عرصے میں ختم ہوئی تھی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بحیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی، آپ سب حضرات کی سپاس گزاری کروں، جنھوں نے اپنے قدوم سے اس بزمِ سخن کو زیب و زینت بخشی ہے۔ مجھ سے میرے دوستوں نے جب صدارت کی

نام و نشان بھی مٹ گیا ۔

عجم میں بھی یہی حال تھا ۔ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو کہی ۔ سب جانتے ہیں کہ محمود کس سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا ۔ اُس نے منادی کرادی تھی کہ ہجو جس کسی کے یہاں نکلے گی وہ سزا پائے گا ۔ لیکن ہجو کے اشعار بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گئے تھے ۔ نو سو برس سے اس وقت تک جس قدر نسخے شاہنامے کے دنیا میں شائع ہوے ہجو سے کوئی خالی نہیں ۔ گویا ہجو شاہنامے کا جزوِ لاینفک ہوگئی ہے اور ہمیشہ رہے گی، بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا　　بماند ہجا تا قیامت بجا

ہندوستان میں بھی شعرا کی بڑی وقعت تھی اور ہے ۔ سیکڑوں شاعروں نے لاکھوں روپیے انعام میں پائے ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ خسرو دہلوی نے فیل بار سونا انعام میں پایا ۔ ایک مرتبہ محمد تغلق کے دربار میں مولانا جمال الدین پایۂ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پڑھا، جس کا مطلع یہ تھا ؎

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاناں را　　محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

بادشاہ نے سُن کر کہا کہ بس مولانا میری مجال نہیں ہے کہ ایک شعر سے زیادہ کا صلہ میں دے سکوں ۔ یہ کہکر خزانچی کو حکم دیا کہ روپیوں کی تھیلیاں شاعر کے گرد و پیش لگادی جائیں، یہاں تک کہ شاعر کے سر تک پہونچ جائیں ۔ چنانچہ اُسی وقت تھیلیاں گرد و پیش لگادی گئیں ۔ جب شاعر کے سر تک پہونچیں مولانا کھڑے ہوگئے ۔ یہ ادا بادشاہ کو بہت پسند آئی حکم دیا کہ شاعر کو کھڑا رہنے دو اور تھیلیاں اُس کے سر تک لگادو ۔ غرضکہ ایک ہی شعر کے صلے میں شاعر

شعر کی عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے ۔ عرب میں یہ حالت تھی کہ شاعر کسی قبیلے میں پیدا ہوتا تھا تو جا بجا سے سفارتیں آتی تھیں جو اُس کو مبارکباد دیتی تھیں اور تمام خاندان میں بڑی خوشی منائی جاتی تھی اور تمام قبیلہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اُس قبیلے کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں اور خوشی کے جلسے ہوا کرتے تھے ۔ شاعر کا اقتدار ایسا بڑھا ہوا تھا کہ جس کو چاہتا تعریف کر کے آسمان کا تارہ بنا دیتا اور جس کو چاہتا ہجو کے ذریعے عرش سے فرش پر گرا دیتا ؎

یکے را زمہ اندر آرد بچاہ　　　　دگر را ز چہ بر فرازد بماہ

ایک شخص گمنام تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں تھیں جن کو بر نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک شاعر اُس کے یہاں آکر مہمان ہوا ۔ جب شراب کا دَور چلا ، تو شاعر نے میزبان کے اہل و عیال کا حال پوچھا ۔ اُس نے کہا کہ میری تین بیٹیاں ہیں اور جوان ہو گئی ہیں ۔ کہیں سے اب تک شادی کا پیام نہیں آیا ہے ۔ شاعر بولا خاطر جمع رہو ، میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے ۔ جب عکاظ کے میلے کے دن آئے تو اُس شاعر نے مجمع عام میں ایک قصیدہ پڑھا ، جس میں اُس میزبان کے خاندان کی تعریف تھی ۔ قصیدہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اُس کے میزبان کے گرداگرد لوگ جمع ہو گئے اور تینوں لڑکیاں معزز خاندانوں میں پہونچ گئیں ۔

ایک شاعر کو کسی معزز قبیلے سے رنج پہونچا ۔ اُس نے اُس کے آباؤ اجداد کی ہجو کی ۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُس قبیلے کی ذلت اس قدر بڑھی کہ وہ نہایت گمنام ہو گیا اور اوج کمال سے پستی زوال میں گرا ۔ یہاں تک کہ

کہ شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی کا نام ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مصور مادی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچ سکتا ہے ۔ اس بنا پر جب کسی چیز کا بیان اس طور پر کیا جائے کہ ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ ارسطو کی اس تصنیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشیق نے جو بہت بڑا فلسفی گزرا ہے اُس کا خلاصہ کیا۔ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اس لیے شاعری کی نسبت جو خیالات ارسطو کے تھے وہ مسلمانوں میں پھیل نہ سکے ۔

ادب کی کتابوں میں جو تعریفِ شعر کی گئی ہے وہی خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہے ۔ یعنی یہ کہ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی جملہ کہے جو اتفاق سے بطور نظم بھی کہا جا سکے تو اُس پر مصرع کا اطلاق نہ ہوگا اور وہ شعر کا جزو نہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً کوئی کہے کہ " ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے " یہ موزوں بھی ہو سکتا ہے۔ تین الفاظ آرسی، کیا، ہے، اگر بڑھا کر پڑھے جائیں تو پورا مصرع موزوں ہو جائے گا۔ اگر گھٹا کر پڑھے جائیں تو نثر ہے۔ مگر یہ عامیانہ تعریف ہے ۔ شاعری صرف وزن اور قافیے کا نام نہیں ہے ۔

ایران کے شاعروں کے نزدیک شاعری دراصل تخیل کا نام تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے جو بہت بڑا شاعر گزرا اپنی کتاب چہار مقالہ میں شاعری کی تعریف جو لکھی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ کسی مضمون کو

تین پشت تک مالدار ہوگیا - جب فتح علی شاہ قاچار والی ایران نے روس کے مقابلے میں فتح پائی تو قاآنی نے قصیدہ تہنیت کا پیش کیا - قاآنی اُس وقت دربار کا ملک الشعراء تھا اور ختم الشعراء اُس کا لقب تھا - جب پڑھتے پڑھتے اس شعر پر پہونچا ؎

آں قدر نصرانیاں راکشت در روزِ نبرد   عیسی دوراں بہ گردوں دست پیغمبر گرفت

تو بادشاہ نے فقط اس ایک شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا - یہی حال ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ والیان بیجاپور کی قدردانی کا تھا کہ ملا نورالدین ظہوری کی اس قدر قدر و منزلت کی کہ اُس نے کبھی دربار مغلیہ کی طرف رخ نہیں کیا - عرفی کو دیکھیے کہ اُس نے ابوالفتح گیلانی اور خانخاناں کے سوا امرائے دربار میں سے کسی کی آستاں بوسی نہیں کی - ان دونوں قدردانان شعروسخن کے دربار دُربار سے عُرفی عمر بھر فیض پاتا رہا - سلاطین مغلیہ کے وقت میں ایران کے بڑے شعراء اپنا وطن مالوف چھوڑ کے ہندوستان کھنچے ہوے چلے آئے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ حاجت قرار دیا اور سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے رہے -

صاحبو! میں نے شعروشاعری کی عظمت اور قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی - اب میں شعر کی حقیقت مختصراً عرض کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں، وہ بیان کروں گا -

شعر کی ماہیت اور حقیقت

اس موضوع پر سب سے پہلے ارسطو نے کتاب لکھی، جس کا نام بوطیقا ہے - وہ کہتا ہے

کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی اُس کی زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ اس بنیاد پر شاعری کی منطقی تعریف یہ ہوگی کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے انسانی جذبات بھڑک اُٹھیں اور اُس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود ہی اپنا مخاطب ہو تو اُس کا نام شاعری ہے۔

مل صاحب نے اگرچہ بہت باریک بات کہی ہے لیکن شاعری کا دائرہ اُس سے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا کہ مل صاحب کرنا چاہتے ہیں، نہ اس قدر وسیع ہے جیسا کہ ایشیا کے عالموں نے کیا ہے۔ شعر کی اصلی حقیقت یہ ہے جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ وہ ایک قسم کی مصوّری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصوّر صرف مادّی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات اور جذبات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس چیز کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ مثلاً دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزے کی لہک، پھولوں کی مہک، شبنم کی جھلک، ہوا کے جھونکے، دھوپ کی حدت، گرمی کی شدّت، جاڑے کی فسردگی، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، خوشی، غصہ، محبت، افسوس، حسرت، ان چیزوں کا بیان اس طرح کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یہی شاعری ہے۔

شاعری کی تعریف اور ایک طرح بھی کی جا سکتی ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں خواہ وہ مادّی ہوں جیسے پہاڑ، دریا، جنگل، باغ وغیرہ یا وہ

خیال میں ایسا ترتیب دیا جائے کہ اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت ہوجائے، جس سے محبت اور غصے کی طاقتیں بھڑک اُٹھیں۔ یہ تو ایشیا کے پُرانے قول اور خیالات شعر اور شاعری کی نسبت تھے۔ یورپ والوں نے بہت باریک بحثیں کی ہیں۔ اور عجیب وغریب نکتے پیدا کیے ہیں۔

جان اسٹوارٹ مِل نے ایک مطول مضمون لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے انسانی جذبات کو کچھ تعلق نہیں۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی سوال حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا خوشی یا رنج پیدا نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی کی مصیبت و تکلیف کا حال درد بھرے لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس سے ہم پر اثر ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کو جذبات یا احساسات کہتے ہیں اور جو چیز ان کو بھڑکاتی ہے اُس کا نام شاعری ہے۔ اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر اور وعظ وغیرہ بھی بعض لوگوں کے نزدیک شاعری میں داخل ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسانی جذبات کو بھڑکاتی ہیں۔ لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں یعنی تصویر وغیرہ شاعری کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کام کرتا ہے اُس کی غرض کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر اثر ڈالے، جیسے بذریعہ لکچر اسپیچ وغیرہ کے۔ کبھی وہ رنج یا خوشی کے موقع پر خود اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، مثلاً کسی شخص کا بیٹا مرجائے تو جو بھی الفاظ، زبان سے نکلیں گے اُن سے یہ غرض نہ ہوگی کہ وہ کس شخص یا جماعت سے خطاب کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ فرض کیا جائے کہ وہاں

اصلی عناصر دو ہیں - محاکات اور تخئیل - باقی سلاست اور بندش اور عمدہ ترکیبیں اور صنائع بدائع زیب و زینت اور نقش و نگار کا کام دیتے ہیں - انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے خوشی، رنج، غصہ، آرزو، تعجب، فخر وغیرہ اُن کا ادا کرنا یا مناظر قدرت مثلاً باغ، جنگل، پہاڑ، بہار، خزاں، صبح، شام، ان کی تصویر کھینچنا شاعری کے اصلی عناصر ہیں -

محاکات کی تعریف یہ ہے کہ شاعر کسی چیز کا بیان ایسا کرے کہ جو اثر اُس کی طبیعت میں ہو، وہی دوسروں کی طبیعت میں پیدا کر دے یا یہ کہ اُس چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے - تخئیل اُس قوت کو کہتے ہیں جس سے ایجاد و اختراع کا کام لیا جائے یا کوئی مسئلہ فلسفے کا حل کیا جائے - یا اگر کوئی شئے ہمارے عالمِ خیال میں ہو اُس کو ہماری نظر کے سامنے لے آئے - یہی قوت تخئیل شاعری میں مضامین بلند پیدا کرتی ہے - محاکات کا دوسرا نام مرقع نگاری ہے - مثنوی لکھنے میں مرقع نگاری سے کام زیادہ لیا جاتا ہے، کیونکہ اُس میں مسلسل واقعات کا بیان ہوتا ہے اور استعارہ اور صنائع بدائع محاکات میں خلل انداز ہوتے ہیں - بخلاف غزل یا قصیدے کے کہ اُس کا ہر شعر جدا جدا مضمون رکھتا ہے اور استعارہ یا صنائع بدائع کے استعمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے - فردوسی نے شاہنامے میں اعلیٰ درجے کی مرقع نگاری کی ہے - وہ واقعات کا بیان نہایت سادہ کرتا ہے اور استعارے کے پاس کبھی نہیں پھٹکتا - بخلاف اس کے نظامی نے مثنوی (سکندرنامہ) میں مرصع نگاری سے زیادہ کام لیا تو واقعات کی تصویر کھینچنے سے قاصر رہے ہیں - ایک مثال کے

غیر مادی ہوں مثلاً تعریف، نفرت، محبت، غصہ، امید، نا امیدی، رنج، خوشی۔ ان سب کا دل پر اثر پڑتا ہے، لیکن یہ اثر کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ بعض پر کم بعض پر زیادہ۔ پس جو شخص ان قدرتی چیزوں اور کیفیتوں سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اثر قبول کرے اور اپنے الفاظ سے دوسروں پر بھی زیادہ اثر ڈال سکے، وہی شاعر ہے۔ مولوی حمیدالدین نے فن بلاغت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں شعر کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ شاعر کے لفظی معنی ہیں صاحب شعور۔ شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں جس کو انگریزی میں فیلنگ کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ ہے جس کا احساس تیز ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی رہتی ہیں جیسے رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا وغیرہ۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ انگڑائی کے وقت بدن تن جاتا ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ ان خیالات سے سامعین کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا اور معلوم ہوا ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تو شعر کی تعریف عرض کی گئی اب شعر کے اجزا اور عناصر کا حال سُنیے۔

شعر کے دو اجزا ہیں۔ مادّہ اور صورت۔ مادّے سے غرض ہے مضمون۔ یعنی کیا کیا بیان کیا جائے۔ صورت سے غرض یہ ہے کہ طرز ادا کیا ہو۔ شاعری کے

تہمتن بہ بند کمر بُرد چنگ گزیں کرد یک چوبہ تیرِ خدنگ
خدنگے برآورد پیکاں چو آب نہادہ برو چار پرِّ عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست بہ چرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچی بخاست

ان اشعار کی خوبی بیان کی محتاج نہیں ۔فطرت کے قاعدے سے جو واقعات یکے بعد دیگرے ہونا چاہیے ، اُسی طرح اُن کا بیان کیا گیا ہے ۔یعنی پہلے رستم کمر کی طرف ہاتھ لے گیا کہ ترکش سے تیر نکالے ۔پھر اُس نے ترکش میں ہاتھ ڈال کر تیر کا انتخاب کیا کہ حسب موقع تیر نکالوں ۔اُس کے بعد تیر چُن کر نکالا ۔کیونکہ تیر کی بھی اقسام ہوتی ہیں ۔ اب شاعر کا فرض تھا کہ دکھائے کہ وہ تیر کس شکل کا تھا۔ بتاتا ہے کہ اُس کی نوک نہایت تیز اور آبدار تھی اور سوفار میں چار پر عقاب لگے ہوئے تھے ۔ پھر کمان ہاتھ میں لی ۔اُس کے بعد شست باندھی ۔کمان کھینچنے اور شست باندھنے میں جو مخصوص حالت ہوتی ہے یعنی یہ کہ بایاں ہاتھ سیدھا کیا جاتا ہے اور داہنے ہاتھ کو خم کیا جاتا ہے ، بعینہ وہی تصویر چوتھے شعر میں کھینچ دی۔ کمان تنومند آدمی کھینچتا ہے تو کمان چرچراتی ہے ۔ یہ سب جزئیات بیان کیے گئے ہیں جن سے واقعہ نظر کے سامنے آگیا ہے ۔ چوتھا شعر محاسن شعری کے لحاظ سے لاجواب ہے ۔چپ و راست ،ستوں کردن ، چرخ چاچی ، یہ الفاظ اور اصطلاحات اور اس پر بندش کی چستی اور صفائی ، یہ خوبیاں مذاق سلیم رکھنے والے سمجھتے ہیں۔ آج تک کسی شاعر نے تیر کھینچنے کی مخصوص حالت اس حسن و خوبی سے بیان

ذریعہ کمند اندازی کا واقعہ دونوں شاعروں کا دکھاتا ہوں۔ نظامی فرماتے ہیں ؎

کمند عدو بند را شہریار بینداخت چوں چنبر روزگار

کمند کے ساتھ 'عدو بند'، کے الفاظ بہت خوب ہیں۔ بندش چست ہوگئی۔ 'چنبر روزگار' بھی خوب استعارہ ہے۔ لیکن غور کیجیے قباحت یہ ہوگئی کہ سننے والے کی توجہ 'کمند عدو بند'، اور 'چنبر روزگار'، کی طرف زیادہ تر مصروف رہی، کمند پھینکنے کا واقعہ نظر سے بالکل چھپ گیا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کمند پھینکنے کا نتیجہ کیا ہوا۔ کوئی اس میں پھنسا یا نہیں۔ بخلاف اِس کے، فردوسی جو رزم کا دھنی ہے کہتا ہے ؎

چو از دست رستم رہا شد کمند سرِ شہریار اندر آمد بہ بند

ز پیل اندر آورد و زد بر زمیں بہ بستند بازوئے خاقان چیں

فردوسی نے چار مصرع کہے ہیں اور ہر مصرع میں ایک مضمون علٰحدہ ہے جو اُس مصرع میں پورا پورا ادا ہوگیا۔ پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ رستم نے کمند پھینکی۔ دوسرے میں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کا سر پھنس گیا۔ تیسرے میں بتاتا ہے کہ جھٹکا دے کر ہاتھی سے اُس کو نیچے گرا لیا۔ اور چوتھے میں کہتا ہے کہ پھر مُشکیں کس لیں۔ ہر مصرع میں ایک واقعہ پورا بیان کر دیا۔ اس کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات کی تدریجی رفتار دکھا دی۔ پہلے کمند ڈالی گئی۔ اُس کے بعد گردن پھنسی۔ اُس کے بعد ہاتھی سے نیچے گرایا گیا۔ آخر میں مُشکیں کسی گئیں۔ اگر اس سلسلے اور ترتیب میں فرق آتا تو اُسی قدر مرقع نگاری کا معیار گھٹ جاتا۔ اسی طرح تیر اندازی کا واقعہ بیان کرنے میں فردوسی نے جو مرقع نگاری کی ہے وہ لاجواب ہے۔ کوئی شاعر نہ کر سکا۔ کہتا ہے ؎

شاعر جن یا دیو کی تعریف میں کہتا ہے ؎

دانت اُس کے بھتے گورکن قضا کے　　دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے

زنبور سیاہ خال اُس کے　　برگد کی جٹائیں بال اُس کے

اگر کوئی اچھا مصوّر دیو یا جن کی تصویر کھینچنے میں اُس کے دانت اور بال اور خال ایسے ہی دکھائے جیسے کہ الفاظ کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں تو یقیناً اُس تصویر کو دیکھ کر ہم زیادہ حظ اُٹھائیں گے ۔ یا شاعر کہتا ہے ع

شتر لب غول منظر خوک دنداں خرس پیشانی

اگر مصوّر لب اور دانت اور پیشانی اسی طرح دکھا دے جیسی بذریعہ الفاظ بیان کی گئی ہے تو یقیناً زیادہ لطف آئے گا ۔ لیکن بیشتر گوناگوں ، واقعات ، واردات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جن کو دکھانے سے مصوّر قاصر ہے اور شاعر ہی بذریعہ الفاظ دکھا سکتا ہے اور اُن کا بیان کرنے میں پورا کامیاب ہو سکتا ہے ۔ مثلاً نظامی کہتا ہے ؎

نسب نامۂ دولتِ کیقباد　　ورق بر ورق ہر سوے برد باد

شاعر کو یہ دکھانا منظور ہے کہ دارا کے مرنے سے تمام خاندان کیانی کا خاتمہ ہو گیا اور نسل کیانی برباد ہو گئی اور اُس کا شیرازہ بکھر گیا ۔ شاعر عالم خیال میں یہ بات دیکھ رہا ہے اور دکھانا چاہتا ہے ۔ اس عالم خیال کی تصویر مصوّر کی طاقت سے باہر ہے ۔

صاحبو! میں شعراے عجم و عرب کے کلام سے مثالیں لا رہا ہوں ۔ مجھے چاہیے کہ فردوسی ہند حضرت انیسؔ کے کلام بلاغت نظام سے مرقع نگاری اور محاکات کی

نہیں کی۔ صرف مصرع اول میں تصویر کھینچی ہے اور دوسرے مصرع میں دوسرا واقعہ جو مصرع اول کا نتیجہ ہے بیان کر دیا ہے۔ یعنی کمان کا چرچرانا۔ فردوسی نے تیر مارنے کے اس قدر جزئیات بیان کیے کہ نو شعر کے بعد کہا کہ دشمن تیر کھا کر ہلاک ہوا۔ دوسرا کوئی شاعر اس واقعے کو لکھتا تو ایک یا دو شعر میں ختم کر دیتا۔ کیونکہ وہ جزئیات میں نہیں جا سکتا تھا۔ جزئیات میں جانا قادر الکلامی پر دلیل ہے۔ انہی اشعار میں دو شعر اور آپ کے سننے کے قابل ہیں ؎

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس | سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ | ملک گفت احسن فلک گفت زہ

جب ہم شکار کھیلنے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ اکثر دوست احباب اور نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں اور اِدھر اُدھر گاؤں کے لڑکے شکار کھانے یا سیر و تفریح کی غرض سے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ جب ہمارے نشانے سے شکار گرتا ہے تو دوست اپنی شایستہ زبان میں داد دیتے ہیں کہ واہ کیا نشانہ لگا ہے۔ سبحان اللہ، واہ واہ، کیا کہنا! لیکن دیہاتی دوسری طرح داد دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مارا، وہ گرا، جانے نہ پائے، بھاگنے نہ پائے، پکڑو وغیرہ۔ شاعر نے دونوں طرح کی داد تیر انداز کی بیان کی ہے۔ یعنی آسمان نے اُس کے ہاتھ چوم لیے، پھر آسمان اور فرشتوں نے احسنت و مرحبا کہا۔ لیکن قضا نے کہا کہ پکڑو جانے نہ پائے۔

مصوّر مادّی چیزوں کی تصویر خوب دکھا سکتا ہے بلکہ بعض جذبات کو بھی بذریعہ تصویر نظر کے سامنے لا سکتا ہے، مثلاً ہنسی، خوشی، غم، رونا، تعجب، مایوسی، غصّہ، دیوانگی وغیرہ اور شاعر کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

لب خرس کے، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

اور وہ ہمارے سامنے یا ہمارے پاس آکر بیٹھ جائے تو طبیعت کو نہایت کراہت ہوگی اور اُس کا بیٹھنا ہم کو نہایت ناگوار ہوگا۔ لیکن اگر اُسی کی تصویر ہو بہو کھینچ کر کوئی ہمارے پاس لے آئے تو ہم اُس کو دیکھ کر نہایت پسند کریں گے اور مصور کی صنعت کی نہایت تعریف کریں گے۔ اسی طرح شعر میں بذریعہ محاکات و مرقع نگاری جس چیز کا منظر دکھایا گیا ہے اُسے ہم پسند کریں گے، چاہے وہ ناگوار یا خوشگوار چیز کا ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ شعر اگر اچھا ہو تو ضرور وہ ایک مؤثر چیز ہے۔ جس طرح شعر بوجہ محاکات کے پسند ہے اسی طرح شعر بوجہ موسیقیت کے بالطبع پسند ہے۔ یعنی شعر میں جتنا زیادہ جزو موسیقی کا ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ موثر اور دل پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ موسیقی بجائے خود بہت دل پسند اور موثر چیز ہے۔

مصور بذریعہ تصویر زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجودیکہ کبھی کبھی تصویر کا ہر جزو نمایاں نہیں کرتا مگر اپنے الفاظ سے اُس سے زیادہ اثر پیدا کرتا ہے جو خود اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ آپ جنگل میں جاتے ہیں سبزے پر اوس پڑی ہوئی دیکھتے ہیں اُس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے شعر کے ذریعے آپ پر ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا — ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ زمرد را بمروارید بستہ

زمرد سے مراد سبزہ اور گوہر سے مراد شبنم کے قطرے، اوس جو سبزے پر پڑی ہے،

مثالیں عرض کروں ۔کہتے ہیں :۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب ودانہ بند   دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند   چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو، شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا مُنہ سوار کا

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت عباسؑ علمبردار نہر فرات سے پانی لینے گئے ہیں ۔چونکہ اہل بیتؑ کئی روز سے پیاسے تھے، گھوڑا بھی دو روز سے پیاسا ہے۔ اُنھوں نے اپنی مشک پانی سے بھرلی ہے تاکہ پانی لاکر اہل بیتؑ کو دیں ۔ خود پانی نہیں پیتے ہیں اور نہ گھوڑے کو پلاتے ہیں ۔گھوڑے نے حالتِ تشنگی میں نہر کو دیکھا تو اپنی فطرت کے مطابق ہنہنانے لگا۔ وہ اپنے شہسوار کے ارادے سے واقف ہے کہ مجھے وہ پانی نہ پینے دے گا ۔گھوڑا عربی النسل مالک کا اطاعت شعار و وفادار ہے ۔لیکن ایک طرف تو اُس کو پیاس بے چین کر رہی ہے دوسری طرف آقا اُس کو روک رہا ہے تو اُس بیچارے بے زبان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ بار بار کانپتا ہے اور اُس کا بند بند سمٹ رہا ہے ۔ پیاس کی حالت میں جو حالت گھوڑوں پر طاری ہوتی ہے، اُس کا فطری منظر دکھایا ہے ۔

واضح ہو کہ محاکات یا مرقع نگاری بجائے خود ایک لطف انگیز چیز ہے ۔یعنی کسی چیز کا بیان ایسا کرنا کہ وہ نظر کے سامنے آجائے یا اُس کی تصویر بذریعہ قلم کے کھینچ دی جائے، یہ فطرۃً انسان کو مرغوب ہے ۔ چاہے وہ چیز اچھی ہو یا بُری ہو ۔ ایک حبشی یا زنگی جو مردم آزار بلکہ مردم خوار ہو اور جس کا حال یہ ہو کہ ۔ع

تمازتِ آفتاب کے چہروں پر عباؤں کا ڈال لینا، گرمی اور پیاس سے گھوڑوں کا زبان نکال دینا، یہ سب معمولی واقعات ہیں جو گرم ملک کے سفر میں کم و بیش پیش آتے ہیں۔ رزم کا سماں ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی تھیں نوکیں وہ تیز تھیں کہ دلوں میں کھٹکتی تھیں
نیزے تُلے ہوئے تھے سنانیں چمکتی تھیں ترکش کھلے ہوئے تھے کمانیں کڑکتی تھیں
پیکانیں تھیں کہ پھول تھے وہ بے کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

میدان جنگ کا سماں اس بند میں دکھایا ہے۔ برچھیوں کا لچکنا، اُن کی اَنی کا تیز ہونا اور چمکنا، نیزہ بازوں کا اپنے نیزے تولنا، ترکشوں کا کھلا ہونا اور کمانوں کا کڑکنا، پیکانوں کا پھول کی کلیوں کی طرح دکھائی دینا اور کمانوں کے چلّوں کا کانوں تک کھنچا ہوا دکھائی دینا، یہ سب میدان جنگ کے آلات حرب و ضرب اور واردات و واقعات ہیں۔ دوسرے شعر میں اور نیز ٹیپ میں صنائع لفظی بھی دلکش ہیں۔ پھر اسی شعر میں دُہرے دُہرے قافیے اور الفاظ دونوں مصرعوں کے ہموزن ہیں۔ نیزے، ترکش، تُلے ہوئے تھے، کھلے ہوئے تھے۔ سنانیں، کمانیں، چمکتی، کڑکتی۔ یہ الفاظ دونوں مصرعوں کے صنعت ترصیع ظاہر کر رہے ہیں اور ٹیپ میں پیکاں کی تشبیہ غنچے کے ساتھ پُر لطف ہے۔

صاحبو! مرقع نگاری اور مرصع نگاری کا موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک بات آپ کی دلچسپی کے لیے اور عرض کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے وہ ایشیائی نظم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس میں خوشیتن داری اور سیلف ہیلپ

شاعر کہتا ہے کہ موتی اور زمرد ایک ہی لڑی میں ٹکے ہوے ہیں ۔

اسی طرح آپ باغ میں جاکر گلاب کے پھول دیکھتے ہیں اور کانٹے بھی اور سبزہ بھی ۔ یہ خوشنما چیزیں آپ کی نظر کو خوش کرتی ہیں۔ لیکن شاعر اپنے شعر سے آپ کے دل میں ایک نیا خیال پیدا کرتا ہے ۔ چنانچہ شمیم امروہوی شاعر دربار ریاست رامپور کہتے ہیں ؎

کانٹے بھی تر زباں ہیں شگوفہ نیا یہ ہے ۔۔۔ سبزے کے حسن میں بھی نمک سے مزا یہ ہے

اسی طرح شاعر عالم خیال میں ایک منظر دکھاتا ہے جو مصوّر بذریعہ تصویر دکھانے سے قاصر ہے ۔ کہتا ہے ؎

مثل آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو ۔۔۔ صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آپ کی ضیافت طبع کے لیے دو تین بند حضرت انیسؔ کے اور عرض کروں۔ جن میں مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور مرصع نگاری کی بھی جھلک ہے ۔ گرمی کا سماں دکھاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت ۔۔۔ پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوے پسینے میں تھے غازیوں کے رخت ۔۔۔ سونلا گئے تھے رنگ جوانان نیک بخت

راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے تھے
توسنے ہوے سمند زبانیں نکالے تھے

اس بند میں وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو گرمی کا سماں دکھانے کے واسطے ضروری تھے ۔ یعنی پہاڑی راستے پر چلنے سے جو مسافروں کو تکلیف ہوا کرتی ہے ۔ پانی اور سایے کا نہ ہونا اور سواروں کا پسینے میں تر ہونا ، اُن کے رنگ سونلا جانا ، بوجہ

بچہ ہے آدمی کی مدد کا طالب ہے لیکن جس وقت سے کہ وہ نوجوان ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا - بچپن میں وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم اُس کو پانی دیں - مٹی بھی اُس کے لیے اچھی اور کافی ہونی چاہیے - دھوپ کی بھی اُس کو ضرورت ہے - ہَوا بھی کافی اُس کو لگنا چاہیے - یعنی یہ کہ اُس کے گرد اگرد جھاڑیاں اور درخت نہ ہوں کہ دھوپ اور ہَوا کو روکیں لیکن نوجوان ہونے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی جہانی اور خوراک کا کرلیتا ہے - پانی زمین سے جذب کرتا ہے - اُس کی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں - ہَوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے - اس کے سوا اُس کی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے - جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینھ اور ماگھ پوس کی سردی اور برف اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اُس میں میوہ لگتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے - لوگ اُس سے پھل پھول ، چھال ، لکڑی ، پتے لیتے ہیں - دوست اور دشمن دونوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی اور عمارت کی لکڑی ہم کو دیتا ہے اور زندگی اور مَوت دونوں حالتوں میں فائدہ پہونچانے اور فیاضی کرنے میں عذر نہیں کرتا ، پس ایک درخت سے زیادہ خویشتن داری، سیلف ہیلپ ، سیلف ریسپکٹ اور "اپنی مدد آپ کرو" کا احساس اورکس میں پایا جاسکتا ہے اور نہ ایسی ہمت ، استقلال ، تواضع ، فیاضی اور رفاہ عام کسی میں ہوسکتا ہے - اب میں آپ کی خدمت میں توارد ، سرقہ ، ترجمہ ، استنباط کے موضوع پر

اور آزادی کے مضامین نہیں ہیں۔ وہ واقف نہیں ہیں کہ فقط گلستاں اور بوستاں میں خودداری اور آزادہ روی کے کتنے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح اور شعرا کے یہاں بھی بے شمار مضامین ہیں۔ مثلاً ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر بہ از دست بر سینہ پیش امیر

گر راست سخن باشی و در بند بمانی بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

دو نان از دست دو نانِ جہاں باشد سناں خوردن
سناں در سینہ خوردن بہ کہ از دو نان دو ناں خوردن

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست
دگر نہ راعی خلق ست زہر مارش باد کہ ہر چہ می خورد از جزیۂ مسلمانی ست

اسی طرح ہزاروں موقعوں پر شریفانہ اور آزادانہ مضامین کی بھرمار ہے لیکن میں صرف دو شعر نظامی کے سناؤں گا اور انگریزی خواں بھائیوں کو مخاطب کرکے عرض کروں گا کہ مختصر مضمون خویشتن داری اور سیلف ہیلپ کا اس سے بہتر سنائیں جو کسی انگریزی کتاب میں اُنھوں نے پڑھا ہو ؎

بہ جانی خویش تا روز مرگ درختے شو از خویشتن ساز برگ

معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی روزی خود محنت کے ساتھ حاصل کرنے میں درخت بن جائے اور معاش حاصل کرنے میں کسی کا احسانمند اور محتاج نہ بنے۔ جیسے درخت اپنی ہی قوت و ہمت سے پرورش پاتا ہے۔ کسی آدمی کی مدد کا محتاج نہیں رہتا ہے۔ یہی طریق انسان کو اختیار کرنا چاہیے۔ درخت جب تک

اس کا ترجمہ میر افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے زبان اُردو میں بہت خوبی کے ساتھ کیا ہے اور مطلع کا مطلع رکھا ہے ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے
کہ چھن کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

گو یہ ترجمہ بہت اچھا ہے لیکن ناز کا لفظ ترجمہ میں نہیں آیا جو شعر کی جان ہے۔ اگر فارسی شعر سے ناز کا لفظ نکال ڈالا جائے تو پھر کچھ خوبی نہیں رہتی۔ تاہم مترجم قابل تعریف ہے۔

ان کے سوا چوتھی شکل اور ہے۔جس کو کتابوں میں تو سرقۂ مستحسن لکھا ہے۔ لیکن عالموں اور شاعروں نے زمانۂ حال میں اُس کو استنباط کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شاعر پہلے شاعر کے مضمون کو پورا یا تھوڑا دانستہ لے لے۔ لیکن اُس مضمون کو بلند کر دے۔یعنی اُس میں ترقی یا اضافہ کرے۔جیسے فردوسی کا شعر ؎

یکے خیمۂ داشت افراسیاب   زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جب نظامی کی باری آئی تو اُس نے دیکھا کہ مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعر ثبوت نہ دے سکا۔اُس نے ایک لفظ تبدیل کر کے ثبوت دیا اور یوں کہا ؎

یکے خیمۂ داشت چوں آفتاب   زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین شعر آسمان تک بلند ہو گئی۔ سعدی کہتا ہے ؎

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت   کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا کیا تھا مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب سے یہ کہنا کہ تم یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کو چلے جا

کچھ بیان کروں گا ۔ آج کل نوآموز شاعر اکثر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں شاعر کا مضمون چُرا لیا۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ توارد تو کسی صورت میں بھی قابلِ الزام نہیں ہے۔ علمائے معانی نے توارد کی مثال یہ دی ہے کہ دو راہرو ہیں۔ ایک آگے نکل گیا ہے اور جس طرف جس سڑک پر وہ چل رہا تھا، اُسی طرف اُسی سڑک پر دوسرا راہرو بھی چل رہا ہے۔ لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہے کہ میرے آگے ایک مسافر چلا گیا ہے ۔ ایسی صورت میں اگر پہلے مسافر کے نقشِ قدم پر دوسرے مسافر کا قدم پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے اور کیا الزام اس پر آسکتا ہے۔ اسی طرح اغراض و مقاصد و مطالب متحدہ کے بیان میں توارد ہو سکتا ہے ۔ مثلاً فردوسی نے یوسف زلیخا لکھی ۔ اُس کے بعد جامی نے بھی کئی سَو برس بعد یوسف زلیخا لکھی ۔ تمام روایات و حکایات جو فردوسی نے بیان کیں وہی جامی نے کیں تو کوئی شخص جامی کو سارق اور اُس کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا۔

توارد و سرقہ کے سوا ایک شکل ترجمے کی ہے ۔یعنی شاعر نے دیکھا کہ کسی زبانِ غیر میں کسی شاعر نے نہایت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ۔ اُس کو اُس نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے لے لیا ۔ چاہے وہ اُس میں زیادہ خوبی پیدا نہ کر سکا۔ یہ جائز ہے ۔ کیونکہ اس میں زبان کی ترقی مقصود ہے ۔ شاعر کے واسطے یہ خوبی کی بات ہے کہ وہ اپنی زبان کو ترقی دے اور عمدہ عمدہ مضامین لا کر اُس میں داخل کرے ۔ جیسے ناصر علی کا شعر ہے ؎

برقع برخ افگندہ برو ناز بہ باغش
تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

گوکھلے کا غم

مارچ ۱۹۱۵ء کے شروع میں بمقام سرستی بھون ایک جلسہ ماتمی، مسٹر گوکھلے کے انتقال پُر ملال پر رنج و افسوس ظاہر کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا۔ مسٹران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل ماتمی تقریر کی:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند — نوائے بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان لالہ ایں باغ از کہ می پرسی — برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان، ہر جماعت و گروہ کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے نہایت عزیز ہموطن اور ملک و قوم کے پیشوا مسٹر گوکھلے کی بے وقت وفات حسرت آیات پر اشک ماتم بہائیں، جن کے مرنے کا نہ صرف ہندوستان کے باشندوں کو افسوس ہے، بلکہ برطانیہ نے بھی اپنا مشیر اور خیر اندیش سمجھ کر رنج و غم ظاہر کیا ہے۔ مرحوم کے مرنے سے ہمارا ایک پولیٹیکل رشی اُٹھ گیا اور گورنمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ ہند کا ایک خیر خواہ رکن سلطنت ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔ اس عظیم الشان اور

کس قدر نا زیبا ہے۔ لہذا اُس نے ترقی دے کر شعر کو چمکا دیا ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ نازکشی

مگر کہ زندہ کنی خلق را و بازکشی

استنباط کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک چراغ سے سَو چراغ روشن کر لیے جائیں تو کیا مضائقہ۔ تیل اپنا، بتّی اپنی، چراغ اپنا۔ کسی کے یہاں چراغ جل رہا ہے۔ اُس کی لَو سے چراغ روشن کر لیا تو یہ کیا چوری ہے؟ اگر یہ چوری ہے تو ٹمٹم اور فٹن اور بائیسکل، ریل گاڑی، موٹر وغیرہ سب چوری میں داخل ہیں۔ کیونکہ چھکڑا اور اس کے پہیے تو موجود تھے، اُسی کی نقل تو ہے۔

صاحبان والاشان میں آپ کے شکریے اور خیر مقدم کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ع

کجا بودم اشہب کجا تاختم

لیکن خیال کرتا ہوں کہ آپ کی ضیافت طبع کا سامان بذریعہ اس تقریر کے کچھ ہوا ہو تو عجب نہیں۔
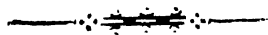
کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے ۔ اُن غریبوں اور بیکسوں کی خاطر صرف محنت و کوشش ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی قسمت کے ساتھ مرحوم نے اپنی تقدیر کو وابستہ کر دیا تھا اور اُن کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں شریک ہو کر اُن کا ساتھ دیتے تھے ۔

ہمارے دوست مرحوم "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" ایسی قائم کر گئے ہیں ، جو اُن کا نام نامی آیندہ نسلوں میں احسانمندی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھے گی ۔ اس کے ممبر بھی اپنے مرشد اور گرو کی طرح زر و مال کو کچھ مال نہیں سمجھتے اور ہمارے ملک و قوم کی خدمت انواع و اقسام طریق پر کر رہے ہیں ۔ عورتوں کو پڑھانا لکھانا ، بیواؤں کی تکلیفیں کم کرنا اور اُن کی حالت درست کرنا ، اچھوت ذاتوں کو اونچی سطح پر لانا ، صفائی اور حفظانِ صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا خیال عام لوگوں میں پھیلانا ، کواپریٹیو سوسائٹی کے ذریعے غریبوں اور بیکسوں کو سود کھانے والوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دینا ، یہ سب اعلیٰ درجے کی بیش بہا خدمات ہیں ، جن سے ہمارا مُلک مستفید ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ فوائد اُس مرحوم کی بدولت ہیں ۔

مسٹر گوکھلے نے سات مرتبہ ولایت کا سفر ہم لوگوں کی خاطر کیا ۔ پہلا سفر ۱۸۹۷ء میں اس غرض سے کیا تھا کہ رایل کمیشن کے روبرو ہندوستان کے ملکی مصارف کے متعلق شہادت دیں ۔ وہاں جاکر ہمارے دوست نے اِس موضوع پر اس کے جزئیات و کلیات کی نسبت ایسی

ہر دلعزیز حبیب وطن کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک طولانی تقریر کی ضرورت ہے۔ جو اس ماتمی جلسے میں زیادہ موزوں نہیں ہوسکتی، لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ جس کا نوحہ یا مرثیہ پڑھا جائے اُس کی خوبیاں کچھ نہ کچھ بیان کی جائیں، اس لیے مختصر طور پر اس بے نظیر محب وطن کے عدیم المثال کارنامے معرض بیان میں لاتا ہوں۔

ہمارے دوست مرحوم جب فرگسن کالج میں پڑھتے تھے، اُس وقت سے اُن کے پروفیسروں کو اُن کی اعلیٰ درجے کی قابلیت کا احساس ہونے لگا تھا اور پیشین گوئی کی جاتی تھی کہ یہ شخص بڑا ہونہار ہوگا۔ پڑھ کر فارغ ہوئے، تو فرگسن کالج ہی میں پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰ سال تک درس و تدریس کی خدمتیں انجام دیں۔ گزارے کے لیے کالج سے صرف پچھتر روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ یہ ایثار کالج میں اب تک یادگار ہے اور آئندہ بھی یادگار رہے گا۔ ۱۸۸۸ء میں جبکہ وہ ۲۲ برس کے سن میں بمبئی پراونشل کانفرنس میں شریک ہوئے تو مسٹر مڈھولکر نے پیشین گوئی کی کہ یہ شخص کسی دن کانگریس کا صدر ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور آپ کانگریس کے صدر ہوکر بے تاج کے بادشاہ کہلائے۔

مسٹر گوکھلے عالم، فاضل، سوشل رفارمر یعنی مصلح اخلاق اور مصلح قوم و ملک تھے اور خاصکر ابتدائی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے پست اقوام کے بہت بڑے مربی اور سرپرست تھے، جن کو اونچی قوم کے ہندو چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھوت ذاتوں کو وہ اونچی سطح پر لاکر اپنے برابر

کام میں ہمہ تن مصروف و مشغول رہا کرتے تھے۔ گویا ان کا عمل اس مقولے پر تھا ؎

وہ محو ہیں کہ ذرا غم نہیں ملال نہیں تِرا خیال ہے اپنا ہمیں خیال نہیں

انگریزی جملہ جو کہا جاتا ہے He died in harness وہ ہمارے دوست پر صادق آتا تھا کہ ہمارا کام کرتے کرتے جان دے دی۔ مرحوم نے زر و دولت کو خاک کی برابر سمجھا اور مثل رومن سینیٹرس (Senators) کے ہمیشہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ افلاس کی زندگی بسر کی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سوشل رفارم (یعنی معاشرتی و تمدنی اصلاح) کو بھی ویسا ہی ضروری سمجھا جیسا کہ اصلاح ملکی کو۔ اُن کا قول تھا۔ 'Institutions are made by men and not men by institutions.'

حضور ویسرائے نے اپنی کونسل میں فرمایا کہ "مسٹر گوکھلے نے صیغۂ مال، صیغۂ تعلیم اور امور انتظامی پر بحث کرنے میں نہایت قابلیت ظاہر کی اور جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسئلے کو، جو ہندوستانیوں سے متعلق تھا، نہایت مدبری اور خوبی سے سُلجھایا، جو بظاہر عقدۂ لاینحل تھا" اور یہ بھی فرمایا کہ "وہ نہ صرف کونسل کے بیش بہا ممبر تھے بلکہ ہمارے دوست بھی تھے" یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسٹر گوکھلے کو جو واقفیت مال کے صیغے سے تھی وہ بیس برس ادھر سے کسی سکریٹری محکمۂ مال یا کسی ممبر صیغۂ مال کو حاصل نہیں ہوئی۔ ہمارے لفٹننٹ گورنر بہادر سر جمیس مسٹن جو پہلے فنانشل سکریٹری گورنمنٹ ہند تھے، وہ مسٹر گوکھلے کو مسٹر گلیڈسٹن سے تشبیہ دیتے تھے۔

واقفیت ظاہر کی کہ لوگ عش عش کر گئے۔ دوسرا سفر ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ جس میں ہندوستان کے متعلق انچاس دن میں اُنھوں نے ۴۵، اسپیچیں دیں۔ تیسرا سفر بنارس کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ چوتھا ۱۹۰۸ء میں اور پھر ۱۲۔۱۳۔۱۴-۱۹۱۱ء میں تین سفر ہوئے۔ ان سب سفروں میں مرحوم نے جو ملکی خدمات انجام دیں اُن کو چھوڑ کر صرف ۱۹۰۸ء کے ایک سفر کو لے لیجیے، کیونکہ اس سفر میں انھوں نے جو کام کیا صرف وہی ایسا ہے جو اُن کی بزرگی و عظمت ملک و قوم کے نزدیک قائم کرنے کے لیے اور یادگار ہونے کے لیے کافی ہے۔ وہ کام یہ ہے کہ آپ نے لارڈ مورلے سے کئی مرتبہ گفتگو کر کے ویسرائے کی کونسل میں توسیع اور اصلاح کرادی جس کی بدولت چھ سات برس سے ہم لوگ کثرت سے کونسلوں میں شریک ہونے کی غرض سے منتخب ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح ابھی حال میں جنوبی افریقہ جاکر وہاں کے وزیروں سے (مثل بوتھا اور اسمٹس وغیرہ کے) مل کر ہندوستانیوں کی تکلیفیں دور کیں اور جو مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اُس پر پانی ڈال دیا۔

مسٹر گوکھلے وہ شخص تھے، جو قوم کے فدائی تھے اور زندگی فقط ملک و قوم کے واسطے بسر کرتے تھے۔ طبیعت میں وہ انکسار تھا کہ سال گزشتہ جب گورنمنٹ نے کے، سی، آئی، ای، کا خطاب دیا، تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارا کام کرنے میں اس قدر محو تھے کہ اپنے کام اور اپنی ذات کی پرواہ اُن کو مطلق نہ تھی۔ وہ صرف ہمارے

دونوں کا معتمد علیہ بن سکتا ہے۔

جب مسٹر گوکھلے کا جنازہ اُٹھا، تو بیس ہزار آدمی ماتم کرنے والے اُس کے ساتھ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں ماتم کیا اور ویسرائے گورنر بمبئی اور حضرت جارج پنجم اور آغا خان کے تار ہمدردی اور رنج وغم کے اظہار میں آئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفتر سب بند ہوگئے۔ الہ آباد میں، جہاں اُن کے پھول جمنا گنگا کے سنگم میں ڈالے گئے، عام طور سے تعطیل ہوگئی۔ پھولوں کے ساتھ جو جلوس تھا، اُس میں بڑے بڑے عمائدین کے دوش بدوش گورنمنٹ کی طرف سے کلکٹر ضلع نے بھی شرکت کی اور الہ آباد میں جو جلسہ ماتمی ہوا اُس میں حکام ہائی کورٹ، کمشنر اور کلکٹر اور تمام نامی گرامی ہندو مسلمان شریک ہوئے۔

لارڈ ہارڈنگ ہی نے اُن کی لیاقتوں اور خوبیوں کی داد نہیں دی بلکہ اُن کی زندگی میں ۱۹۰۸ء میں لارڈ منٹو نے بھی، جب اُن کی تقریر بجٹ پر سنی، تو فرمایا کہ "یہ سب سے اچھی اور ایسی تقریر ہے کہ انگلستان میں بھی بہت کم لوگ ایسی تقریر کر سکتے ہیں"۔ اسی طرح سر ایڈورڈ بیکر نے فرمایا کہ "میری خواہش سب سے بڑی یہ ہے کہ میرے بعد فنانشل ممبر اس کونسل کے مسٹر گوکھلے مقرر ہوں"۔

مسٹر گوکھلے نے ہمیشہ اپنے آپ کو ماتحت کارکن یعنی ایک چھوٹا کام کرنے والا اور اپنے مقابلے میں راناڈے، سر فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی وغیرہ کو ترجیح دی۔ دنیا میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو کوئی بڑوں کو مقدم سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اُن کا چھوٹا اور پیرو خیال کرتا ہے، وہ آخر میں خود بڑا مانا جاتا ہے اور جو دوسروں کا نام قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا نام خود بھی دنیا میں

مسٹر گوکھلے کو گورنمنٹ اور حکام اس وجہ سے زیادہ پسند کرتے تھے کہ اُن میں خود غرضی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ بخلاف اس کے انکسار، سچائی اور معقول پسندی تھی۔ دنیا کے معاملات میں دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خوش تدبیری اور ایمانداری سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سخن پروری اور ضد نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ سمجھوتا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عملی سیاست میں ہر موقع پر برابری اور آزادی کا دعویٰ کرنا اور حقوق انسانی پر لڑنا ٹھیک نہیں ہے، بعض وقت اس اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن   کہ جاہا سپر باید انداختن

یہ سب باتیں مسٹر گوکھلے میں نمایاں طور پر تھیں، جن کے باعث اُن کو سوشل اور پولیٹیکل معاملات میں کامیابی ہوا کرتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں جیسا کہ اب ہے، عامۂ رعایا اور نیز گورنمنٹ کو ایسے شخص کی بڑی ضرورت ہے کہ جس میں مثل مسٹر گوکھلے کے، خوبیاں اور لیاقتیں ہوں، اس لیے اُن کی وفات سے جو نقصان پہونچا وہ ایسا قومی اور ملکی نقصان ہے جو ملک اور قوم کی بدقسمتی پر دلیل قاطع ہے۔ اصل میں مسٹر گوکھلے کے طور وطریق، اُن کی عقلمندی، فرزانگی، خوش تدبیری، سچائی اور ایمانداری اس بات کی روشن مثال ہے کہ مفتوحہ ملک و قوم کا ایک لائق فرزند اپنی قوم و ملک کو پستی مذلت سے اُبھار کر کس طرح بلند سطح پر لا سکتا ہے اور رعایا اور گورنمنٹ

جنگ عظیم پر پہلا لکچر

جنگ عظیم کے اصلی اور ظاہری اسباب اور متحاربین کے باہمی تعلقات قدیم و جدید

(جنوری ۱۹۱۵ء میں مُشران صاحب، گریسی صاحب، بہادر کلکٹر ضلع (فرخ آباد) کی طرف سے جنگ عظیم پر لکچر دینے کے لیے "دار لکچرر" مقرر ہوئے۔ پہلا لکچر ۱۲ر مارچ ۱۹۱۵ء کو بمقام سرستی بھون واقع فرخ آباد زیر صدارت گریسی صاحب موصوف دیا گیا، جو درج ذیل ہے)

یہ عالمگیر لڑائی جو جرمنی، آسٹریا اور ٹرکی بمقابلہ روس، برطانیہ اور فرانس کے لڑ رہے ہیں، مدبرین یورپ کی رائے میں ناگزیر تھی جس کے واقع ہونے کا اندیشہ بیس برس سے تھا۔ جس طرح گھنگھور گھٹا چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو اور بادل گرج رہے ہوں، تو معلوم ہوتا ہے کہ مینھ برسنے والا ہے، اسی طرح یورپ کے بادشاہوں کا اپنی اپنی فوجیں بڑھانا اور لڑائی کا سامان جمع کرنا، بتا رہا تھا کہ یقیناً کسی وقت یورپ میں لڑائی کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جنگ سے دو مہینے پیشتر اُمید کی جاتی تھی کہ لڑائی یکایک نہ ہوگی، کیونکہ بلقان میں جو لڑائی کا گھر تھا، صلح ہو چکی تھی، اور سرایڈورڈ گرے کی یہ کوشش کہ بلقان کے معاملات پر یورپ کے بادشاہوں

قائم اور برقرار رہا کرتا ہے ۔ چنانچہ اسی فلسفیانہ جذبے کے باعث آج مسٹر گوکھلے کے نام کا قلمرو ہند میں ڈنکا بج رہا ہے ۔

مسٹر گوکھلے کی تعریف سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اُنھوں نے پولیٹیکل معاملات میں اعتدال کا خیال زیادہ رکھا ۔ مسٹر تلک نے مسٹر گوکھلے کی وفات کے وقت تک یہ اعتراض کیا کہ وہ Extremists اور Moderates میں اتحاد پیدا نہ کرا سکے اور دونوں کی شرکت سے متحدہ کانگریس وجود میں نہ لا سکے ، لیکن جب جنازہ گھاٹ پر پہونچا ، تو مرحوم کے مخالف مسٹر تلک نے خود Funeral oration دیا اور ہزاروں آدمیوں کو جو وہاں موجود تھے ہدایت کی کہ مرحوم کے طور وطریق اختیار کرو اور اُن پر پورا عمل کرو ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود مسٹر تلک نے بھی مرحوم کا ڈھنگ اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی ۔

صاحبان والا شان ! الہ آباد جیسے متبرک مقام میں ، جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہے ، جہاں اس شہید ملکی کے پھول ڈالے گئے ہیں ، ایک یادگار بنانی چاہیے تاکہ لاکھوں جاتری ، جو وہاں جاتے ہیں ، اس فدائے قوم و ملک کی یادگار کے درشن کیا کریں اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی اُس کی یاد میں نچھاور کیا کریں ۔ ہم سب کو مسٹر گوکھلے کے کارہائے نمایاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ خودغرضی چھوڑ کر ملک کے بھائیوں کی خدمت سچائی اور ایمانداری سے کریں اور جو کچھ مرنے والا کر گیا ہے اُس کو سعی و کوشش سے بحال و برقرار رکھیں ، تاکہ ہمارے کام بھی آیندہ نسلوں کے لیے دنیا میں یادگار رہ جائیں ؎

عمل کن کہ فردا نماند و لیک　　جزائے عمل ماند و نام نیک

آسٹریا نے اپنے مطالبات کی شرطیں، اس غرض سے نہایت سخت رکھی تھیں کہ سردیا اُن کو قبول نہ کرے اور لڑائی چھڑ جائے۔ وہی ہوا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جرمنی مجھ کو مدد دے گا اور روس و برطانیہ اور فرانس ایسی حالت میں ہیں کہ دخل نہ دیں گے۔ برٹش قوم آئرلینڈ کے معاملات سے خانہ جنگی کا اندیشہ کر رہی تھی۔ فرانس خود اقبال کر چکا تھا کہ ہماری فوج لڑائی کے لئے تیار نہیں ہے اور روس میں جہاز بنانے والے کاریگروں کی ایسی ہڑتال ہو رہی تھی کہ اُس سے اندیشہ ہوتا تھا کہ مبادا ملک میں کوئی انقلاب ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ جاپان سے شکست کھانے کے بعد روس پوری طرح سنبھالا بھی نہیں لینے پایا تھا۔ یہ موقع آسٹریا نے غنیمت سمجھا کہ بلقان کے معاملات اپنی دلی خواہش کے مطابق طے کرے اور اپنے ولیعہد کے قتل کو، جس کے باعث تمام یورپ آسٹریا کا ہمدرد بن گیا تھا، لڑائی کی ایک معقول وجہ قرار دے۔

جرمنی پہلے کہہ چکا تھا کہ میں کسی بادشاہ کو آسٹریا کے معاملات میں دخل نہ دینے دوں گا، مگر باوجود اس کے جب ۲۹ر جولائی ۱۹۱۴ء کو روس نے اپنی نوجوں کو جمع کیا، تو جرمنی نے بتاریخ ۳۱ر جولائی روس کو الٹی میٹم بھیجا اور یکم اگست ۱۹۱۴ء کو اشتہار جنگ روس کے مقابلے میں دیدیا۔ اسی طرح جرمنی نے فرانس کو بھی ایک پیام جنگ بھیجا اور جواب کا انتظار نہ کرکے پہلی اگست کو بغیر اعلان جنگ کے، فرانس پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے اس اثنا میں صلح قائم رکھنے کی سخت کوشش کی مگر بیکار گئی۔ البتہ اس کوشش سے

میں لڑائی نہ چھڑ جائے، بظاہر کامیاب ہوگئی تھی لیکن صلح پسند لوگوں کی یہ کوششیں اور اُمیدیں سب بیکار گئیں، جبکہ ۲۸ رجون ۱۹۱۴ء کو آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ، ولیعہد آسٹریا مع اپنی بیگم کے باسنیا (Bosnia) کے دارالسلطنت سیراجیوو (Serajevo) میں قتل کیئے گئے۔ یہ خونِ ناحق بغیر بدلہ لیے کیونکر رہ سکتا تھا، بلکہ پکار پکار کر اپنا خونبہا چاہتا تھا اور زبانِ حال سے یہ کہتا تھا ؎

قریب آتا ہے روز محشر چھپے گا احوال قتل کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر تو خوں پکارے گا آستیں کا

قاتل ایک نوجوان طالب باسنیا کا رہنے والا تھا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قتل ایک سازش کا نتیجہ تھا جو سرویا میں ہو رہی تھی۔ آسٹریا کی گورنمنٹ کو سرویا سے بہت ملال ہوا اور اُس نے ۲۳ رجولائی ۱۹۱۴ء کو ایک الٹی میٹم (تنبیہی پیام جنگ) سرویا کو بھیجا۔ جس میں چند مطالبات کیے، جو اس قسم کے تھے کہ سرویا میں جو سازشیں آسٹریا کے خلاف ہوا کرتی ہیں، وہ بند کی جائیں اور سازش کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں (وغیرہ) اور تمام مطالبات کی تعمیل چند گھنٹوں کے اندر بلا عذر و حیلہ چاہی اور کوئی موقع غور اور مشورے وغیرہ کا سرویا کو نہیں دیا۔ یہ مطالبات ایسے تھے کہ کوئی معزز اور خوددار قوم ان کو گوارا نہ کرے گی۔ سرویا نے اکثر شرطیں منظور کیں لیکن بعض کے منظور کرنے سے انکار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا نے ۲۸ رجولائی ۱۹۱۴ء کو سرویا کے مقابل میں اعلان جنگ کر دیا۔ اصل میں

(۶) برطانیہ نے کیوں فرانس کے ساتھ دوستی کی؟
(۷) برطانیہ نے کیوں بلجیم پر حملہ کرنے کو لڑائی کی وجہ قرار دیا؟
ان سب کا جواب مختصر دینے کے لئے، ضرور ہے کہ ان سب ملکوں کے تاریخی حالات، اس جنگ عظیم سے پہلے کے، بیان کیے جائیں۔
۳۰۰ء میں سلطنت روما کی حدود یورپ میں دریائے رائن (Rhine) اور دریائے ڈینیوب (Danube) تھیں۔ دریائے رائن کے پورب اور دریائے ڈینیوب کے اُتر میں، جرمن یا ٹیوٹانک (Teutonic) — فرقے کثرت سے بسے ہوئے تھے۔ جن میں سے بعض فرقے سلطنت روما سے لڑتے رہتے تھے۔ اُن جرمن فرقوں کے پورب میں، اُس نسل کے لوگ رہتے تھے جن کو ہم آج کل سلاؤ یا سلوانک (Slav or Salvonic) — کہتے ہیں۔ پس جرمن دونوں فریق یعنی رومن اور سلاؤ کے درمیان جگہ گھیرے ہوئے تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں ان جرمن فرقوں نے سلطنت روما کے مغربی حصے میں اُس کی حکومت اور تہذیب کو برباد کر دیا۔ جب جرمن پچھم کی طرف بڑھنے لگے، بعض سلاؤ فرقوں نے جرمن کے چھوڑے ہوئے مقامات پر وسط یورپ میں قبضہ کر لیا۔ یہ سلاؤ فرقے جنوبی مشرقی حصہ یورپ میں بھی آئے اور جزیرہ نمائے بلقان کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ یورپ کی تاریخ اگر نسلوں کے اعتبار سے، پچھلے بارہ سو برس کی، دیکھی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیٹن فرقے (Romanised Celts) جرمن کو پیچھے ہٹاتے گئے

یہ نتیجہ ہوا کہ اٹلی لڑائی میں شامل نہ ہوا اور ہر فریق سے علیحدہ رہا۔ برطانیہ کی دوستی فرانس سے تھی اور جب جرمنی نے دھمکی دی اور قانون بین الاقوام کی پابندی سے منھ موڑا، تو برطانیہ کو بلجیم کے بارے میں اندیشہ ہوا۔ تب برطانیہ نے فرانس اور جرمنی سے پوچھا کہ بلجیم کی غیر جانبداری اور عدم شرکت قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ فرانس نے جواب دیا کہ ہاں، مگر جرمنی نے ٹال دیا اور یہ کہا کہ اس سوال کا جواب دینے میں ہمارا بھید کھلتا ہے۔ بلجیم چونکہ جرمنی کے مقابلے کی تاب نہ رکھتا تھا، اُس نے اپنے آپ کو بچانے کے واسطے برطانیہ سے مدد کی درخواست کی اور یہی مناسب بھی تھا سہ

بلا سے امن اگر چاہے کوئی پیدا حمایت کر
ہوا گُل کر نہیں سکتی چراغِ زیرِ دامن کو

برطانیہ، جو ہمیشہ سے انصاف اور آزادی کا حامی اور وعدے کا سچا رہا ہے، مدد پر تیار ہوگیا اور اُس نے جرمنی کو الٹی میٹم بھیجا اور ۴ راگست کو لڑائی کا اعلان کر دیا اور اُسی دن یعنی ۴ راگست کو جرمن فوج بلجیم میں داخل ہوگئی، گو بلجیم دوہائی دیتا رہا ـــــ اب ہر شخص کے دل میں یہ سوالات پیدا ہوں گے کہ :-

(۱) آسٹریا نے جو سرویا پر حملہ کیا اُس کے اصلی اور صحیح سبب کیا ہیں؟
(۲) روس نے سرویا کو کیوں مدد دی ؟
(۳) جرمنی نے کیوں دخل دیا اور آسٹریا کو مدد کیوں دی ؟
(۴) فرانس کیوں روس کا شریک ہوا ؟
(۵) اٹلی لڑائی سے کیوں الگ رہا ؟

کہلاتا ہے اسی پُرانے لوٹرنگین کا پہلے ایک چھوٹا حصہ تھا۔پس یہ کہنا چاہیے
کہ ایک ہزار سال گذشتہ سے جو لڑائیاں، ان دونوں بیرونی سلطنتوں یعنی
جرمن اور فرانس میں ہورہی ہیں، وہ اسی غرض سے ہورہی ہیں کہ اس
درمیانی حصے کے مقامات فتح کریں اور خصوصاً لوٹرنگین پر قبضہ حاصل کرلیں۔
زمانہ متوسط میں فرانس اتفاق کے باعث رفتہ رفتہ زیادہ طاقتور ہوگیا
اور جرمنی کئی وجہوں سے اتفاق نہ رکھ سکا اور کمزور ہوگیا۔پھر جرمنی کچھ عرصے
کے لئے جیت گیا اور اُس نے کل درمیانی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔لیکن فرانس
نے اپنی حکومت بڑھاتے بڑھاتے اس درمیانی سلطنت میں جس قدر فرنچ
بولنے والی قومیں تھیں، سب کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا اور جرمنی سے
اٹلی نکل گیا۔جرمنی زمانہ متوسط کی پہلی صدیوں میں پورب کی طرف بڑھا اور
سلاؤ فرقوں کو اُس نے فتح کرلیا۔آسٹریا اور برانڈین بُرگ (Brandenburg)—
جس کو اس وقت پرشا (Prussia) کہتے ہیں اور زمانہ حال کی سلطنت
سیکسنی (Saxony) یہ سب اُسی سرزمین میں تھے جو جرمنی نے سلاؤ
فرقوں سے چھین لی اور اب جرمنی حکومت اور دباؤ بالٹک سمندر کے کنارے
فن لینڈ تک پھیل گیا۔جب پولینڈ اور بوہیمیا (Bohemia) کی
سلاؤ سلطنتوں نے زور پکڑا تو پورب کی طرف جرمنی کا بڑھنا رُک گیا، لیکن
سلاؤ قوم کو دوسری طرف نقصان پہونچا۔کیونکہ وسط ایشیا کی ایک قوم ماڈیار
(Magyar) یا ہنگیرین (Hungarian) نے نکل کر اُن کو
فتح کرلیا اور وسط یورپ کے میدانی حصوں پر قریب ۹۰۰ء کے قابض ہوگئے

اور جرمن فرقے سلاؤ فرقوں کو وسط یورپ میں فتح کرتے گئے۔ اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُسی پُرانی لڑائی نے اب اس موجودہ جنگ عظیم کی شکل اختیار کر لی ہے، جس میں لیٹن اور سلوانک (Latin and Slavonic) فرقے اپنے یکساں دشمن، یعنی جرمن کے مقابلے میں لڑ رہے ہیں اور برطانیہ اعظم جس کو نصف ٹیوٹانک یعنی Semi-Teutonic طاقت کہنا چاہیئے کئی وجہ سے جو بیان کی جائیں گی، جرمن کے دوستوں سے لڑ رہا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں شارلمین بادشاہ فرینکس (Franks) — نے مغربی یورپ کے اکثر حصّوں کو جو سلطنت روما میں شامل تھے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ سلطنت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی اور ۸۴۳ء میں اس کے تین حصے ہو گئے۔ ایک حصّہ، جو فرانس کہلایا، شارلمین کے ایک پوتے کو ملا اور دوسرا حصّہ دریائے رائن کے پورب کی طرف، جس کو ہم جرمنی کہہ سکتے ہیں، دوسرے پوتے نے پایا۔ اور تیسرا حصہ درمیانی، جو دریائے جرمن سے میڈی ٹرینین (Mediterranean) —— تک چلا گیا ہے اور اسے لاسپیل اور روما کو شامل ہے سب سے بڑے پوتے کے حصے میں آیا۔ پہلا اور تیسرا حصّہ تو ہمجنس تھا۔ لیکن درمیانی حصہ کچھ جنسیت نہ رکھتا تھا۔ یہ درمیانی سلطنت، تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اٹلی، برگنڈی اور لوٹرنگین (Lothringen) جو اپنے حاکم لوتھر (Lothar) کے نام سے موسوم ہوا جو مقام لورین (Lorraine)

ترکوں کے قبضے سے بچا ہوا تھا، یہ سب اُن کے قبضے میں آگئے۔ فرانس اٹلی پر قابض نہ رہ سکا اور لامبرڈی (Lombardy) پر خاندان ہیپسبرگ کا قبضہ ہوگیا، جو ساڑھے تین سو برس تک قائم رہا۔ چارلس پنجم جو خاندان ہیپسبرگ میں سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے، چارلس دی بولڈ (Charles the Bold) ڈیوک آو برگنڈی (Duke of Burgundy)— کا پرپوتا تھا اور اس کو نیدرلینڈز (Netherlands) ورثے میں ملا اور جو پُرانی لڑائی ڈیوکس آو برگنڈی (Dukes of Burgundy)— اور شاہان فرانس میں چلی آتی تھی، وہ بھی گویا اُس کی وراثت میں آئی۔ ۱۵۵۶ء میں جب چارلس پنجم تخت سے دست بردار ہوا تو اس خاندان کے جرمنی علاقے اُس کے بھائی فرڈی نینڈ (Ferdinand) کو ملے اور اُن کے ساتھ شہنشاہ کا خطاب بھی۔ باقی سلطنت اس کے بیٹے فلپ دوم شاہ اسپین کے قبضے میں آئی، لیکن اس خاندان ہیپسبرگ کی دونوں شاخیں ملی جُلی رہیں اور فرانس اور اسپین میں جو لڑائیاں سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہوئیں وہ اصل میں اُسی پُرانی دشمنی کا پہلو لیے ہوئے تھیں، جو فرانس اور جرمنی میں چلی آتی تھی۔

یہاں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ملکۂ الیزبیتھ (Elizabeth) کے وقت میں انگلستان اور اسپین کے باہم، جو سخت لڑائیاں ہوئیں اُن کا سبب یہی تھا کہ اسپین کے قبضے میں نیدرلینڈز تھا۔ جس کو زمانۂ حال میں ہالینڈ اور بلجیم کہتے ہیں۔ انگلستان نیدرلینڈز سے بہت کچھ واسطہ رکھتا تھا۔ اور خاص کر

جزیرہ نمائے بلقان میں کچھ مدت کے بعد دو سلاؤ سلطنتوں کی بنیاد پڑ گئی، یعنی سرویا اور بلغاریہ کی۔ ان دونوں سلطنتوں نے مع روس کے قسطنطنیہ کے کے ذریعہ مذہب عیسوی اختیار کیا۔ گریک چرچ، یعنی یونانی طریقہ مذہب کے پابند ہوئے اور رومن چرچ یعنی رومیوں کے طریق مذہب کے پیرو نہ بنے۔ ان میں سے کبھی ایک نے، کبھی دوسرے نے، سلطنت روما کے پوربی حصے کو دبایا لیکن جس طرح اس وقت ایک دوسرے کے دشمن ہیں، اسی طرح اُس وقت بھی اُن کے باہم نااتفاقی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکوں نے چودھویں صدی میں اُن کو فتح کر لیا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد ترکوں نے اُتر کی طرف قدم بڑھایا۔ اور سولھویں صدی میں ہنگری کا بہت سا حصہ فتح کر کے اکثر سلاؤ فرقوں کو اپنی رعایا بنا لیا۔

زمانہ حال میں، یورپ میں فرانس اور جرمنی کی دشمنی نے کچھ دوسرا پہلو اختیار کیا ہے۔ آٹھویں چارلس بادشاہ فرانس نے ۱۴۹۴ء میں اٹلی پر حملہ کیا۔ یہ ایسی مہم تھی کہ جس نے فرانس کو اسپین سے لڑا دیا جو اس وقت سسلی پر قابض تھا۔ اٹلی پر حملہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور سلطنت ہیپسبرگ (Hapsburg)، کے باہم ڈھائی سو برس لڑائی چھڑی رہی۔ آسٹریا کے آرچ ڈیوک، کچھ مدت تک جرمنی، یا یوں کہنا چاہیئے کہ سلطنت روما کے شہنشاہ منتخب ہوتے رہے اور پھر اُن کی شادیاں ایسے شاہی خاندانوں میں ہوئیں کہ ان تعلقات سے نیدرلینڈز (Netherlands) نیپلس (Naples)— بوہیمیا (Bohemia) اور وہ حصہ ہنگری کا جو

وہ درمیانی سلطنت، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اُس کا کچھ اور حصہ حاصل کرلیا۔ بعض مقامات تو فرینچ زبان بولنے والے تھے، باقی سب خصوصًا الساس (Alsace) خالص جرمنی تھے۔ چودھویں لوئی نے سترھویں صدی کے نصف آخر میں بہت مضبوط ارادہ کرلیا تھا کہ جو حدود قدیم گال کی تھیں وہی نئی سلطنت فرانس کی حدود قائم کرے اور اغلبًا دریائے رائن کو فرانس کی سرحد قرار دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا، بشرطیکہ ولیم آف آرینج اور برطانیہ نے اُس کو روکا نہ ہوتا۔ چودھویں لوئی کو اس کوشش میں ناکامی ہوئی اور اسپین کی تخت نشینی کی جنگ جو پیش آئی، اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین کے جو جو علاقے اٹلی میں تھے، اور نیز نیدرلینڈز، یہ سب اسپین سے نکل کر آسٹریا کے قبضے میں چلے گئے۔ اُس وقت اسپین کا یورین بادشاہ تھا جو اُسی چودھویں لوئی کا پوتا تھا۔ اسی تاریخ سے آسٹریا کا اقتدار اٹلی میں کامل طور پر ہو گیا اور بلجیم کی طرف سے جس کو اب آسٹرین نیدرلینڈز (Austrian Netherlands) کہنا چاہیے، کچھ عرصے کے لئے برطانیہ کو اطمینان ہو گیا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں آسٹریا نے ترکوں کو ہنگری سے باہر نکال کر، دریائے ڈینیوب کے پار اُن کو ہٹا دیا۔ ایک طرف ان نئی فتوحات کے ذریعہ اور دوسری طرف اٹھارھویں صدی کے آخر میں پولینڈ (Poland) کے تقسیم ہونے سے، جو حصہ آسٹریا میں شامل ہوا، ان دونوں وجہوں سے سلاو یا سلوانک نسل کی رعایا کا بہت بڑا حصہ آسٹریا کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اس وقت پرشا کی طاقت کو فروغ ہوا اور فریڈرک اعظم کے عہد میں

فلینڈرز (Flanders) سے، جو بندر اینٹ ورپ (Antwerp) کو شامل ہے۔ تجارت کی غرض سے انگلستان اور فلینڈرز کے بڑے بڑے شہروں میں ہمیشہ دوستی رہتی تھی۔ چودھویں صدی میں تیسرے ایڈورڈ نے، فرانس کے خلاف Flemish شہروں سے دوستی کے عہد نامے لیے اور پندرھویں صدی کے آخر میں، چوتھے ایڈورڈ نے چارلس دی بولڈ کو جس کے قبضے میں فلینڈرز تھا، گیارھویں لوئی شہنشاہ فرانس کے مقابلے میں مدد دی۔ نپولین بونا پارٹ کا قول تھا کہ اگر کسی بحری طاقت رکھنے والے بادشاہ کے قبضے میں اینٹ ورپ ہو تو گویا انگلستان کے سر پر ایک بھرا پستول ہے۔ اس لیے ضرور تھا کہ جب برطانیہ اور اسپین میں جنگ ہو، تو برطانیہ یہ پسند کرے کہ نیدرلینڈز میں بغاوت ہو اور ڈچ قوم کو آزادی حاصل کرنے میں مدد دے۔ یہی عمل انگلستان کی طرف سے ہوا تھا۔ تب ہی اسپین کے Invincible Armada — نے انگلستان پر حملہ کیا تھا۔

جب اسپین کی قوت گھٹ گئی تو برطانیہ نے بھی اپنی پالیسی بدل دی۔ اس وقت فرانس کی طاقت ایسی بڑھ گئی تھی کہ خطرناک ہو گیا تھا پس برطانیہ اور فرانس کے باہم جو سخت لڑائیاں سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے آخر میں ہوئیں، وہ زیادہ تر اسی غرض سے ہوئی تھیں کہ نیدرلینڈز فرانس کے قبضے میں نہ آجائے۔

سولھویں اور سترھویں صدیوں میں فرانس نے باوجودیکہ وہ رومن کیتھولک تھا، پراٹسٹینٹ مذہب کا طرفدار ہو کر جرمنی کی مذہبی لڑائیوں میں دخل دیا اور

حمایت میں ڈھائی سو سے زیادہ چھوٹی چھوٹی جرمن ریاستیں نیست و نابود ہوگئیں۔ اس طرح کہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کو ملا کر ایک بڑی سلطنت بنا دی گئی۔ جو شہر آزادی کے حقوق رکھتے تھے وہ بڑی ریاستوں سے ملحق کر دیے گئے اور جن ریاستوں کا تعلق مذہبی جماعتوں سے تھا، وہ اُن سے نکال کر عامہ رعایا سے متعلق کر دی گئیں اور آس پاس کے صوبوں میں شامل کر دی گئیں۔ یہ کام جو نپولین نے کیا تھا اُس کو وی اینا کانگریس نے بلا تغیر ولیا ہی رہنے دیا اور اِس مجموعی طاقت نے جب زور پکڑا تو متحد سلطنت جرمنی قائم ہوگئی۔

سلطنت نیدرلینڈز کے متعلق وی اینا کانگریس نے جو انتظام کیا تھا، وہ اچھی طرح چل نہ سکا اور ۱۸۳۰ء میں اہل بلجیم نے بغاوت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے بادشاہان یورپ نے، بیچ میں پڑ کر بلجیم کی خود مختاری اور آزادی کو تسلیم کر لیا۔ بلجیم کا لبرل فرقہ تو یہ پسند کر لیتا کہ بلجیم کو فرانس میں شامل کر دیا جائے، مگر اُس میں پھر لڑائی کی آگ یورپ میں بھڑک اُٹھتی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ بلجیم ایک بادشاہ کی حکومت میں رہے اور پانچ بڑے بڑے بادشاہان یورپ ذمہ دار رہیں کہ یہ ریاست خود مختار اور لڑائی کے وقت سب سے علیحدہ اور بے تعلق رہے گی۔ اور فرانس اور برطانیہ کی فوج بَرّی و بحری نے ہالینڈ پر دباؤ ڈال کر یہ فیصلہ تسلیم کرا لیا۔ بلجیم کی یہ حالت آخر جولائی ۱۹۱۴ء تک بدستور قائم رہی۔ جب ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی میں لڑائی

آسٹریا کا اقتدار جرمنی میں کم ہوگیا اور صوبہ سلیشیا (Silesia) آسٹریا کے ہاتھ سے نکل گیا۔

فرانس کے انقلاب کے بعد جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں فرانس نے تھوڑے عرصے کے واسطے، وہ بات حاصل کرلی جو چودھویں لوئی کے منصوبے کے مطابق تھی۔ یعنی بلجیم، ہالینڈ اور دریائے رائن کا بایاں کنارہ فتح کرلیا۔ جب یہ برطانیہ نے دیکھا کہ فرانس اپنی سلطنت میں بلجیم، ہالینڈ کو ملانے والا ہے، تو وہ جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ نپولین کے زوال کے بعد وی اینا (Vienna) کانگریس کے فیصلے سے یورپ کا نقشہ بدل گیا اور حسب ذیل چار تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔

(الف) پرشا نے بڑے بڑے جرمن مقبوضات پائے۔ جن میں دریائے رائن کے صوبے شامل تھے۔

(ب) بلجیم آسٹریا سے چھڑا کر سلطنت نیدرلینڈز میں ہالینڈ سے ملادیا گیا، تاکہ فرانس کا مقابلہ کرسکے۔

(ج) آسٹریا کو لامبرڈی، وینیشیا (Venetia) اسٹریا (Istria) اور ڈیل میشیا (Dalmatia) حاصل ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن نسل کی رعایا آسٹریا سے کم ہوگئی۔ اور اٹیلین اور سلوانک فرقے پہلے سے بہت زیادہ اُس میں بڑھ گئے۔

(د) جرمنی ۳۸ صوبوں یا ریاستوں کا مجموعہ قرار دیا گیا۔ نپولین نے بلا علم و ارادہ، جرمنی کے حق میں بڑا فائدہ پہونچایا۔ ۱۸۰۶ء میں اُس کی

حکومت دستوری کا سخت دشمن تھا۔ صرف دو خیال اُس کے ذہن میں رہتے تھے۔ ایک یہ کہ سلطنت شخصی کا اقتدار برقرار رہے اور پرشا کا جاہ و جلال بڑھتا رہے۔ اس کا ارادہ نہایت مضبوط اور ہمت نہایت بلند تھی۔ عقل کا نہایت تیز اور تدبیر کا بڑا گاڑھا تھا، لیکن اپنی تدبیروں پر عمل کرنے میں جائز یا ناجائز وسیلوں کی زیادہ پرواہ نہ کرتا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ جرمنی میں آسٹریا اور پرشا دونوں کے لئے کافی جگہ نہیں ہے ۔ ع —
بہ ملکے نہ گنجند دو بادشاہ ۔ پس درمیان سے آسٹریا کو ہٹا دینا چاہیے ۔ آسٹریا کو دبانے کے واسطے فوج کی ضرورت تھی اور ایسی فوج مہیا کرنے کے لئے ضرور ہوا کہ پرشا کی پارلیمنٹ کی مرضی کے خلاف عمل کیا جائے۔ ہرچند کہ مخالفت بہت ہوئی مگر بسمارک نے اپنے مطلب میں کامیابی حاصل کرلی۔
ڈنمارک کے قبضہ میں دو ڈچی تھیں۔ یعنی Schleswig and — Holstein Duchies ان دونوں کو پرشا کے واسطے لینے کا خواہشمند بسمارک بہت زیادہ تھا۔ اس معاملے پر جرمنی میں اُس وقت لوگوں کو بہت سرگرمی تھی۔ بسمارک نے آسٹریا کو ترغیب دی کہ شریک ہو کر دونوں، ڈنمارک پر حملہ کریں۔ چنانچہ یہ حملہ ہوا اور یہ دونوں مقامات ڈنمارک سے جدا کر لیے گئے۔ اب نہایت چالاکی سے بسمارک نے فتح کیے ہوئے مقامات کی تقسیم پر آسٹریا سے جھگڑا کیا۔ اس وقت پرشا کی فوج تیار تھی اور اُس کے پاس برج لوڈ بندوقیں تھیں اور مشہور جنرل مولٹکی (Moltke) فوج کا سردار تھا گو اکثر جرمن ریاستیں اس موقع پر آسٹریا سے مل گئیں، لیکن پرشا سے سربر

چھڑی تو دونوں فریق نے برطانیہ کو یقین دلایا کہ اس لڑائی میں بلجیم سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رہے گا۔ اور یہ وعدہ پورا کیا گیا۔ اُس وقت سے یہ اندیشہ کیا جاتا تھا کہ اگر دوبارہ جنگ ہوئی تو جرمنی کو اس وعدہ پر عمل کرنا دشوار ہو جائے گا، چنانچہ اس موجودہ لڑائی میں وہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔

انیسویں صدی کے وسط میں آسٹریا اور پرشا میں دشمنی بڑھ گئی۔ ۱۸۵۹ء میں آسٹریا کو بہت بڑا صدمہ پہونچا۔ اٹلی نے آسٹریا کی حکومت سے بغاوت کی جس کا سرگروہ بادشاہ سارڈنیا (Sardinia) تھا۔ وکٹرا میونئیل (Emanuel) بادشاہ سارڈنیا اور کاؤنٹ کوور (Cavour) اٹلی کے مدبر اعظم نے نپولین سوم شہنشاہ فرانس سے مدد حاصل کر لی اور ۱۸۵۹ء میں آسٹریا کو شکست دے کر لامبرڈی چھین لیا۔ اس شکست کے ہوتے ہی، جس قدر چھوٹے چھوٹے والیان ریاست جزیرہ نمائے اٹلی میں آسٹریا کے بھروسے پر حکومت کرتے تھے، بے اختیار کر دیے گئے اور اٹلی کی سلطنت موجودہ عالم وجود میں آگئی۔ اس مدد کے صلے میں فرانس کو دو صوبے سیوا ے اور نیس (Savoy and Nice) ہاتھ آئے جو اُسی مذکورہ بالا سلطنت وسطی کا حصہ تھے۔

اسی زمانے میں پرشا میں انیسویں صدی کا ایک نہایت مشہور و معروف وزیر با تدبیر بسمارک نام آسمان شہرت پر آفتاب کی طرح چمکا۔ یہ وہ فرزانہ یورپ تھا۔ جس نے شاندار سلطنت جرمنی بنائی۔——————

—————— یہ وزیر کبیر بے نظیر کنزرویٹیو تھا اور لبرل خیالات اور

دریائے رائن کا بایاں کنارہ لے لوں گا۔ فرانس کی بدقسمتی سے آسٹریا اور پرشا کی جنگ جلد ختم ہوگئی۔ جب تک صلح نہیں ہوئی فرانس اپنا مطالبہ نہ کرسکا۔ جب اُس نے اپنے معاوضے کا مطالبہ کیا، تو بسمارک نے یہ درخواست نہایت حقارت سے نامنظور کی۔ پہلے شہنشاہ فرانس نے دریائے رائن کے بائیں کنارہ کا کچھ حصہ چاہا۔ جب یہ نامنظور ہوا تب بلجیم مانگا اور آخر میں لکسم برگ کے خریدنے کی اجازت چاہی، لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ نپولین نے بیوقوفی سے اپنی یہ درخواستیں اور تجویزیں لکھ کر دیدی تھیں۔ بسمارک نے جنوبی جرمن ریاستوں کو اُن تجویزوں سے اطلاع دیکر اُن سے دوستی کے عہد و پیمان کر لیے اور جب فرانس اور جرمنی میں ۱۸۷۰ء میں جنگ ہوئی تو نپولین کی تحریری درخواست، بلجیم لینے کی مشتہر کرکے برطانیہ کو فرانس کے خلاف کر دیا۔

۱۸۷۰ء میں جو لڑائی فرانس اور جرمنی میں ہوئی، وہ اصل میں اُسی لڑائی کا قدرتی نتیجہ تھی، جو ۱۸۶۶ء میں آسٹریا اور پرشا میں ہو چکی تھی۔ پرشا نے جب آسٹریا پر فتح پائی، تو اُس کی طاقت بڑھنے لگی اور فرانس کو یہ دیکھ کر خوف پیدا ہوا۔ گو نپولین خود لڑنا نہیں چاہتا تھا، مگر اُس کے دوستوں میں ایک فریق تھا، جو یہ خیال کرتا تھا کہ فرانس کو فتح حاصل ہوئی تو نپولین کے خاندان کی زیادہ مضبوطی ہو جائے گی یعنی اُس کی اولاد کے واسطے فرانس کا تخت محفوظ ہو جائے گا۔ بسمارک خود لڑائی چاہتا تھا تاکہ شمالی جرمن صوبوں کا جو مجموعہ بنا ہے، وہ زیادہ مضبوط ہو جائے اور

نہ ہو سکیں اور ۱۸۶۶ء میں سات ہفتے کے عرصے میں آسٹریا کو پناہ مانگنا پڑی۔
آسٹریا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا گیا۔ وینیشیا (Venetia) اٹلی کو دلا دیا
گیا اور جرمنی کے حدود سے باہر نکال دیا گیا، کیونکہ اٹلی پرشا کا دوست تھا۔ لیکن
جو آسٹریا کے مقبوضات جرمنی میں تھے وہ چھینے نہیں گئے۔ اب پرشا نے ذیل
کے مقامات شامل کر کے جرمنی کی مجموعی طاقت کو خوب مضبوط کر لیا:۔

Schleswig-Holstein, Hanover, Hesse-Cassel, Hesse-Nassau and Frankfort.

اور دوسرے سال یعنی ۱۸۶۷ء میں جنوبی جرمن ریاستوں سے دوستی کے عہد
و پیمان کیے، جن میں آسٹریا سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اب آسٹریا کو کوئی چارہ
نہ رہا۔ بجز اس کے کہ وہ مشرقی یورپ کی طرف توجہ کرے۔

اب فرانس کی خبر لینے کی باری آئی۔ بسمارک نے لوئی نپولین شہنشاہ فرانس
کو پورا بیوقوف بنایا، کیونکہ اُس نے دیکھا کہ فرانس کو پرشا کا طرفدار بنانے میں
پرشا کا فائدہ ہے، اور خود شہنشاہ فرانس سے ملاقاتیں کرکے اس کو اپنا مددگار
بنالیا۔ نپولین کیا سمجھا کہ پرشا کی طاقت جس قدر بڑھے گی، اُسی قدر آسٹریا کا
مقابل ہو کر اُس کو کمزور کر دے گا۔ اس کے سوا بسمارک نے اُس کو اُمیدیں
دلائیں اور وعدے کیے کہ پرشا اور آسٹریا کی لڑائی میں اگر فرانس دخل نہ دے
تو اُس کو معاوضے میں نیا ملک ملے گا۔ جب پرشا اور آسٹریا میں جنگ چھڑ گئی
تو فرانس خاموش رہا۔ شہنشاہ فرانس نے یہ اُمید باندھی کہ جب آسٹریا اور پرشا
لڑتے لڑتے تھک جائیں گے، تب میں بیچ میں پڑوں گا اور معاوضے میں

چھوڑنا پڑی تو بسمارک فخریہ کہا کرتا تھا کہ میں نہ ہوتا تو فرانس سے جنگ نہ ہوتی۔ جب لڑائی چھڑی تو جنوبی جرمن ریاستیں —— Baden, Wurtemberg, Bavaria —— وغیرہ سب، شمالی جرمن ریاستوں سے مل کر لڑائی میں پرشا کی مددگار ہو گئیں اور فرانس کو شکست فاحش نصیب ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کی سلطنت کو زوال پہونچا اور نئی متحد سلطنت جرمنی وجود میں آئی اور بادشاہ پرشا اُس کا شہنشاہ کہلایا۔ فرانس کو تین ارب روپیہ تاوان جنگ ادا کرنا پڑا اور صوبجات آلساس لورین (Lorraine) اُس سے چھن گئے۔ آلساس کے باشندے جرمن نسل سے ہیں۔ لیکن دونوں صوبے پہلے سے فرینچ کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور گو ۴۳ برس سے فرانس سے جدا ہو کر جرمنی کے قبضے میں رہے، لیکن بدستور فرانس کے ہمدرد ہیں، جس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرشا کا طریقۂ حکومت اُن کو پسند نہیں ہے۔ یہ دونوں صوبے جرمنی نے فوجی اغراض کے لئے اپنے قبضے میں لیے تھے۔ لیکن بموجب اس مقولے کے کہ "ہنوز چشمش نگرانست کہ ملکش بادگرانست" جب قوم سامنے دیکھ رہی ہے کہ ہمارا ملک ہمارا دشمن دبا ئے بیٹھا ہے، کیونکر اُس کے دل میں ملال نہ ہوگا اور غصے کی آگ نہ بھڑکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ۴۳ برس سے اب تک فرانس اور جرمن میں سخت عداوت چلی آتی ہے اور اسی باعث فرانس اور جرمنی نے انیسویں صدی کے آخر میں، اپنی اپنی فوجیں بہت بڑھا دیں اور سامان بھی بہت جمع کیا۔ جرمنی کی اُمید کے خلاف فرانس نے شکست کے بعد بہت جلد سنبھالا لیا۔ ۱۸۷۵ء میں

جنوبی جرمن ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ہیں، وہ جنگ میں مددگار ہوں
نیپولین نے آسٹریا اور اٹلی سے، جو پرشا پر حملہ کرنا چاہتے تھے، دوستانہ عہد و
پیمان کیے، تاکہ پرشا پر حملہ کرنے میں مدد دیں، لیکن لسمارک نے کہا " توڑ ال
ڈال، میں پات پات "، اور جیسے ہی فوج کو تیار پایا، اُن سے لڑائی چھیڑ دی۔
اُس نے وہ ڈھنگ اختیار کیا کہ سبھوں نے یہ سمجھا کہ فرانس سینگ کرکے لڑتا
ہے۔ لسمارک نے ایک سازش کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ شہزادہ ہوانیٹزولرن
(Hohenzollern)— اسپین کے تخت پر بیٹھے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ
یہ بات فرانس کو ناگوار گزرے گی۔ اس سازش کا نتیجہ اُس کی اُمید کے
خلاف ہوا، یعنی اُس شہزادے نے اُمیدوار بننے سے دستبرداری کی،
لیکن فرانس نے یہ چاہا کہ شاہ پرشا ضمانت کرے کہ دوبارہ وہ شہزادہ
تخت اسپین کا اُمیدوار نہ بنے گا۔ لسمارک جو لڑائی مول لینا چاہتا تھا
یہ سمجھ کے کہ شکار جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا دوبارہ خود بخود پھنس گیا،
اُس نے یہ سوچا کہ شاید اب بھی لڑائی ٹل جائے، اس لیے ایسی تدبیر
کرنا چاہیے کہ لڑائی یقینی ہو جائے۔ فرنچ سفیر نے جو گفتگو شاہ پرشا سے
بوقت ملاقات ضمانت کے بارے میں کی تھی، اُس ملاقات کے حالات
لسمارک نے نون مرچ لگا کر مشہور کیے۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ پرشا سمجھا کہ سفیر
نے ہمارے بادشاہ کی توہین کی اور فرانس نے یہ خیال کیا کہ بادشاہ نے
ہمارے سفیر کی تحقیر کی۔ دونوں فریق لڑائی پر تُل گئے۔ زمانہ حال میں جب
موجودہ قیصر جرمنی اور لسمارک کے باہم رنجش ہوئی اور لسمارک کو وزارت

آسٹریا کو ضرور ہوا کہ دو لاکھ فوج رکھ کر اپنے نئے مقبوضات کا انتظام کرے، جس کی رعایا زیادہ تر نسل کے اعتبار سے سروین تھی۔

برلن کانگریس یعنی برلن کی پنچایت کے بعد آسٹریا اور روس میں دشمنی ہو چلی۔ اس وقت تک بسمارک کے تعلقات جو غیر ملکوں کے ساتھ تھے، وہ اس اصول پر تھے کہ آسٹریا اور روس دونوں سے دوستی رکھی جائے۔ اب اُس کو یہ لازم آیا کہ اُن میں سے ایک سے دوستی رکھے۔ چنانچہ اُس نے آسٹریا سے ۱۸۷۹ء میں یہ معاہدہ کیا کہ اگر روس آسٹریا پر حملہ کرے تو جرمنی آسٹریا کا مددگار رہو گا۔ ۱۸۸۲ء میں اٹلی بھی آسٹریا کا شریک ہوگیا اور یوں اتحاد ثلاثہ قائم ہوگیا۔ بظاہر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی اپنے دشمن آسٹریا کا شریک ہو جائے، لیکن اس وقت اس کو اپنے دوست فرانس کی طرف سے شبہ اور رنج تھا، کیونکہ فرانس نے ٹیونس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس معاہدے میں جو آسٹریا اور اٹلی کے درمیان ہوا تھا کمزوری تھی، کیونکہ جو بعض مقامات آسٹریا کے ایسے تھے کہ جہاں اٹیلین زبان بولی جاتی تھی، اُن کی طرف اٹلی بہت لالچ کی نظر ڈالتا تھا۔ اسی طرح جزیرہ نمائے بلقان میں بحر ایڈریٹک (Adriatic) کے کناروں پر آسٹریا اور اٹلی کے تعلقات ایک دوسرے کے خلاف ہیں، اس وجہ سے کچھ تعجب نہیں کہ اٹلی نے موجودہ لڑائی میں یہ سمجھا ہو کہ آسٹریا کا حملہ سرویا پر، چونکہ محض زبردستی سے ہے، اس لئے میری علیحدگی اس لڑائی سے میری بدنامی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ بسمارک یہ چاہتا تھا کہ اگر آسٹریا روس پر حملہ کرے تو شہنشاہ روس فرانس سے مدد

جرمنی پھر فرانس کو دھمکیاں دینے لگا۔ اس وقت ایسا نازک موقع تھا کہ وکٹوریہ ملکہ انگلستان اور شہنشاہ روس دونوں کو دخل دینا پڑا۔ چونکہ فرانس کمزور تھا اُس کو یہ خواہش ہوئی کہ کسی زبردست بادشاہ سے دوستی و امداد کا عہد و پیمان کرے، جو ضرورت کے وقت پناہ کا کام دے۔ چنانچہ جب ۱۸۹۱ء میں روس نے جرمنی کے مقابلے میں دوستانہ امداد کا معاہدہ فرانس سے کرنا چاہا، تو فرانس کو بے حد خوشی ہوئی۔

اب یہاں سے یورپ کے جنوب مشرق کا حال لکھا جاتا ہے۔ جہاں کہ ٹرکی کے مقابلہ میں ہرٹسے گو وینا (Herzegovina) نے بغاوت کرکے مشرقی مسئلے کو پھر تازہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو سرویا اور ٹرکی میں لڑائی ہوئی اور پھر ۱۸۷۷ء میں روم و روس کی جنگ ظہور میں آئی۔ ٹرکی کو شکست ہوئی اور San Stefano کے عہد نامے کے ذریعہ روس اور ٹرکی میں صلح ہو گئی۔ تب برطانیہ نے دخل دیا اور روس کو مجبور کیا کہ بادشاہوں کی پنچایت میں یہ عہد نامہ پیش کرے۔ یہ پنچایت برلن میں ۱۸۷۸ء میں ہوئی، جس کا سرپنچ پرنس بسمارک تھا۔ اس پنچایت کا یہ فیصلہ ہوا کہ سرویا، مانٹی نیگرو اور رومانیہ، آزاد اور خود مختار سلطنتیں کردی گئیں اور بلغاریہ کو سیلف گورنمنٹ کا حق دے دیا گیا۔ آسٹریا نے چونکہ کسی کی طرفداری نہیں کی تھی، اس لئے اُس کو یہ بدل ملا کہ باسنیا اور ہرٹسے گو وینا پر قبضہ رکھکر ان ریاستوں کا انتظام کرے اور سنجاق پر جو سرویا اور مانٹی نیگرو کے درمیان پرانے سرویا کا ایک ٹکڑا ہے، قابض ہو جائے۔ اب

قائم ہوئی تو آسٹریا اور بلغاریہ کو اندیشہ ہوا کہ اگر ٹرکی کے انتظام حکومت میں اصلاح ہوگئی، تو ترک اپنے دور افتادہ صوبوں کو پھر اپنے قبضے میں لانا چاہیں گے۔ اس لئے آسٹریا نے باسنیا اور ہرزیگووینا کو اپنے قلمرو میں ملا لیا اور بلغاریہ نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آسٹریا کے اس عمل سے سرویا کو نہایت غصہ آیا، کیونکہ باسنیا کی رعایا سروین قوم کی تھی اور سرویا کی جو آرزو تھی کہ کسی وقت وہ سب قوم سرویا کو ملا کر ایک بڑا سرویا بنائے گا، وہ ہمیشہ کے لئے خواب و خیال ہوگئی۔ ایسے وقت میں روس نے سرویا کی طرفداری کی۔ لیکن جب جرمنی آسٹریا کی مدد پر جھکا، تو روس کو ہٹ جانا پڑا۔ کیونکہ وہ اُس وقت تک جاپان کی جنگ کے صدمے جھیل رہا تھا۔ سرویا نے اپنی سلطنت بڑھانے کے واسطے اپیل کی اور چاہا کہ سنجاق حاصل ہو جائے تاکہ سرویا کی سرحد مانٹی نیگرو سے مل جائے۔ لیکن یہ بات آسٹریا کو نہایت ناگوار تھی۔ اس لئے اُس نے سنجاق ٹرکی کو دیدیا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان ہوئی تو سرویا نے سنجاق فتح کر لیا، بلکہ کچھ اور زیادہ ملک لے لیا۔ اور یہی کامیابی جو سرویا کو حاصل ہوئی یورپ کی اس جنگ عظیم کی بنیاد ہے۔

اب اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ کیوں آسٹریا نے سرویا سے لڑائی ٹھانی۔ آسٹریا ہنگری، سرویا کی طاقت توڑنا چاہتا ہے۔ دو وجہ سے۔ ایک یہ کہ آسٹریا ہنگری میں ڈھائی کروڑ رعایا یعنی آدھی مردم شماری سے زیادہ سلاو قوم ہے اور ان میں پچاس لاکھ سے زیادہ سروین ہیں، جو یہ

نہ مانگے، اس لئے باوجودیکہ اتحاد ثلاثہ قائم تھا، بسمارک نے روس سے ایک خفیہ معاہدہ ۱۸۸۷ء میں کیا کہ آسٹریا کے حملے کے وقت جرمنی روس کا مددگار رہوگا۔

۱۸۸۸ء میں موجودہ شہنشاہ ولیم جرمنی کے تخت پر بیٹھے۔ گو کہ یہ بسمارک کے شاگرد تھے اور اس کی اعلیٰ لیاقتوں کو سراہتے تھے، لیکن سب پر جلد روشن ہوگیا کہ دو شخص جو ایسے ضدی ہوں، وہ ساتھ ساتھ کام نہیں کرسکتے۔ ۱۸۹۰ء میں اس وزیر اعظم کو استعفا دینا پڑا اور جب وہ اپنے گھر بیٹھا تو اپنی گورنمنٹ کی کارروائیوں پر سخت اعتراض کیا کرتا تھا۔ شہنشاہ ولیم کی پالیسی غیر ملکوں کے معاملات میں بسمارک کی ایسی نہ تھی۔ اس لیے اُس نے خفیہ عہدنامے کو، جو روس اور جرمنی کے باہم ہوا تھا، تازہ نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور روس آپس میں مل گئے اور انھوں نے اتحاد ثلاثہ کے مقابل میں "اتحادِ اثنین" ۱۸۹۵ء میں قائم کیا۔ جاپان کی لڑائی کے بعد جب روس تھک کر کمزور ہوگیا، تو جرمنی نے فرانس کی طرف غصے اور حقارت کی نگاہ ڈالنا شروع کی۔ اُس وقت فرانس کو روس کی دوستی کی قدر معلوم ہوئی۔ پس یہ اُنھی عہدناموں کی وجہ سے ہے کہ موجودہ جنگ عظیم میں جرمنی نے آسٹریا کی طرفداری کی اور فرانس نے روس کا ساتھ دیا۔

۱۸۷۸ء میں جو فیصلے اور انتظام، برلن کی پنچایت کے ذریعہ ہوئے تھے، وہ تیس برس تک قائم رہے۔ ۱۹۰۸ء میں جب ٹرکی میں حکومت دستوری

طرفداری کی۔ اول تو روس کے تعلقات جزیرہ نمائے بلقان سے ہیں۔ علاوہ اس کے، روسی اور سرورین قوم دونوں ایک نسل سے ہیں اور دونوں کا مذہب ایک ہے۔ ان وجہوں سے روس اپنے کمزور بھائیوں کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ روس ہی نے پہلے سرویا کو سیلف گورنمنٹ کا حق دلایا تھا اور بعد میں خود مختاری — اور اگر روس ۱۹۰۵ء میں کمزور نہ ہوتا تو اُس وقت بھی سرویا کو بغیر مدد دیے نہ رہتا۔ آسٹریا اور جرمنی نے اگر یہ سمجھا کہ پہلے کی طرح روس اب بھی کمزور ہے اور ہم کو سرویا پر حملہ کرنے دے گا یا ہماری گیدڑ بھبکی میں آکر ہٹ جائے گا تو سخت غلطی کی۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ کے تعلقات، جو فرانس اور جرمنی سے تیس سال گزشتہ سے رہے ہیں، مختصر طور پر بیان کیے جائیں۔ اس مدت میں پہلے پندرہ برس تک فرانس اور برطانیہ میں پورے طور پر دوستی نہ تھی۔ برٹش کا قبضہ مصر پر رہنے سے فرانس کو رنج تھا اور چند نوآبادیوں کے تعلقات کے سبب، فرانس اور برٹش میں جنگ کا اندیشہ رہا کرتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں جبکہ میجر مارشان (Major Marchand) نے فشوڈا پر جو دریائے نیل کے اوپر کے حصے میں واقع ہے، قبضہ کیا تھا تو اُس وقت برٹش کے ساتھ لڑائی ٹھن جانے کا اندیشہ بہت زیادہ تھا، کیونکہ انگریز فشوڈا کو اپنی حد اختیار کے اندر سمجھتے تھے۔ اُس وقت لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی، مگر برٹش اور فرینچ میں دشمنی زیادہ بڑھ گئی۔ شہنشاہ جنت آشیاں ایڈورڈ (ہفتم) (Edward, the Peace-maker) کی دور بینی و

چاہتے ہیں کہ ہم سرویا کی حکومت میں آجائیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرویا،
ہمیشہ آسٹریا کی رعایا کو اپنا ہمدرد بنانے اور آسٹریا سے مخالفت کرانے کی کوشش
کرتا رہتا ہے اور یہ سازشیں برابر جاری رہا کرتی ہیں۔ آسٹریا انہی سازشوں کو
بند کرنا چاہتا ہے۔ دوسری وجہ آسٹریا کے حملے کی، یہ ہے کہ جرمنی کی پالیسی مشرقی
معاملات میں جو کچھ بسمارک کے وقت میں تھی، اُس سے بالکل بدل گئی ہے
اور اب وہ ٹرکی کے ایشیائی علاقے لینے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس غرض سے
سلطان روم سے دوستی بڑھانے کے لئے جرمنی بہت سرگرمی سے کوشش
کرتا ہے اور اسی باعث ایشیائے کوچک اور وادی فرات میں بغداد ریلوے
وغیرہ میں جرمنی کا روپیہ لگانے کے لئے سلطان روم کو بہت آسانیاں
حاصل ہوئی ہیں۔ چونکہ جزیرہ نمائے بلقان میں ہوکر راستہ ہے، اس لئے
سرویا کی طاقت بڑھ جانے سے اندیشہ ہے کہ وہ راستہ جرمن کو نہ ملے گا۔
اس لئے جرمنی اور آسٹریا نے آپس میں اتفاق کرکے یہ تجویز کیا ہے کہ
یہ راستہ کھلا رہنا چاہیے اور یہ غرض حاصل کرنے کے لئے سرویا کی طاقت
توڑکر اس کو اپنا ماتحت بنا لینا چاہیے۔

یہ ناممکن تھا کہ روس خاموشی سے سرویا کو پامال کرا دیتا۔ روس
یہ نہیں کر سکتا کہ بڑے آدمیوں کو قتل کرانے کے واسطے سازشیں کرائے
یا سازش کرنے والوں کو مدد دے۔ لیکن جب اُس نے یہ دیکھا کہ ولیعہد آسٹریا
کے قتل سے آسٹریا کو ایک حیلہ ملتا ہے کہ سرویا پر حملہ کرے اور اُس کی
خودمختاری مٹا دے، تو اُس سے پھر رہا نہ گیا اور اُس نے سرویا کی

اڈورڈ کی صلح جوئی اور دور اندیشی اور برٹش سفیر کی مدبری سے اس عہد نامے پر دستخط ہو گئے، جو Anglo-Russian Convention کے نام سے مشہور ہے۔ اس وقت سے روس اور برطانیہ میں دوستی کا رشتہ مضبوط ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں جب مراکو کے معاملات پھر تازہ ہوئے، اُس وقت جرمنی جنگی جہاز پینتھر (Panther) نامی ساحل مراقش پر یکایک پہونچ گیا۔ اُس وقت برطانیہ نے فرانس کی مدد کی اور اپنی فوج بحری تیار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی اور فرانس میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

برطانیہ نے جو دوستی فرانس سے پیدا کی اُس کا کچھ تو سبب اور کچھ نتیجہ یہ تھا کہ جرمنی کے ساتھ، برطانیہ کے تعلقات میں فرق آ گیا تھا۔ ۱۸۷۰ء میں جب فرانس اور جرمنی کے باہم جنگ ہوئی، برطانیہ میں اکثر اشخاص جرمنی کے طرفدار تھے۔ گو بعضے بسمارک کی جنگ و جدل کی حکمت عملی کو ناپسند کرتے تھے۔ جب فتح کے بعد جرمنی کی سلطنت مضبوط ہو گئی تو برطانیہ کو ہمدردی تھی اور برسوں برطانیہ نے جرمنی کی دوستی کا پورا خیال رکھا۔ لیکن ۱۸۸۴ء میں جرمنی نے غیر ملکوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں، تو اُس وقت انگلستان کو بسمارک کی حکمت عملی ناپسند آئی اور کسی قدر دشمنی پیدا ہوئی۔ پھر بھی برطانیہ نے یہ خیال کیا کہ اگر جرمنی نوآبادیاں قائم کرنا چاہتا ہے، تو یہ خیال بیجا نہیں ہے، اس لئے جو جھگڑے فساد تھے اُن کا فیصلہ دوستانہ ہو گیا اور برطانیہ نے جرمنی کو افریقہ اور جنوبی سمندروں میں نوآبادیاں قائم کرنے سے نہیں روکا، گو وہ اپنی زبردست فوج بحری سے

مصلحت اندیشی کی تعریف، جس قدر کی جائے کم ہے، جنھوں نے فرانس اور
برطانیہ میں دوستی پیدا کرکے مدتوں کی دشمنی کی بنیاد مٹادی، جس کا بہت
بڑا فائدہ آج دونوں قوموں کو پہونچ رہا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں شہنشاہ اڈورڈ
فرانس تشریف لے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۴ء میں، دونوں قوموں
میں، سمجھوتا ہوگیا اور جو بنیاد فساد چلی آتی تھی اُس کا تصفیہ ہوگیا۔ اُس
وقت سے فرانس اور برطانیہ میں دوستی شروع ہوئی۔ جس کا نتیجہ دوسرے
ہی سال دکھائی دیا۔ یعنی فرانس نے برطانیہ کا قبضہ مصر پر تسلیم کرلیا اور
برطانیہ نے اُس کے بدلے میں فرانس کو مراکو کے معاملات میں پورے
اختیارات دیدیے۔

اس موقع پر شہنشاہ جرمنی نے دخل دیا اور ۱۹۰۵ء میں مقام
تانجیر (Tangier) میں جاکر وہاں کے سلطان کی آزادی اور خود
مختاری کا اعلان کر دیا۔ چونکہ جرمنی کے تعلقات تھے، اس وجہ سے
لازم آیا کہ یورپ کی قوموں کی ایک کانفرنس یعنی پنچایت بیٹھے، جو اس
معاملے کو سلجھاوے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں بمقام (Algiriras) یہ پنچایت
ہوئی اور اس وقت برطانیہ نے فرانس کی طرفداری کی اور آسٹریا نے
جرمنی کو مدد دی اور برٹش اور فرینچ میں دوستی زیادہ بڑھ گئی ——
—— جبکہ سر چارلس ہارڈنگ (جو لارڈ ہارڈنگ ہوکر اب ہمارے ویسرائے
ہیں) سینٹ پیٹرس برگ میں سفیر تھے، اُس وقت روس اور برطانیہ میں
عہدنامے کی غرض سے نامہ و پیام ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں شہنشاہ

میں کہیں کہیں نوآبادیاں بھی قائم کرلی تھیں، اس لئے اُس کو بھی یہ خواہش ہونا چاہئے تھی کہ سمندر میں میری طاقت مضبوط رہے۔ لیکن جس بڑی تعداد سے وہ جہاز اور فوج بحری بڑھا رہا تھا، اُس سے اور کوئی غرض نہیں پائی جاتی تھی، بجز اس کے کہ برطانیہ کی طرح میں بھی سمندر کا مالک بن جاؤں اور جس طرح خشکی میں میرا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا، ویسے ہی سمندر میں بھی میرا سامنا کوئی نہ کرسکے اور تمام دنیا میرے اشاروں پر چلے۔ جرمنی کی اس دشمنی سے، فرانس اور برطانیہ میں اور بھی زیادہ دوستی ہوگئی اور برطانیہ نے اپنی فوج بحری بڑھائی اور فرانس اور برطانیہ کے باہم یہ معاہدہ ہوا کہ اگر فرانس اپنے جہاز دریائے میڈی ٹرینین میں رکھے، تو برطانیہ اپنے جہاز جرمن کے سمندر میں رکھے گا۔ تین برس گزرے، جب جرمنی نے مراقش (مراکو) کے معاملے میں فرانس کو دھمکی دی تھی تو اسی معاہدے کے سبب برطانیہ نے جرمنی پر ظاہر کردیا تھا کہ فرانس کے بحری کناروں اور فرینچ نوآبادیوں کی حفاظت، برطانیہ بمقابلہ جرمنی کے کرے گا۔

اب جرمنی کے مقابل میں جو برطانیہ نے اعلان جنگ کیا ہے وہ دو سبب سے ہے۔ اوّل تو یہ کہ انگلستان، یہ معاہدہ فرانس سے کرچکا تھا کہ جرمن کے مقابل میں اُس کو مدد دے گا۔ برطانیہ کی عزت اس میں قائم رہتی تھی اور ذاتی فائدہ بھی اسی میں تھا کہ وہ فرانس کی مدد پر کھڑا ہو جائے تاکہ فرانس کا بازو نہ ٹوٹ جائے۔ دوسرے یہ کہ اگر برطانیہ مدد کا وعدہ فرانس سے نہ کرچکا ہوتا، تب بھی اُس کا فرض تھا کہ بلجیم کی سلطنت کو

روک سکتا تھا۔ جو لوگ جرمنی کو پہچانتے تھے، خوب واقف تھے کہ انگلستان کی سلطنت بحری کو، جرمنی نہایت حسد کی نظر سے دیکھتا ہے اور خاصکر یہ سمجھتا ہے کہ جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال اور انگلستان کے باہم دشمنی ہونے سے جرمنی کی طاقت وہاں قائم ہو جائے گی۔ جب ڈاکٹر جیمس کی مہم کو ناکامی ہوئی اور شہنشاہ جرمنی نے پریسیڈنٹ کروگر کو مبارکباد کا تار جنوری ۱۹۰۶ء میں بھیجا تو جاننے والوں کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔ البتہ نہ جاننے والوں کو حیرت ہوئی۔ اُسی وقت سے، جرمنی کی طرف سے، برطانیہ کھٹک گیا اور برطانیہ کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جرمنی کا دلی ارادہ کچھ اور ہے اور وہ ہرگز انگلستان کا دوست نہیں ہے۔

اگر کروگر کو کسی غیر ملک سے مدد ملنے کا بھروسا نہ ہوتا، تو جنگ ٹرانسوال شاید پیش نہ آتی۔ اگر اُس وقت جرمنی دشمنی سے کام لینا چاہتا تو ممکن نہ تھا، کیونکہ اُس کی بحری طاقت کم تھی۔ اُس وقت سے جرمنی نے اپنی فوج بحری کو بڑھایا۔ اور اگر برطانیہ بھی اپنی فوج بحری جرمنی کے مقابل نہ بڑھاتا تو جرمنی کی بحری طاقت تمام دنیا میں سب سے زبردست ہو گئی ہوتی۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ جرمنی میں یہ تیاریاں ہو رہی ہیں تو وہ سوچا کہ ایسی زبردست فوج بحری کی ضرورت جرمنی کو کیوں ہے۔ برطانیہ چونکہ خود ٹاپو ہے اور اُس کی سلطنت اور تجارت ملکوں ملکوں پھیلی ہوئی ہے، اس لئے اُس کو بہت زیادہ جہاز اور فوج بحری رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اپنی حفاظت کرے۔ جرمنی نے چونکہ تجارتی جہازوں کا بیڑا اپنایا تھا اور غیر ملکوں

وحشیانہ ظلم وستم سے بچائے گا اور کمزور قوموں اور ملکوں کو اپنی اصلی حالت پر بحال کرا دے گا۔

برطانیہ کی طرف سے ونیز تمام اتحادی قوموں کی طرف سے، یہ جنگ حق بجانب ہے، کیونکہ خویشتن دار قوموں کے نزدیک ایسی لڑائی بعض اوقات ضروری ہوتی ہے اور تمام دنیا کے صلح جو، اور جنگجو، ہر دو فریق متفق ہیں کہ اپنے حقوق کے استحقاق میں لڑنا اور جان کو خطرے میں ڈالنا نہایت فیاضی کا کام ہے اور جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ جلد نہایت ذلت کے درجے کو پہونچ جاتی ہیں۔

ٹرکی کی شرکت

اکتوبر ۱۹۱۴ء کے آخر میں، یعنی جبکہ جنگ شروع ہوئے تین مہینے گزر چکے تھے، ٹرکی جرمنی کے دباؤ سے اور اُس کی مدد کے بھروسے پر اس لڑائی میں شریک ہو گیا، جس سے برطانیہ کو سخت افسوس ہوا۔ یورپ میں کوئی بادشاہ ایسا نہیں ہے جس کا دانت قسطنطنیہ پر نہ ہو۔ صرف برطانیہ ایسا ہے، جو ٹرکی کی سلطنت کو صحیح وسالم رکھنا چاہتا ہے اور ہمیشہ اُس کا دوست اور خیرخواہ رہا ہے اور کئی مرتبہ اُس کو دوسرے بادشاہوں کے حملے سے بچا چکا ہے۔ مثلاً جب ۱۷۹۸ء میں نپولین نے ملک شام اور ایشیائے کوچک پر قبضہ کرنا چاہا تو برطانیہ نے اپنی فوج بحری سے اُس کو روک دیا، اسی طرح ۱۸۵۴ء میں برٹش نے ٹرکی کا طرفدار ہو کر، روس

ٹوٹنے نہ دے، نہ اُس کو کسی لڑائی سے سروکار اور واسطہ رکھنے دے، کیونکہ برطانیہ ان باتوں کا ضامن ہو چکا تھا۔ اس کے سوا جب جرمنی نے بلا وجہ بلجیم سے لڑائی ٹھانی اور بلجیم نے مدد کے لئے برطانیہ سے اپیل کی، تو برطانیہ کے لئے شرم کی بات تھی کہ اُس اپیل کو منظور نہ کرے۔ جب جرمنی نے اپنا عہد توڑا، یعنی بلجیم کو لڑائی میں پھنسایا، تو اُس نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم اپنا آدھا وعدہ پورا کریں گے، یعنی بلجیم کی سلطنت کو مُسلم رکھیں گے اور اُس کو ٹوٹنے نہ دیں گے، لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں، وہ سمجھ گئے کہ جرمنی کا مطلب کیا ہے اور نیز یہ کہ اُس کے وعدوں کا اعتبار کچھ نہیں ہے ؎

اُس کے اقرار میں انکار ہے اور ہاں میں نہیں
عہد میں عہد یہ پیاں کسی پیاں میں نہیں

اس میں شک نہیں کہ یہ جنگ عظیم نہایت افسوس کے لائق ہے اور جو تکلیفیں اور مصیبتیں اس کے باعث لوگوں پر پڑ رہی ہیں اور پڑیں گی وہ بے شمار ہیں، تب بھی بعض موقعوں پر بے عزتی کی صلح سے جنگ بہتر ہوتی ہے اور یہ موقع برٹش سلطنت کی تاریخ میں اسی قسم کا ہے۔ برطانیہ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُس کا معاملہ سچا ہے اور اسی سچائی کا یقین کر کے اُس نے انصاف اور آزادی کی حمایت میں تلوار میان سے کھینچی ہے، جو یقیناً اُس وقت میان میں جائے گی جبکہ وہ دشمنوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دے گا اور انسانی تہذیب و تمدن کا پشت پناہ بن کر اُسے جرمنی کے

یہ ریل بن گئی تو ایک زبردست فوجی طاقت رکھنے والی قوم، یعنی جرمنی کے قبضے میں ایسا راستہ آجائے گا، جو ہندوستان کی طرف سیدھا چلا آیا ہے۔ یعنی وہی راستہ جس طرف سے سکندر اعظم نے دریائے اٹک تک حملہ کیا تھا۔

حضرت سلطان المعظم اور اُن کی عزیز رعایائے جاں نثار، نہیں چاہتی تھی کہ برطانیہ سے لڑے۔ مگر افسوس کہ وہ سب مجبور و معذور رہیں۔ کیونکہ آج کل تمام طاقت اور اختیارات فوج کے ہاتھ میں ہیں، یا ینگ ٹرکس (young Turks) کی جماعت کے ہاتھ میں، جن میں ایسے ارکان عہدہ دار ہیں۔ جنھوں نے یورپ میں اور خصوصاً جرمنی میں تعلیم پائی ہے اور اس وجہ سے جرمن کے طور وطریق اور جرمنی کے طریقہ جنگ وحرب اور شیوہ طعن وضرب کو پسند کرتے ہیں — اور جرمن کی صحبت اور اُن سے خلا ملا رکھنے کا اثر ہے کہ ترکوں نے جرمنی سے اتفاق کیا، جس کے باعث جرمنی کی طرح ٹرکی میں بھی لڑائی کی آگ بھڑک اُٹھی سہ

کون کہتا ہے نہیں گرمیِ صحبت میں اثر جل اُٹھا پنبہ شرر سے جو ہم آغوش ہوا

ٹرکی میں ایک فریق ایسا ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ غیر ملکوں کے ساتھ ٹرکی کی صلح اور ملک کے اندر امن وامان رہے اور رعایا میں ناراضی نہ پھیلے اور برطانیہ سے پھر نئے سرے سے دوستی ہو جائے۔ اس فریق کے سرگروہ کامل پاشا تھے اور حضرت امیر المسلمین محمد خاں پنجم بھی اسی فریق میں ہیں۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ یہ سب بندگان خدا، جو اصل میں نہایت دور اندیشی اور عقلمندی کی راہ پر ہیں، کچھ کر نہیں سکتے، کیونکہ فوج اور اُس کے سردار انور پاشا، سیاہ وسفید کے مالک ہیں۔ اگر ٹرکی کی پالیسی اب بھی بدل جائے اور برطانیہ کے خلاف نہ ہو

کے مقابلے میں Crimean War میں حصہ لیا تھا، جس میں محاصرہ سباسٹوپول (Sebastopol) بہت مشہور ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ روس کے مقابلے میں ٹرکی کی محافظت کردی گئی تھی۔ علاوہ اس کے، تمام دنیا میں جس قدر آبادی مسلمانوں کی ہے، یعنی اٹھارہ کرور اسی لاکھ، اُس کے نصف سے زیادہ یعنی ۹ کرور باسٹھ لاکھ برطانیہ کی حکومت کے مختلف حصّوں میں مسلمانوں کی مردم شماری ہے، تو سمجھنا چاہیے کہ برطانیہ، اسلام اور اسلامیوں کا حامی و مددگار دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اُس سے چھیڑ کرنا اور اُس سے دشمنی مول لینا ٹرکی کو مناسب نہ تھا کیونکہ اُس کی دُشمنی سے بہت بڑے نقصان ہوسکتے ہیں — اور فرانس سے لڑنے میں ٹرکی اپنے ہاتھ سے ایسی قوم کی ہمدردی کھو بیٹھا، جو ٹرکی کی مالی حالت درست کردیتی اور برطانیہ سے جو عداوت برتی تو گویا ایسی قوم سے مخالفت کی جو ٹرکی کو ہمیشہ آزاد اور خودمختار اور زبردست سلطنت دیکھنا پسند کرتی ہے اور اسلام اور اسلامیوں کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ جرمنی کا ساتھی ہوکر، ٹرکی نے گویا ایسی قوم کی شرکت کی ہے جو اُس کی ایشیائی سلطنت اور قسطنطنیہ میں اپنا زور اور دباؤ قائم کرنا چاہتی ہے۔

جرمنی نے جو بغداد ریلوے بنائی ہے، وہ اسی غرض سے ہے کہ عراق، عرب اور ایشائے کوچک سے خلیج فارس تک ریل کی راہ پر جگہ جگہ اپنی نوآبادیاں قائم کردے اور اپنا قبضہ جمادے۔ اسی ریل کا ایک آخری حصّہ ہے، جو سنہ ۱۹۱۶ء میں ختم ہوجائے گا اور بغداد سے خلیج فارس تک چلا گیا ہے۔

گورنمنٹ برطانیہ نے اُن کو آزادی (مذہبی اور ہر قسم کی) اور اعلیٰ تربیت اور اعلیٰ درجے کے حقوق ملکی دے رکھے ہیں، جو دنیا میں کسی بادشاہ کی حکومت میں مسلمانوں کو حاصل نہیں ہیں۔ روس کی سلطنت میں جو ترکمان اور تاتاری مسلمان آباد ہیں جن کی تعداد ایک کروڑ اکیس لاکھ پچاس ہزار ہے، اُنھوں نے روس کا ساتھ دیا ہے اور فرانس کی سلطنت میں جو، الجزائر ڈیونس وغیرہ کی مسلمان رعایا ہے جس کی تعداد ایک کروڑ اٹھائیس لاکھ ہے، اُس نے فرانس کے ساتھ خیر خواہی اور جاں نثاری کا اظہار کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم ایسی ہے جو اپنے حاکم وقت کی فرمانبردار و اطاعت شعار اور وفادار و جاں نثار ہے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان ٹرکی وزیروں کی غلطی پر افسوس کیا کرتے ہیں جنھوں نے ٹرکی کو جنگ میں شریک کرا دیا اور نہایت اخلاص، اور سچائی سے اُن کو آگاہ کرتے ہیں کہ ؎

زبہرِ دشمن پیماں دوست بشکستی ... ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

حضور ویسرائے کے پاس جو سیکڑوں تار مسلمانوں کی پبلک جماعتوں نے بھیج کر اپنی خیر خواہی اور وفاداری کا یقین دلایا ہے اُن سے ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں کی قوم گورنمنٹ کی کیسی خیر خواہ ہے۔ گورنمنٹ کو ایسی قوم سے کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا، جن کے یہاں فقط ایک لفظ، ایمان کا ایسا ہے جو احسانمندی، فرض، دیانتداری اور عقیدہ، چاروں کو شامل ہے، اور یہ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ ایمان ہر مسلمان کے پاس ہے اور ہونا چاہیے۔

تو ممکن ہے کہ برطانیہ ٹرکی کے ایشیائی مقبوضات کی حفاظت کر دے اور قسطنطنیہ کوئی نہ لے سکے اور ٹرکی کی تمام سلطنت مسلّم اور برقرار رہ جائے۔ برطانیہ اس وقت جو کچھ کر رہا ہے، خوشی سے نہیں، بلکہ نہایت افسوس اور مجبوری سے حفاظت خود اختیاری کے اصول پر کر رہا ہے اور اُس کا یہ عمل، اس لئے نہیں ہے کہ اسلام اور اسلامیوں کو نقصان پہونچائے بلکہ اس لئے کہ جرمنی کا اختیار اور قابو قسطنطنیہ پر نہ جمنے پائے، جو اس وقت ظاہر میں تو مددگار ہے مگر دہی مسلمانوں اور اسلام کو سخت نقصان پہونچانے والا ہے۔ اس لڑائی کی حالت میں بھی برطانیہ نے عرب اور عراق کے تمام متبرک مقامات اور نیز بندر جدّہ کو حملے سے محفوظ رکھا اور حضور ویسرائے بہادر نے اپنی نہایت خیرخواہ مُسلم رعایا کی خاطر، اعلان کر دیا ہے کہ عرب کے تمام متبرک مقام اور نیز بندر جدّہ پر کوئی حملہ نہ کیا جائے اور ہندوستان کے حاجیوں کو جو اُن مقامات کو جائیں کوئی تکلیف نہ پہونچائی جائے اور برٹش گورنمنٹ کی سفارش سے فرانس اور روس نے بھی یہی وعدے کیے ہیں۔

حال میں جب ٹرکی اور اٹلی کے باہم جنگ تھی، یا جب بلقان کی لڑائی میں ٹرکی مبتلا تھا، تو ہندوستان کے سات کرور مسلمانوں نے نہایت فیاضی سے اپنے بھائیوں کی، یعنی ترکوں کی مدد کی تھی۔ یہ بات نہایت پسندیدہ تھی کیونکہ اُن لڑائیوں میں اصل میں اسلام کو خطرہ تھا۔ اسی طرح اس وقت مسلمانان ہند نے نہایت احسانمندی اور ایمانداری ثابت کی کہ گورنمنٹ برطانیہ کا ساتھ دیا اور جان و مال سے خدمت کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ کیونکہ

جیسی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان کے سب راجا، مہاراجا اور نواب جن کی تعداد قریب سات سو کے ہے، یکزبان ہوکر سلطنت برطانیہ کے تحفظ میں ذاتی خدمتیں کرنے کے لئے اور اپنے ملک کی آمدنی دینے کے واسطے حاضر ہیں۔ میدان میں جانے کے لیے حضور ولیسرائے بہادر نے حسب ذیل والیان ریاست منتخب کیے ہیں۔ مہاراجگان جودھپور، بیکانیر، کشن گڑھ، جام نگر، کولھاپور، رتلام، سچین (Sachin) پٹیالہ، سر پرتاپ سنگھ، ریاست بھوپال کے ولیعہد، مہاراجا کوچ بہار کے بھائی اور چند شہزادے مدرسہ جنگی کے طالب علم۔ ان میں سے اکثر اپنی اپنی فوجیں لے کر گئے ہیں، علاوہ ان ریاستوں کے Imperial Service Troops بھی گئی ہیں۔ پنجاب اور بلوچستان کے بعض رئیسوں اور مہاراجا بیکانیر نے ستر سواروں کے رسالے دیے ہیں۔ بعض والیان ملک نے درخواست کی ہے کہ ہم نئی فوج بھرتی کرکے دیں گے جو میدان جنگ میں جائے گی۔ مہاراجا ریوا نے اپنا خزانہ، اپنی فوج اور جواہرات سب دینے کا وعدہ کیا ہے اور مہاراجا میسور نے پچاس لاکھ روپیہ گورنمنٹ کو دیا ہے کہ فوج کے خرچ کے کام آئے۔ مہاراجا گوالیار نے بہت بڑی رقم گورنمنٹ کے پاس جمع کرانے کا وعدہ کیا ہے اور کئی ہزار گھوڑے، گھوڑچڑھی فوج کے واسطے دینے کا اقرار کیا ہے۔ مہاراجا ہلکر، نظام حیدر آباد اور راجا جام نگر نے اپنی ریاستوں کے سب گھوڑے دینے کا وعدہ کیا ہے۔ دربار نیپال نے اپنی ریاست کی تمام فوج گورنمنٹ کو دیدی ہے اور تین لاکھ روپیہ اس غرض سے دیا ہے کہ گورکھوں اور برٹش کے واسطے مشین گنیں خریدی جائیں۔ تبت کے ڈالی لاما (Dalai Lama) نے ایک ہزار تبتی کی فوج گورنمنٹ کو دی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی تمام جماعتیں

مختلف الاقوام رعایا کی طرف سے برطانیہ کی وسیع سلطنت کی خیر خواہی اور امداد

اس لڑائی میں جو دنیا کی سب سے بڑی لڑائی ہے، جس میں ڈیڑھ کرور فوج ہے، سلطنت انگلشیہ کی تمام رعایا انتہا درجے کی خیر خواہی اور جاں نثاری کررہی ہے۔ ہندوستان سے، جنوبی افریقہ سے، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے بلکہ دنیا کے اُس گوشے سے جہاں بظاہر زمین کا سرا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی کینا ڈا (Canada) سے، فوجوں پر فوجیں چلی آتی ہیں، جو میدان جنگ میں برطانیہ پر اپنی جانیں نثار کررہی ہیں۔ سلطنت برطانیہ جس میں آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اُس کے تمام حصے آپس میں مل گئے ہیں۔ گویا جان ایک ہے اور قالب جدا جدا ہیں۔ ہندوستان کی تمام رعایا جو ۳۲ کرور کے قریب ہے، یکدل اور یکجان ہورہی ہے۔ راجاؤں اور نوابوں اور رعایا کے ہر فرقہ وجماعت نے ملک کے عام جلسوں میں یہ ظاہر کیا ہے بلکہ گورنمنٹ کو درخواستیں دی ہیں کہ ہماری جان اور مال گورنمنٹ کے لئے حاضر ہے۔ آسٹریلیا نے دس ہزار فوج دوبارہ دی ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ ہر مہینہ چار ہزار فوج سے مدد دے گا۔ کینا ڈا کا وزیر اعظم سر رابرٹ بورڈن کہتا ہے کہ علاوہ اس تیس ہزار فوج کے جو ہم بھیج چکے ہیں، دس ہزار فوج روانگی کے واسطے اور تیار ہے اور پچاس ہزار جو نئی بھرتی کی گئی ہے وہ بھی ضرورت کے وقت بھیج دی جائے گی اور پھر بھی کینا ڈا اور مدد دے گا

تعداد ایک کرور پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ یہ رلیف فنڈ ہندوستانی سپاہیوں کے خاندان، اور مقتولین کے یتیم بچوں اور بیواؤں کی پرورش کے لیے ہے۔ اس کے سوا انگلستان میں بہت سے فنڈ کھلے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

Prince of Wales Fund, Queen Alexandra's Fund, Lord Roberts's Indian Soldiers' Fund, Miss Mary's fund and Indian Army Provision Fund

ان فنڈوں کے ذریعہ ہندوستانی اور برٹش سپاہیوں کو ہر قسم کے تحفے اور آسایش کی چیزیں جاڑے کے لیے بکار آمد پہونچتی رہتی ہیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور مقتولوں کی بیواؤں اور بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ تحفوں کے بھیجنے کا سلسلہ برابر جاری ہے اور سپاہیوں کی ذاتی آسایش و آرام اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو مدد پہونچانے کی تدبیریں نہایت وسیع پیمانے پر ہو رہی ہیں۔ انگلستان میں چھ سو اسپتال ہندوستانی زخمیوں کے علاج کی غرض سے کھولے گئے ہیں۔ ان اسپتالوں کے علاوہ، لیڈی ہارڈنگ صاحبہ کا اسپتال خاص طور پر زخمیوں کی خدمت کر رہا ہے۔ خود حضرت جارج پنجم اور اُن کی ملکہ معظمہ میری اور اُن کی مادر مہربان جا جا کر زخمیوں کو دیکھتی ہیں اور اُن سے دلاسے کی گفتگو کرتی ہیں اور اُن کی بہادری کی داد دیتی ہیں اور اُن سے پوچھتی ہیں کہ تم کو کوئی چیز اپنے بال بچوں کے واسطے بھیجنا ہو تو بتاؤ اور اُن کی فرمائش اُسی وقت پوری کی جاتی ہے۔ ماں باپ اس سے زیادہ محبت اپنے بچوں سے نہیں کر سکتے جو خود ہمارے بادشاہ اور اُن کی ملکہ اور اُن کی مادر مہربان ہمارے ہندوستانی بہادر سپاہیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔

مذہبی، پولیٹیکل، سوشل اور ہندو مسلمان، سکھ، بوہرے، خوجے، پارسی، عیسائی، ان سب کی بے شمار جماعتوں نے حضور وائسرائے اور لوکل گورنمنٹوں کو تاروں اور خطوں کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ ہم ہر قسم کی خدمت کرنے کو روپیے سے اور اپنی ذات سے تیار ہیں۔ مہاراجا گوالیار اور بیگم صاحبہ بھوپال کو Hospital Ship کا خیال سب سے پہلے پیدا ہوا۔ دہلی میڈیکل ایسوسی ایشن نے فیلڈ ہاسپٹل، جو بلقان کی جنگ میں بھیجا تھا وہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور کلکتے کے بہت سے ڈاکٹروں کی جماعتوں نے میدان جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت اپنے ذمّہ لی ہے اور اپنا مطب چھوڑ کے اہل کمیشن ہو کر گورنمنٹ کی طرف سے میدان جنگ میں گئے ہیں، اس طرح ۲۷ بڑی ریاستوں نے جہاں جہاں Imperial Service Troops تھیں سبھوں نے وہ فوجیں دینا چاہی ہیں لیکن حضور وائسرائے بہادر نے بارہ ریاستوں سے ایسی فوج کی مدد لی، جس میں سوار اور پیدل سب تھے اور وہ یورپ کو روانہ ہوگئی۔ گیکوار بڑودہ اور مہاراجا بھرت پور، جو یورپ میں تھے اور ہندوستانی جماعت جو انگلستان میں تھی، سبھوں نے خدمتگذاری اور خیر خواہی کا اظہار کیا ہے۔

ہندوستان میں وار رلیف فنڈ کے نام سے بہت بڑا سرمایہ جمع ہوا ہے، جس میں تمام ملک سے چندہ کیا گیا ہے۔ اس کی تعداد ۶ر مارچ سنہ رواں تک اٹھتر لاکھ نو ہزار آٹھ سو چھیاسٹھ روپیہ ہے اس کے علاوہ سوا چودہ لاکھ روپیہ اور ہے جو پراونشل کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہے۔ تکلیف زدہ لوگوں کی مقامی امداد کے لئے جو روپیہ مختلف صوبوں اور ریاستوں کی ایجنسیوں میں جمع ہو چکا ہے، اُس کی

اُن کو وطن اور بچوں سے چھڑا کے جرمنی بھیج دیا تاکہ وہاں کھیتوں میں کام کریں اور فصل کاٹیں۔ اُن خانہ بدوش جلاوطن لوگوں کی تکلیفوں پر ذرا غور کرنا چاہیے جو اپنی بیویوں، بچوں سے بچھڑے ہوئے بیگانہ ملک میں، جہاں اُن کے دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں، بے یار و مددگار، وطن سے دور، دوستوں اور عزیزوں سے مہجور مصیبت اُٹھا رہے ہیں ؎

مکیں رہے نہ مکاں، طرفہ کارخانہ ہوا　　زمیں اُلٹ گئی بس منقلب زمانہ ہوا

بیلجیم نے جرمن کے ظلم و ستم کی تحقیقات کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس میں بڑے لائق وزیر اور بڑے قابل جج اور بڑے قانون داں اشخاص شامل تھے۔

اس کمیشن کی رپورٹ سے، جو آخر اگست ۱۹۱۴ء میں شایع ہوئی، معلوم ہوا کہ جرمن کی فوج، ایک گاؤں میں جس کا نام Linsmean ہے، ۱۰ اگست کی شام کو داخل ہوئی وہاں کے سب مزدوروں کو بلا کر سب کے ہتھیار چھین لیے حالانکہ وہاں کسی نے مقابلہ نہیں کیا تھا۔ گیارہ کسانوں کو ایک خندق میں اُتار دیا، وہاں سب مردہ پائے گئے۔

۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اگست ۱۹۱۴ء کو ایک گاؤں میں، جس کا نام Orsineal ہے، ایک بوڑھے آدمی کے بازو پر تین زخم لگائے۔ پھر اُس کو اُلٹا لٹکا کر پھانسی دیدی اور جلا دیا۔ کمسن عورتوں کی بے آبروئی کی اور چھوٹے بچوں پر بدعت کی۔ بہت آدمیوں کے ہاتھ پاؤں ناک کان کاٹ ڈالے، جن کا بیان کرتے کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ایک زخمی سپاہی بیلجیم کا، وہاں ملا جو بیچارہ قید میں تھا۔ بجائے اس کے کہ اُس زخمی اور قیدی پر رحم کرتے اور اُس کی مرہم پٹی کرتے، اُس کو پھانسی دیدی۔ ایک دوسرا سپاہی جو اُس بیچارہ قیدی کی مرہم پٹی کر رہا تھا، اُس کو پکڑ کر تار کے کھمبے سے باندھ دیا اور

پدر بجائے پسر ایں ہمہ کرم نہ کند   کہ دست جود تو با خاندان آدم کرد

خداوند تعالیٰ ایسے بادشاہ کا سایہ ہمارے سروں پر سالہا سال قائم رکھے۔

جرمنی کے ظلم وستم

اور بلجیم کی تباہی وبربادی

جرمنی کے جور وظلم جو بلجیم میں ہوے ہیں، اُنھوں نے تمام دنیا میں ہل چل ڈال دی ہے اور تمام بادشاہوں کو جرمنی کے خلاف کر دیا ہے اور اُس سے نفرت پیدا کرا دی ہے جس طرح Goths اور Vandals وغیرہ وحشی اور جنگلی قوموں نے قدیم زمانے میں سلطنت روما کو غارت وتباہ کیا تھا اُسی طرح جرمنوں نے لوٹ مار قتل وزنا اور آتش زدگی سے بلجیم کی سلطنت کو، جو صنعت وحرفت اور تہذیب وشائستگی کا اعلیٰ نمونہ تھی، برباد وتباہ کر دیا۔ لُوویَن (Louvain) کا کتب خانہ جلا یا گیا۔ ریمز (Reims) کا گرجا جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا، مسمار کیا گیا۔ عام رعایا جو لڑنے والی نہ تھی اُن کے گھر جلائے گئے اور مکانات مسمار کئے گئے۔ اُن کو پھانسیاں دی گئیں۔ اُن کا مال واسباب لوٹا گیا۔ عورتوں اور بچوں پر سخت ظلم کیے گئے۔ لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی۔ رعایا پر کروروں روپیہ کے ٹیکس لگائے گئے۔ جن جہازوں پر زخمیوں کی مدد کا سامان تھا اُن کو تارپیڈو سے اُڑایا گیا۔ جو شہر اور قصبے غیر محفوظ حالت میں تھے، اُن پر گولے برسائے گئے۔ غرضکہ سب ایسے کام کئے جن کی اجازت حالت جنگ میں قانون بین الاقوام نہیں دیتا۔ اس پر طرہ یہ کہ بلجیم کی رعایا کو پکڑ لے گئے اور

اپنے ہر خویش و بیگانہ سے وہ مہجور ہوا
کون سا شیشہ دل ہے کہ نہ جو چور ہوا

یہ وہی شہنشاہ جرمن ہیں جنھوں نے جولائی سنہ ۱۹۰۰ء میں جب اپنی فوج چین کی مہم پر بھیجی تھی کہ باکسر فرقے کی بغاوت دور کرے، تب فوج سے مخاطب ہوکر یہ الفاظ کہے تھے۔

Whoever falls into your hands is forfeit to you just as 1000 years ago the Huns under king Attila made a name for themselves, which is still in tradition and story.

یعنی ــــ "جو کوئی تمھارے ہاتھ پڑے وہ تمھارا ہو چکا۔ ایک ہزار برس گزرے جس طرح بادشاہ اٹلا نے اپنی فوج ہن سے قتل و غارتگری کی تھی اور نام پیدا کیا تھا جو اب تک روایتوں میں مشہور چلا آتا ہے اُسی طرح تم بھی نام پیدا کرو"ــ حال میں اسی لڑائی کے چھڑنے پر اسی شہنشاہ نے اپنی اسپیچ میں کہا تھا کہ ــــ "اگر جرمنی کو زمین پر جگہ نہ ملی تو آفتاب میں اُس کو رہنے کے لئے جگہ مل جائے گی"۔ کیا خدا کی شان ہے کہ جو قوم یہ بلند پروازی کرتی تھی کہ آفتاب میں جگہ ڈھونڈ رہی تھی اور عرش کے تارے توڑ رہی تھی، اُس کو یہ نیچا دیکھنا پڑا کہ سلطنت بڑھانا تو ایک طرف، جس قدر اُس کے مقبوضات غیر ملکوں میں تھے (جن کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل، یعنی ہندوستان کے رقبے سے ڈیوڑھے کے قریب تھا) وہ سب گرہ سے کھو بیٹھی۔

گولی مار دی۔ نامور (Namur) میں دو ہزار مرد، عورتیں، بچے قتل کیے گئے۔
بعض حصّوں میں مردوں کی آدھی آبادی نیست و نابود کر دی گئی۔

آپ نے وہ تصویریں دیکھی ہوں گی، جو کبھی کبھی باتصویر اخباروں میں چھپتی ہیں کہ جرمن کی فوج کی آمد کی خبر سُن کر لوگ اپنا اپنا مال واسباب لے کر اور عورتوں اور بچوں کو گاڑی اور ٹھیلے پر لادے ہوئے بھاگے جاتے ہیں کسی کا مال واسباب چھوٹ گیا۔ کسی کا کوئی بچہ رہ گیا۔ گھبراہٹ میں نہ مال کا خیال ہے، نہ سب کو ساتھ لینے ہی کی مجال ہے۔ کوئی مال واسباب چھوٹ جانے سے نالاں ہے۔ کوئی اپنے بچے کے بچھڑ جانے سے پریشان ہے۔ عورتیں اپنے شیرخوار بچوں کو گود میں لیے بھاگ رہی ہیں، وہ چیختے چلاتے ہیں۔ گھبراہٹ میں اُن کو دم دلاسا بھی نہیں دے سکتیں۔ زیادہ بوڑھوں کی سخت مشکل ہے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"۔ بیچاروں کی پیٹھ جھکی ہوئی ہے، سواری میسر نہیں ہے تو پیدل جا رہے ہیں۔ جوان آدمی ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں، گویا عصائے پیری بنے ہوئے ہیں۔ بعض جوان آدمی بوڑھوں کو پیٹھ پر لادے ہوئے ہیں۔ شاباش ایسے جوانوں کو جو بوڑھوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دس لاکھ آدمی بلجیم کے، جو کل ملک کی آبادی کا چھٹا حصّہ ہیں، وطن سے آوارہ ہو کر چلے گئے ہیں، جن میں سے پانچ لاکھ آدمی تو ہالینڈ میں ہیں اور پانچ لاکھ فرانس اور انگلستان آگئے ہیں، جہاں اُن کی خبر گیری اچھی طرح ہوتی ہے ؂

ظلم جرمن کا کہا حال ہے یہ تھوڑا سا — جس پہ اس دیو نے اپنا کبھی سایہ ڈالا
دشت غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا — دوست بھی چھوٹ گئے ملک بھی اپنا چھوٹا!

تیزی سے اور بہت بڑی سے بڑی فوج سے کیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی کیا کہ پیرس کی جانب لاکھوں فوج بھیجی اور فرانس کو کچھ وقت نہ دیا کہ وہ اپنی فوج جمع کرتا یا یہ کہ اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر کرتا۔ فرانس پر حملہ کرنے کی غرض سے Alsace Lorraine اور لکسم برگ کی سرحد کی طرف جرمنی پہلے سے ہر قسم کا سامان سال بسال جمع کرتا رہا تھا۔ رسد کا سامان، گھوڑوں کی گھاس، اسپتال میں مرہم پٹی کا سامان اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار زخمیوں اور بیماروں کے واسطے بستر، یہ سب کچھ جنگ سے چھ ہفتے پہلے سرحد پر تیار تھا۔ غرضکہ جرمنی ہر طرح سے جنگ کے واسطے تیار تھا۔ آلساس، لورین کی سرحد کی طرف ایسے مضبوط قلعے اور مورچے فرانس نے بنا رکھے تھے کہ جب تک ہفتوں بلکہ مہینوں تک اُن کا محاصرہ باقاعدہ نہ کیا جائے، جرمن اُن کو فتح نہیں کر سکتا تھا اور اُس کو اُنہی مشکلات کا سامنا تھا جو جاپانیوں کو پورٹ آرتھر فتح کرنے میں پیش آئیں۔ دوسرا راستہ فرانس پر حملہ کرنے کا لکسم برگ اور بلجیم کی طرف سے تھا۔ لیکن جرمنی نے کئی مرتبہ اس بات کی ضمانت کی تھی کہ کسی لڑائی میں ان دونوں ملکوں سے کوئی تعلق اور واسطہ نہ رکھے گا۔

لکسم برگ کے مختصر تاریخی حالات

لکسم برگ ایک چھوٹی سی ریاست ہے جو فرانس، جرمنی اور بلجیم کے درمیان واقع ہے۔ اُس کا رقبہ ایک ہزار مربع میل سے کم اور آبادی ڈھائی لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ اُس کا رقبہ Northampton county سے کچھ کم اور آبادی Bradford کی مردم شماری سے بہت کم ہے۔ قدیم زمانے

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہوگیا
آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہوگیا

جنگ عظیم پر دوسرا لکچر

۱۲ مارچ سنہ ۱۹۱۵ء سے ۹ مئی سنہ ۱۹۱۵ء تک یورپ کے مہابھارت معرکے میں، جو جنگ عظیم یا Great War کے نام سے موسوم ہے، جو خاص خاص اور اہم واقعات وحالات رونما ہوئے ان کو مشران صاحب نے حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا — ناظرین اگر گزشتہ لکچر کے ساتھ اس لکچر کو ملاحظہ فرمائیں تو جنگ عظیم کی مکمل تاریخ اور ممالک متحاربین کی سیاست ملکی پر عبور حاصل ہوسکتا ہے۔

بلجیم پر جرمنی کا حملہ

جب جرمنی نے فرانس کے مقابلے میں اعلان جنگ کیا تو اُس کے لئے فرانس پر حملہ کرنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ تو وہ تھا جدھر فرانس کے بہت قلعے سرحد کی حفاظت کی غرض سے بنے ہوئے تھے۔ دوسرا وہ راستہ تھا جدھر سے جانا جرمن قوم کے لئے معاہدے کے خلاف تھا یعنی بلجیم کی طرف سے۔ لیکن جرمنی نے اپنے عہد کو توڑا اور جو کچھ ضمانت کی تھی اُس کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا اور اس دوسرے راستے سے اپنی فوجیں لے گیا۔ جرمن نے جب کبھی فرانس پر حملہ کیا ہے تو یکایک اور بہت

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے تھے گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

یہ ریاست بہت عرصے سے صلح اور امن کی حالت میں رہی ہے اور یورپ کا نہایت سرسبز خطہ ہے۔ اس ریاست کی حاکم گرانڈ ڈچیس بذریعہ پارلیمنٹ جس میں عوام کے قائم مقام اور نیز امرا دونوں شامل تھے نہایت عمدگی سے آئین و قوانین کی پابندی کے ساتھ حکومت کرتی تھی۔ مدرسوں میں نہایت عمدہ تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ باشندے نہایت مرفہ حال تھے۔ جابجا عدالتیں قائم تھیں، حکام انتظام کے لئے مقرر تھے اور ہائی کورٹ بھی تھا۔ البتہ ایسی فوج نہ تھی جو دشمن کے حملے کو روک سکے لکسمبرگ صدیوں تک یورپ کی جنگاہ و رزمگاہ رہا۔ اُس کی سرحد پر حملوں پر حملے ہوتے رہے۔ بہ ۱۸۶۷ء میں جب کہ اُس کے پیچھے فرانس اور پرشا میں جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی، اُس وقت بادشاہان یورپ نے اُس کی حفاظت کر کے اُس کو بچالیا۔ ایک عہد نامہ اُس وقت لکھا گیا جس کی ضمانت برطانیہ، فرانس، پرشا نے کی جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ لکسمبرگ سے کسی کو کوئی واسطہ نہ رہے گا اور شاہان یورپ نے یہ ذمہ لیا کہ بوقت جنگ وہ کسی کی جانبدار نہ ہو گی۔

بلجیم کے مختصر تاریخی حالات

جرمنی کو بلجیم کی راہ سے بھی حملہ کرنے میں وہی مشکلیں تھیں۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے جہاں صدیوں سے جھگڑے اور قضیئے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ

میں اس مقام پر Spanish آسٹرین، فرینچ اور ڈچ کا قبضہ، وقتاً فوقتاً رہا اور پہاڑوں کو تراش کر اس کثرت سے قلعے اور فصیلیں بنائی گئی تھیں اور قلعوں پر توپیں چڑھا کر اُن کو ایسا مضبوط کیا گیا تھا کہ ۱۹ صدی کے وسط میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جبلُ الطّارق یعنی جبرالٹر (Gibraltar) کے سوا دوسرا کوئی مقام ایسا مضبوط نہیں ہے جس کا فتح کرنا سخت مشکل ہو۔ چونکہ یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ کسی وقت جرمنی کی طاقت ایسی بڑھ جائے گی کہ وہ تمام یورپ کو دھمکی دے گا اور اپنے عہد و پیمان کے خلاف عمل کر کے لکسم برگ پر حملہ کرے گا، اس لئے عہد نامہ لندن کے مطابق، جو ۱۸۶۷ء میں ہوا، اس شہر کے مضبوط قلعے اور شہر پناہ اور فصیلیں سب توڑ توڑ کر گرادی گئیں اور اُن کی جگہ پر نہایت خوشنما باغ لگا دیئے گئے جو انواع و اقسام کے پھول دار پودوں اور میوہ دار درختوں سے لہلہا رہے تھے اور کوثر و تسنیم کی طرح باغوں میں نہریں جاری تھیں اور وہ مقام تمام تر بہشت کا نمونہ بنا ہوا تھا، جہاں صبح شام ہزاروں آدمیوں کا ازدحام رہا کرتا تھا جن میں اہل جرمنی بھی نہایت کثرت سے شامل تھے۔ جو سیر و تفریح کی غرض سے وہاں جاتے اور سبزہ و گلشن کا نظارہ کرتے اور آسمان پر شفق کی بہار دیکھا کرتے تھے عجیب پُرکیف منظر تھا ؎

ٹھنڈی ہوائیں سبزہ کوہی کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک — ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک

پھولوں سے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گلفروش تھے

وہ سُرخیٔ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار — وہ بارور درخت وہ گلشن وہ سبزہ زار

مقابل تھا جہاں علم و ہنر کا مرکز تھا۔ یورپ کے بادشاہوں کی پناہ میں بلجیم کے باشندے، وہ مصیبتیں بھول گئے جو اُن پر گزری تھیں۔ کہیں کہیں قصبوں اور گاؤں میں اگلے ظلم و ستم کی نشانیاں لوگوں کو کبھی دکھائی دے جاتی تھیں۔ جیسے بعض آلات حرب جو نپولین کی فوج چھوڑ گئی تھی۔ پُرانے پستول جو سپاہیوں کی لوٹ مار کے وقت لوگ اپنی حفاظت کی غرض سے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اب یہ چیزیں صرف تاریخی یادگاریں اور پُرانی نادر چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ بلجیم کے باشندے دوست نواز، محبت کرنے والے اور کفایت شعار تھے اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی کاشت میں ترقی تھی اور زراعت کا سامان کثرت سے تھا اور گھروں میں اناج کے ذخیرے بھرے ہوئے تھے۔ اُن کے بال بچے بہت بے فکری کی حالت میں پرورش پاتے تھے۔ سب لوگ بھول گئے تھے کہ ہمارے ماں باپ کو کبھی حملہ آور فوج نے قتل کیا تھا یا ہماری عورتوں کی پردہ دری کی تھی۔ تمام دنیا کے سیاح آتے تھے اور اُن کے ملک کے سمندر کے کنارے، بلجین لکسم برگ اور وادی میوز (Meuse) وغیرہ میں سیر و سیاحت کرکے لطف اُٹھاتے تھے۔

شہنشاہ جرمن نے اپنے عہد و پیمان کے خلاف لکسم برگ اور بلجیم پر حملہ کر دیا، کیونکہ اس راستے سے فرانس پر فوج بھیجنے میں آسانی تھی۔ کوئی شخص خیال نہیں کر سکتا تھا کہ بلجیم جرمن کا مقابلہ کر سکے گا۔ بلجیم کا رقبہ جرمنی کے آٹھویں حصّے سے بھی کم ہے اُس کی فوج کمزور تھی اور اس قدر بھی نہ تھی کہ تین بڑے شہر اینٹ ورپ، لی ایثر اور نامور کی حفاظت اچھی طرح کر سکے۔ ان حالات پر نظر ڈالتے ہوئے جرمن کے فوجی افسر بلکہ یورپ کے مدبران سلطنت خواب میں بھی کبھی خیال نہیں کرتے تھے کہ

سرزمین مرغوں کی پالی سمجھی جاتی ہے اور اس کے لئے وجہ معقول ہے۔ یہاں مذہبی اور قومی لڑائیاں کثرت سے ہوتی رہیں۔ کیتھولک اسپین اور پراٹیسٹنٹ ہالینڈ کی مذہبی لڑائیاں بھی ہوئیں۔ یہیں نپولین نے واٹرلو، میں شکست کھائی۔ یہیں پہلے چرچل برٹش جنرل نے بمقابلہ فرانس کے جنگ بلےنہم (Blenheim) وغیرہ میں فتح حاصل کر کے ڈیوک آف مارل برا کا خطاب حاصل کیا۔ جب نپولین کے مقابلے میں لڑائیوں کا خاتمہ ہو گیا تب یورپ کے بادشاہوں نے چاہا کہ بلجیم میں امن وامان ہو۔ ایک عہد نامہ ۱۸۳۱ء میں لکھا گیا جس کی رو سے اس ملک کی خودمختاری قائم ہوئی۔ اسی عہد نامے کی تجدید ۱۸۳۵ء میں ہوئی اور برطانیہ فرانس اور پرشا اس کے فریق ہوئے اور یہ قرار پایا کہ کوئی بادشاہ بلجیم پر حملہ نہ کرے۔ نہ کوئی اُس کے مقابل میں مہم بھیجے اور نہ کوئی بادشاہ اپنی فوج اُس مُلک کے راستے سے نکالے۔ اس ضمانت اور ذمہ داری کی تجدید بادشاہوں کی طرف سے کئی مرتبہ ہوتی رہی۔

جب بادشاہوں کی طرف سے بلجیم میں امن وامان رکھنے کی یوں ذمہ داری ہوئی تو ملک میں نہایت ترقی اور مرفہ حالی ہوئی۔ نئے نئے کارخانے جاری ہوئے اور بڑے بڑے شہر مثل اینٹ ورپ (Antwerp) اور لی آیژ (Liege) کے، جہاں تجارت وصنعت کے کارخانے قائم ہوئے عالم وجود میں آگئے۔ بندر اینٹ ورپ دنیا میں بہت بڑی تجارت گاہ ہو گیا۔ قصبوں اور شہروں میں آبادیاں بڑھنے لگیں۔ برسیلز (Brussels) جو دارالسلطنت تھا، وہ پیرس کا نمونہ یعنی فردوس کا نمونہ بن گیا اور اُس کی سیرگاہوں اور خوشنما منظروں اور صنعت کے کارخانوں نے ہزاروں سیاح چاروں طرف سے کھینچ لیے۔ لوویَن (Louvain) گویا آکسفرڈ کا

جب جرمن فوج، جو ایک میجر کی کمان میں تھی Adolphe کے پل کے پار پہونچی تو ایک وزیر Myochen نام موٹر پر سوار سڑک پر راہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے ہاتھ میں اُس عہد نامے کی نقل تھی، جس کے رو سے لکسم برگ کی آزادی اور خود مختاری کی ضمانت بادشاہان یورپ نے کی تھی۔ یہ نقل اُس وزیر نے جرمن کے سردار فوج کو دکھائی جس نے یہ جواب دیا کہ ہم کو اس عہد نامے کا حال معلوم ہے لیکن ہم کو جو حکم ملا ہے، ہم اُس کی تعمیل کر رہے ہیں اور کریں گے۔ خود گرانڈ ڈچیس یعنی ملکہ لکسم برگ موٹر پر سوار اس موقع پر پہونچ گئیں اور سردار فوج سے کہا کہ ہمارے اور آپ کے باہم جو عہد و پیمان ہوا ہے اُس کے خلاف آپ کی طرف سے نہ ہونا چاہیے

؎ دست وفا در کمر عہد کن   تا نہ شوی عہد شکن جہد کن

لیکن اُس میجر نے جواب دیا کہ آپ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر جائیے۔ اُسی شام کو جرمن سفیر نے لکسم برگ کے وزیر سلطنت کو ایک تار دکھایا جو جرمن کے وزیر اعظم کی طرف سے تھا۔ جس میں یہ تحریر تھا کہ ہماری فوج لکسم برگ میں جو کچھ کر رہی ہے وہ دشمن کے طور پر نہیں کر رہی ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ریلوں کا سلسلہ جو جرمن ریلوں سے ملا ہوا ہے اُس کی محافظت کرے تاکہ فرانس حملہ نہ کرنے پائے۔ ذرا دیر میں جرمن فوج تمام شہر میں پھیل گئی۔ جا بجا سرحدوں پر فوج کے دستے متعین کر دیے گئے اور گھروں، کھیتوں، میدانوں اور جنگلوں میں جرمن ہی جرمن نظر آنے لگے۔ لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ کھیت اُجاڑ دیے گئے۔ مکانات مسمار کر دیے گئے۔ جھاڑیاں جنگل سب کاٹ ڈالے گئے۔ جا بجا مورچے بنائے گئے اور کسی نے نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا گیا۔ غرضکہ فوج کا قبضہ کیا تھا، گویا دیوؤں کا قبضہ پرستان پر تھا،

بیلجیم جرمنی کا مقابلہ کرسکے گا۔ اس کے علاوہ کچھ عرصے سے بیلجیم میں جرمنی کا اثر بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ اینٹ ورپ کے تجارتی معاملات سب جرمنی کے ہاتھ میں تھے۔ مالی معاملات میں، کارخانوں میں، تجارتی اسباب ملک سے باہر بھیجنے میں جرمن کا اثر نہایت غالب تھا۔ جرمنی میں جو لوگ بہت زیادہ سپاہیانہ جوش اور ملکی محبت رکھنے والے تھے وہ اُس وقت کا انتظار کررہے تھے کہ کب بیلجیم خود بخود جرمنی کی سلطنت میں آجائے گا، جیسے درخت سے میوہ پک کر زمین کے دامن میں گر پڑتا ہے۔ بعضوں نے یورپ کے نقشے بنائے تھے اور اُن میں بیلجیم کا سُرخ رنگ مثل جرمنی کے رکھا تھا گویا بیلجیم سلطنت جرمن میں شامل ہوگیا۔

۲؍ اگست ۱۹۱۴ء کو جرمنی نے چھ لاکھ فوج فرانس اور لکسم برگ کی طرف بڑھائی اور ارادہ کیا کہ نہایت تیزی اور سختی سے حملہ کیا جائے جس کا مقابلہ کرنا مشکل ہو بلکہ ناممکن۔ ۲؍ اگست سنہ مذکور کو صبح کے وقت جرمن فوج کے کئی دستے لکسم برگ میں داخل ہوگئے۔ کچھ فوج ریل سے، کچھ موٹروں کے ذریعہ سڑک کی راہ پہونچ گئی اور ریلوے، تار برقی، ٹیلی فون اور پل وغیرہ، جس قدر ذریعے آمد و رفت کے تھے سب پر قبضہ کرلیا۔ یہ تجویزیں سب پہلے سے سوچ لی گئی تھیں اور ان پر عمل کرنے والے وہ اشخاص تھے جو لکسم برگ کے کارخانوں اور گوداموں میں محرر اور گماشتے رہ چکے تھے اور اس وقت وردی پہنے ہوئے جرمن فوج میں افسر تھے۔ ان افسروں نے اُن باشندوں کا پتہ نشان دیدیا جو جرمن کی فوجی خدمت کے لائق تھے جیسے آلساس کے باشندے جو جلاوطن کردیے گئے تھے اور جنھوں نے جرمنی کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ یہ سب گرفتار کرلیے گئے۔

پس نہایت تیزی سے کام کرنا چاہیئے، جس کے مشتاق جرمن بہت زیادہ ہیں۔ برطانیہ کے سفیر نے سمجھایا کہ بلجیم پر حملہ کرنے کے نتیجے بہت افسوس کے قابل ہوں گے اور اب بھی باز آنا چاہیے۔ لیکن جرمنی کے وزیر خارجہ نے جواب دیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ناچار برٹش سفیر اُسی شام جرمنی کے محکمۂ خارجہ میں گیا تاکہ الٹی میٹم پیش کرے۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ رات کے بارہ بجے کے اندر جرمن کی طرف سے یہ ضمانت ہونا چاہیئے کہ فوج اب آگے نہ بڑھے گی اور بلجیم پر حملہ کرنے سے باز رہے گی ورنہ برٹش گورنمنٹ تیار ہے کہ اپنا وعدہ پورا کرے، خصوصاً جبکہ خود جرمنی نے کہا ہے کہ بلجیم کی سلطنت کو بحال اور خود مختار رکھیں گے۔

جرمن وزیر نے جواب دیا کہ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہماری فوج بلجیم سے گزر جائے۔ برٹش سفیر نے سمجھایا کہ اس کے نتیجے بہت افسوس کے لائق ہوں گے۔ ع۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی — مگر جتنا اصرار برطانیہ کی طرف سے ہوتا گیا، جرمن کی طرف سے جواب میں انکار تھا۔ ناچار برٹش سفیر نے جرمن کے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ اُس نے ایک داستان چھیڑ دی کہ ایک ذرا سے کاغذ کے پُرزے کے پیچھے برطانیہ ایک ہمجنس قوم یعنی جرمن سے لڑنا چاہتا ہے اور ہم برطانیہ سے دوستی کے سوا کوئی اور برتاؤ نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ گویا اس وقت یہ کر رہا ہے کہ ایک شخص کو، جو دو حملہ آوروں میں گھرا ہوا ہے پیچھے سے آکر مارنا چاہتا ہے۔ اس لئے برطانیہ اُن سب نتیجوں کا ذمہ دار ہے جو آئندہ ظہور میں آئیں گے۔ برٹش سفیر نے جواب دیا کہ برطانیہ کی، یہ زندگی اور موت کا معاملہ ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے اور بلجیم کی خود مختاری قائم رکھنے کے واسطے انتہائی کوشش کرے

جن کے سائے سے سب لوگ بھاگتے تھے اور جنھوں نے ایک دم میں لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔

دوسرے دن یعنی تین اگست بروز دوشنبہ جرمن سفیر نے بیلجیم کو ایک الٹی میٹم (یعنی پیام آخری) بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا کہ بیلجیم اپنے ملک میں جرمنی افواج کو مرور کا راستہ دے جس کے بدلے میں بیلجیم اور اُس کے مقبوضات یعنی سب علاقے بحال اور برقرار رہیں گے ورنہ انکار کی حالت میں بیلجیم کے ساتھ دشمن کے طور پر برتاؤ کیا جائے گا۔ اس الٹی میٹم کا جواب بارہ گھنٹہ کے اندر مانگا گیا۔ بادشاہ بیلجیم نے شاہ برطانیہ سے اپیل کی کہ بیلجیم کی آزادی کو برقرار رکھنے میں مدد کیجیے۔ جس کے جواب میں برطانیہ نے جرمن کو اطلاع دی کہ بیلجیم سے جو ہمارا عہد وپیماں ہے اُس کو پورا کرنے کے لئے ہم تیار ہیں اور اُس کی مدد کرنے میں اگر تلوار کا کام پڑے گا تو دریغ نہ کریں گے جب بارہ گھنٹے گزر گئے اور شاہ بیلجیم نے جرمن کے مطالبات کو قبول نہ کیا تب جرمن کی فوج بیلجیم کی سرحد کے اندر گھس پڑی تب سر ایڈورڈ گوشین (Sir Edward Goschen) برٹش سفیر نے Herr von Tagow جرمن کے وزیر خارجہ سے دریافت کیا کہ آیا جرمن گورنمنٹ بیلجیم کی Neutrality کا خیال رکھے گی؟ جس کا جواب یہ ملا کہ ”نہیں۔ ہماری فوج سرحد کے پار جا چکی ہے اور مجبوراً ہم کو بیلجیم کے راستے سے جانا پڑا کیونکہ سب سے آسان اور قریب کا راستہ فرانس جانے کے واسطے چاہتے ہیں تاکہ وہاں پہونچتے ہی دن سے حملہ کر دیں اور فرانس کے مقابلے میں کوئی نمایاں فتح حاصل کریں“ فوج جرمن کو اندیشہ تھا کہ اگر دور کے راستے سے فوج فرانس پر جائے گی، تو دیر کے سبب روس کو موقع ملے گا کہ اپنی بے شمار فوج جرمنی کی سرحد تک پہونچا دے۔

شہر ہے، جس میں نہایت دلکش اور دلچسپ منظر ہیں اور ایک تاریخی مقام بھی ہے۔ باشندے نہایت آزاد مزاج ہیں، صنعت و حرفت کا مرکز ہے، جہاں صرف توپوں کے ڈھالنے والے چالیس ہزار کاریگر ہیں۔ یہاں سے رائفل بن کر اکثر ملکوں میں جاتے ہیں اور بڑی توپیں بیلجیم کے واسطے ڈھالی جاتی ہیں۔ لوہے کے کارخانوں میں ریل کے انجن اور موٹر کار وغیرہ بنتے ہیں۔ عمدہ اور نفیس سرکاری عمارتیں، گرجے اور مدرسے ہیں جو ایسی خوش اسلوبی سے بنے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والے عش عش کرتے ہیں۔ اینٹ ورپ سے دوسرے درجے پر لی ایثر نہایت مضبوط اور محفوظ مقام ہے۔ شہر کے گرد اکتیس ۳۱ میل کے محیط میں بارہ قلعے نہایت مضبوط ہیں جو دریائے میوز کے داہنے اور بائیں کنارے پر واقع ہیں، اور ان پر توپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ پہلے اس مقام کو ۱۴۶۸ء میں چارلس دی بولڈ، ڈیوک آف برگنڈی نے فتح کیا تھا۔ اُس وقت سے انیسویں صدی کے شروع تک اُس کا حال دہلی کی طرح رہا۔ مختلف قوموں نے کم سے کم دس دفعہ اُس کو فتح کیا اور ہر دفعہ باشندے قتل کیے گئے اور مال و اسباب لوٹا گیا اور عمارتیں گرائی گئیں۔ جنرل لے مان (Lehmann) یہاں کے بارھوں قلعوں کا محافظ تھا، جس نے، فوج کثیر جمع کر کے ان کو خوب مضبوط کر لیا تھا۔ یہ شخص یورپ میں بطور عالم ریاضیات کے، نزدیک و دور معروف و مشہور تھا اور فوجی مدرسے میں پروفیسر اور ممتحن تھا۔ شہنشاہ جرمن کا خیال تھا کہ یہ شخص سپہ سالاری کے لئے موزوں نہ ہوگا، مگر اس عجیب و غریب شخص نے ثابت کر دیا کہ کتابوں کا پڑھنے والا میدان جنگ میں بھی اعلیٰ درجے کا جنرل ہو سکتا ہے۔

ورنہ آیندہ برطانیہ کا اعتبار جاتا ہے اور کوئی اُس کے وعدے کو معتبر نہ سمجھے گا۔ غرضکہ جب برٹش سفیر نے دیکھا کہ بحث کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آگ پر تیل ڈالا جائے، تو اُس نے خاموشی اختیار کی اور اپنے واسطے پروانۂ راہداری طلب کیا۔

دوسرے دن جرمن فوج کو، جو موٹر کاروں پر سوار، حکم کا انتظار کر رہی تھی، حکم ملا کہ ایک دم سے آگے بڑھ کر بلجیم کی ریلوں پر قبضہ کر لو اور ملک کے اندر گھستے ہوئے فرانس کی جانب بڑھو۔ فوج یہ سمجھتی تھی کہ سخت مقابلہ پیش نہ آئے گا کیونکہ اُس کے افسروں نے یقین دلایا تھا کہ بلجیم کے باشندے دوستانہ طریق پر ہمارا استقبال کریں گے، لیکن وہ اس کے برخلاف فوراً مقابلے پر تیار ہو گئے اور پیشتر اس کے کہ جرمن موٹر کاریں، جن کی تعداد تین ہزار کہی جاتی ہے، آگے بڑھیں، اہل بلجیم نے دریائے میوز کے سب پُل توڑ دیے اور ہر گاؤں اور ہر قصبے کی طرف سے سخت مقابلہ جرمن کو پیش آیا۔ بلجیم کے سب باشندے ایسے باہم متفق ہو گئے کہ گویا جان ایک ہے اور قالب جدا جدا۔ آپس میں جس قدر نااتفاقیاں تھیں، سب بھول گئے اور امیر سے فقیر تک یکدل و یکجان ہو کر جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ عورتوں نے مردوں سے بھی زیادہ قومی جوش اور ہمت ظاہر کی۔

پہلے شہر لی آیژ بیچ میں پڑا، جدھر سے جرمن کا لشکر جا رہا تھا اور ضرور ہوا کہ یا تو وہ شہر لاپچ دے کرے لیا جائے یا فتح کیا جائے۔ یہ مقام بلجیم کا برمنگھم (Birmingham) سمجھا جاتا ہے اور بہت مشہور اور پُرفضا

قصبہ وِسی جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ جب جرمن فوج پہلے وِسی میں داخل ہوئی تھی،
اس وقت قصبہ وِسی بہت ہرا بھرا دکھائی دیتا تھا۔ چند گھنٹوں میں راکھ کا ڈھیر
ہو گیا۔ جو امیر تھے وہ فقیر ہو گئے۔ بچّے اپنے ماں باپ کے لئے چلاتے پھرتے تھے۔
مائیں اپنے بچوں کو ڈھونڈھتی پھرتی تھیں۔ یتیم بچے ہالینڈ کی سرحد کی طرف چلے گئے
کہ وہاں جا کر پناہ لیں اور وہاں کے باشندوں کی رحمدلی پر بھروسا کر کے گزارا کریں۔
بلجیم کی فوج پھر لی آیشر کی طرف ہٹ آئی اور راہ میں جو چیز سامنے آئی
اُس کو برباد کر دیا۔ مثلاً پُل، سُرنگ، ریل کی سڑکیں اور ریل کی گاڑیاں وغیرہ تاکہ
وہ دُشمن کے ہاتھ نہ آئیں۔ گاؤں کے گاؤں جلا دیے تاکہ وہاں جرمن کو پناہ نہ ملے۔
جب جرمن کی فوج آئی تو اُمید کے خلاف اُنھوں نے دیکھا کہ ہم سے سخت نفرت
رعایائے بلجیم کو ہے اور قدم قدم پر ہمارا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تب جرمن نے مکانات
جلانا شروع کیے اور لوگوں کو گولیاں ماریں اور ہر طرح کی وحشیانہ حرکتیں کیں۔
ان لڑائیوں میں جرمن کا نقصان بمقابلہ بلجیم بہت زیادہ ہوا، لیکن جرمنی کی فوج
ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ اگر کئی سو اُس میں سے مارے بھی گئے تو کیا کمی ہو سکتی تھی۔
اُنھوں نے دریائے میوز کے پار اُترنا چاہا اور بیپوں کا پُل باندھا۔ اِدھر سے بلجیم کے
قلعوں سے فیر ہونے شروع ہو گئے اور آگ برسنے لگی۔ گولہ انداز ایسے ٹھیک شست
باندھ کر نشانے لگاتے تھے کہ ہر گراب تیر قضا کی طرح اپنا کام کرتا تھا۔ ایسے قدر انداز
تھے کہ جس جگہ سیدھ باندھ کر نشانہ لگاتے تھے، وہیں لگتا تھا اور کبھی خطا نہ کرتا تھا۔
یہاں تک کہ پُل جو جرمن نے باندھا تھا اُس کے ٹکڑے اُڑا دیے، لیکن تب بھی جرمن نے
کچھ پرواہ نہ کی اور پُل کو چھوڑ کر دریائے میوز میں کشتیاں ڈال دیں اور آناً فاناً دریا کو

۴ر اگست، منگل کے دن جرمن فوج لی ایشر کی طرف بڑھی۔ اس وقت عجیب بارونق اور عالیشان منظر نظر کے سامنے تھا۔ جرمن فوج آہستہ آہستہ دریائے میوز کی طرف بڑھتی چلی آتی تھی اور بے شمار توپوں اور موٹر گاڑیوں کو ساتھ لیے آتی تھی۔ سب سپاہی سبز، دھانی زرق برق وردیاں پہنے ہوئے تھے، جو سب نئی تہ درز اور عمدہ فیشن کی تھیں۔ ہر سپاہی کے ہتھیار برقدم چمک رہے تھے اور ہر چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک فتحمند فوج، بڑے جلوس کے ساتھ مارچ کرتی ہوئی آرہی ہے۔ ایک انگریزی لڑکی نے اُس فوج کو دیکھ کر ٹھیک کہا تھا They looked like soldiers on the stage یعنی یہ لوگ تھیٹر کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔

قصبہ دسی چونکہ بیچ میں پڑتا تھا اس لئے جرمن نے پہلے اُس پر قبضہ کرنا چاہا۔ بلجیم اور جرمن سواروں میں مڈبھیڑ ہوئی، لیکن بلجیم سواروں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ پھر چارسو پیدل بلجیم کی فوج کیشر کے مقابلے میں آئے اور ریل کے پل کی دو محرابیں توڑ دیں اور قصبہ دسی کو بچانے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ گو نہایت بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن قسمت نے مدد نہ کی اور اُن کو لی ایشر کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا سہ

تجربت بے فائدہ است آں راکہ کج گردید بخت

حملہ آوردن چہ سود آں راکہ برگردید زیں

جرمن نے اس کا بدلہ بہت سخت لیا، یعنی برگوماسٹر کو دیوار کے برابر کھڑا کر کے گولی ماردی۔ بہت آدمی جو سپاہی نہ تھے، نہ وردی پہنے ہوئے تھے، مگر اُن کے پاس ہتھیار دکھائی دیے یا ہتھیار ہونے کا شبہ تھا، وہ سب قتل کر دیے گئے،

کیا بلجیم نے مخالف کو پست ہوئی جرمنی کو مکمل شکست

دوسرے دن یعنی ۵ راگست کو جرمن کی فوج نے قلعوں پر گولے برسائے۔ نشانے بہت ٹھیک تھے، لیکن چھوٹی توپوں کے باعث اثر بہت کم ہوا۔ تب جرمن بہت بڑا لشکر لے کر آگے بڑھے اور چاہا کہ قلعوں پر دھاوا کریں، لیکن بلجیم کی بڑی توپوں نے گراب کا مینہ برسایا۔ جرمن اور آگے بڑھے تب مشین گنوں سے اُن پر فیر کیے گئے۔ اس پر بھی جرمن نہ رُکے اور مورچوں کی طرف بڑھتے چلے گئے، جو قلعوں کے درمیان تھے۔ ادھر ان کا آنا تھا کہ بلجیم کی پیدل فوج سنگینیں ہاتھ میں لے کر مورچوں سے باہر کود پڑی اور ٹھنڈے لوہے کا مزہ بھی دشمن کو چکھا دیا۔ موت کا بازار گرم ہونے لگا۔ جرمن فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے اور نہایت ابتری کی حالت میں پیچھے ہٹے۔ جرمن کے سردار فوج نے ۲۴ گھنٹے کی مہلت مانگی کہ اپنے مردے دفن کریں۔ لیکن بلجیم کے جنرل نے یہ سوچ کر کہ مہلت لینے میں دشمن کا فائدہ ہے اور زیادہ بھاری توپیں لانے کے واسطے فرصت چاہتا ہے، مہلت کی درخواست نامنظور کی۔ تب جرمن سواروں کی ایک چھوٹی جماعت، جن میں دو افسر اور چھ سپاہی تھے، انگریزوں کے بھیس میں اس ارادے سے نکلے کہ جنرل لے مآن کو ہلاک کریں اور انگریزی زبان میں لوگوں کو سلام کرتے ہوئے بلجیم کے صدر مقام پر پہونچ کر کہنے لگے کہ ہم برٹش افسر ہیں، جو لی ایتر بچانے کے واسطے آئے ہیں اور جنرل لے مآن سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن مارشان (Marchand) نے اُن پر شبہ کر کے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ جرمن سوار بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن بلجیم کے فوجی افسروں نے اُن کا پیچھا کیا اور بندوقیں سر کر کے اُن سب کو ہلاک کر دیا۔

کشتیوں میں عبور کرکے، ہوائی جہازوں کے ذریعہ لی آیشر پر گرداوری کی اور رات کے وقت لی آیشر کی طرف بڑھتے ہوئے قلعوں کے قریب کھلے میدانوں میں پہونچ گئے کہ یکایک بھق سے روشنی ہوگئی جس سے تمام میدان جگمگا اُٹھا اور تمام فوج جرمن پر گویا بجلی گر گئی۔ قلعوں پر سے توپوں کی باڑھ پڑنے لگی اور گراب کا مینہ برسنے لگا۔ توپوں کی وہ گرج تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوہ آتش فشاں پھٹ گیا ہے۔ اور زمین زلزلے میں آگئی ہے۔ فوج جرمن اُس روشنی کے باعث، جو بجلی کی طرح اُن پر گری، چکاچوند میں آگئی اور یہ دیکھ کر کہ بھاگنے کی راہ ہے نہ مقابلے کی طاقت، ہکّی بکّی ہوگئی اور جس طرح جانور ذبح خانوں میں جاکر گھبرا جاتے ہیں، اسی طرح فوج جرمن گھبرا گئی اور جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ نکلا۔ ہزاروں جرمن ہلاک اور زخمی ہوئے۔ تمام میدان میں لاشیں بچھ گئیں اور کشتوں کے پشتے لگ گئے اور زمین خون سے رنگین ہوگئی۔ اس دستہ فوج میں سے ایک جرمن بھی اپنے لشکر کو واپس نہ جا سکا۔ چند سپاہی جو زندہ بچے وہ قید کر لیے گئے۔

نظم

ہوئے دونوں لشکر جو سرگرم کیں	گیا شور تا آسمان بریں
یہ کیونکر کہوں میں کہ پیکار تھی	قیامت وہاں اک نمودار تھی
ہوئے کشتہ جنگ آوراں بے شمار	زمیں اُن کے خوں سے ہوئی لالہ زار
ہوا جمع توپوں کا ایسا دھواں	بنا آسماں اک تہ آسماں
رہی جب نہ تاب سکون و قرار	کیا فوج جرمن نے رن سے فرار
سپاہیں گریزاں ہوئیں اس طرح	کہ آندھی میں برگ خزاں جس طرح

اس لئے جنرل لے مآن نے ارادہ کیا کہ قلعوں کو آخر وقت تک بچانا چاہیے۔ لیکن جرمن نے جواب دیا کہ ہمارے سب مطالبے منظور کر دو ورنہ کچھ بھی نہ مانو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ انکار کی حالت میں شہر پر گولا برسایا جائے گا۔ اسی رات کو آٹھ بجے سے شہر لی آیژ پر گولا برسنے لگا۔ بلجیم کی فوج نے اپنے افسروں کے حکم کے مطابق، ہتھیار رکھ دیے اور شہر کی رعایا میں سے جس کے پاس ہتھیار تھے، سب کو حکم دیا کہ ہتھیار حوالے کر دو۔ چنانچہ جب جرمنی کی فوج شہر میں آئی تو کسی نے مقابلہ نہ کیا۔

جرمنی میں اس فتح کی بڑی خوشی منائی گئی۔ قیصر جرمن نے اپنی رعایا میں اس فتح کی خبر کو مشتہر کر دیا۔ شہر لی آیژ تو حوالہ کر دیا گیا لیکن قلعے اب تک سخت مقابلہ کرتے رہے۔ جرمن نے شہر کے نامی آدمیوں میں سے سترہ اشخاص بطور ضامن کے گرفتار کر لیے، جن میں شہر لی آیژ کا، لاٹ پادری بھی تھا اور اُن سے کہا کہ اگر ہماری فوج کو کسی نے نقصان پہونچایا تو تم ذمہ دار ہو۔ اس کے بعد اہل جرمن نے اپنی حفاظت کا انتظام کیا۔ ہر عمدہ موقع پر توپیں لگا دیں۔ مورچے بنائے گئے۔ ناکہ بندی کر دی گئی۔ فوج پر فوج جرمن کی آتی گئی اور لوگوں کے گھروں میں گھستی گئی۔ جو اسباب چاہا دہ لے لیا۔ اگر کسی نے مقابلہ کیا تو اُس کا گھر فوراً جلا دیا اور اُس کو قتل کر دیا۔

لی آیژ حوالے کر دینے کے بعد قلعے سخت مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن تجربہ کار جنرل لے مآن خوب سمجھتا تھا کہ بغیر میدانی فوج کے قلعے کب تک مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جرمن بڑے ہاؤ اٹزر (Howitzer) لائے، جن کا گولا اتنی دور سے نشانہ مارتا تھا کہ وہاں تک قلعوں کے گولے پہونچ نہیں سکتے تھے۔ ایسے ہاؤ اٹزر

۶ر اگست کو جرمن کی فوج کثیر نے پیپوں کا پل باندھ کر دریائے میوز کو عبور کرلیا۔ پل ایسے موقع پر باندھا گیا جو ہالینڈ کی سرحد سے قریب تھا اور وہاں تک بیلجیم کے قلعوں کے گولے پہونچ نہیں سکتے تھے۔ جرمن اب اپنی بڑی توپیں، جو محاصرے کے کام کی تھیں، لے آئے۔ اُن کے ہوائی جہازوں نے بیلجیم کے ہوائی جہازوں پر غلبہ حاصل کرلیا اور بیلجیم قلعوں کے آہنی گنبدوں پر بم کے گولے گرانے لگے اور اُن کی فوج نے دھاووں پر دھاوے کرنے شروع کیے۔ گو بیلجیم کی توپیں آگ برسا رہی تھیں اور حملہ آوروں کو بھاڑ کی طرح بھونے ڈالتی تھیں، لیکن جرمن کچھ پرواہ نہ کرتے تھے اور آگے بڑھتے چلے آتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے ؎

تا سر نہ ہم پا نہ کشم از سر کوئیت نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

بعض موقعوں پر جرمن فوجوں نے وہی کیا جو جاپانیوں نے Leaoyoung پر حملے کے وقت کیا تھا۔ یعنی یہ کہ اپنے سپاہیوں کے پشتے لگا دیے اور اس کو فصیل قرار دے کر، اُس کے پیچھے ذرا دم لے لیا اور پھر آگے بڑھے۔

لی آیئر کے باشندوں نے یہ چاہا کہ اُن کے شہر کی عمدہ عمارتیں اور خوشنما سڑکیں سب مسمار نہ ہوجائیں۔ اُنھوں نے اپنے جنرل لے مآن سے درخواست کی کہ جرمن کو یہ ترغیب دو کہ شہر کو مسمار نہ کریں۔ اہل بیلجیم کی ایک کانفرنس بیٹھی جس میں بیلجیم کے سول حکام اور فوجی افسر اور جرمن کا ایک قائم مقام سب شریک تھے۔ جرمن کا مطالبہ بہت سادہ لفظوں میں تھا، یعنی یہ کہ شہر مع قلعوں کے ہم کو فوراً دیدو۔ جنرل لے مآن نے سول حکام کے دباؤ سے جرمن کو اجازت دیدی کہ شہر لی آیئر پر قبضہ کرلو اور اُس پر گولے نہ برساؤ۔ اب رہے قلعے، وہ سب صحیح و سالم تھے،

پڑ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اُس کے نائب نے کہا کہ اس جنرل کی عزت کرو، یہ مر گیا ہے۔
اصل میں جنرل دے ماں مرا نہ تھا بلکہ بیہوش تھا۔ جب اُس کو ہوش آیا تب اُس
نے اُس جرمن افسر کے سامنے تلوار پیش کی، لیکن جرمن افسر نے قبول کرنے سے
انکار کیا اور کہنے لگا "Military honour has not been
violated by your sword, keep it." یعنی یہ کہ آپ کی تلوار نے
سپاہیانہ اعزاز میں کچھ فرق نہیں آنے دیا، اسے اپنے پاس رکھئے۔ اُس وقت تک
جنرل دے ماں کو ضبط رہا تھا لیکن ان الفاظ کو سُن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
فرانس کے پریسیڈنٹ نے شہر لی اتیر کو بہادری کے صلے میں Legion of Honour
کی عزت بخشی جو اس سے پہلے صرف ایک اور شہر کو حاصل ہوئی تھی۔

برٹش افواج کی روانگی

اور بُلوُن (Boulogne) میں، فرودگاہ

اب برطانیہ کی امدادی فوج کا حال لکھا جاتا ہے جو انگلستان سے روانہ
ہو کر بندر بُلوُن میں اُتری۔ وہیں فرنچ نے اُس کا استقبال کیا اور وہیں سے فوج
میدان جنگ کو روانہ ہوئی۔ جب بُلوُن میں داخل ہو گئی تب برٹش پبلک کو اس کی
خبر ہوئی۔ خود فوج کو معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں جاتے ہیں۔ جب ریل پر سوار ہوئی تو
انجن چلانے والوں کو آگہی نہ تھی کہ آخری منزل کہاں ہوگی اور جب Southampton
سے جہاز پر سوار ہوئی تو اُس وقت یہ گمان ہوا کہ فرانس کو جا رہے ہیں، تاہم یہ ٹھیک
خبر نہ تھی کہ کس مقام پر اُتریں گے۔ روانگی کے وقت کسی انگریزی یا فرنچ اخبار نے

جاپانیوں نے روس کے مقابلے میں استعمال کیے تھے اور بڑی کامیابی کے ساتھ۔
جرمنی نے جاپان کی لڑائی کے بعد کرپ (Krupp) کے کارخانے میں بڑے
زبردست ہاؤائٹرز خفیہ طور پر تیار کرائے تھے، جن کا قطر سترہ انچ کا تھا۔ اِدھر تو
ان توپوں کی مار پڑی، اُدھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ بم کے گولے قلعوں پر برسائے
گئے۔ اس کے سوا گولوں کا دھواں ایسا سخت تیز اور تلخ تھا کہ اہل قلعہ اُس سے
بے ہوش ہوئے جاتے تھے، اس پر طرہ یہ کہ رسد اور سامان جنگ کی بھی کمی تھی۔
ان وجھوں سے اہل قلعہ عاجز آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد ایک قلعہ فتح ہو گیا
پہلے سمجھا گیا تھا کہ بلجیم کے قلعے ایک دن سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکیں گے، لیکن
قلعوں کے بہادروں نے پندرہ دن تک وہ سخت مقابلہ کیا کہ جرمن کے دانت کھٹے
کر دیے اور ہزاروں آدمی ہلاک کر دیے، جس سے دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور
گو اہل جرمنی نے فتح پائی لیکن یہ ویسی فتح تھی جو کیخسرو (Xerxes) نے لاکھوں
فوج سے بمقابلہ لیاؔنی ڈس (Leonidas) کے یونان میں حاصل کی تھی جس کے
ماتحت صرف تین سو بہادروں کی جماعت درہ تھرماپلی (Thermopylæ)
میں تھی کہ جب فتح کے بعد فوج کا نقصان شمار کیا تو ایک آہ سرد دل پُر درد سے کھینچ کر
کہنے لگا کہ "One such victory more and I am undone."
یعنی یہ کہ اگر مجھے ایک ایسی فتح اور حاصل ہو تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

جنرل لے مانؔ کا حال ایک جرمن افسر نے خود چشم دید لکھا ہے، یعنی یہ کہ جب
قلعے کا میگزین جرمن فوج نے اُڑا دیا، تو قلعے میں جرمن سپاہی داخل ہوئے۔ دیکھتے
کیا ہیں کہ جنرل لے مانؔ اینٹوں پتھروں کے ڈھیر میں پڑا ہوا ہے۔ اُس کا چہرہ کالا

—— یہ معلوم ہوتا تھا کہ فوج میدان جنگ کو نہیں جا رہی ہے بلکہ بڑی خوشی کا
جلسہ ہے، جس میں شریک ہونے کے واسطے لوگ قصبوں اور شہروں سے اُمڈ پڑے
ہیں اور اس شاندار اور دلچسپ مقام میں جمع ہو گئے ہیں. تمام شہر بلون خوشنما جھنڈیوں
سے آراستہ تھا اور جا بجا برطانیہ، فرانس اور بلجیم کے نشان اور جھنڈے لہرا رہے تھے۔
فرینچ فوج جب بلجیم کے میدان میں جانے کے لئے تیار ہوئی تو سپاہیوں کی بہنیں ،
مائیں اور بیویاں آئیں جن کی آنکھوں میں فخریہ جوش اور جدائی کے سبب آنسو بھرے
ہوئے تھے اور سپاہیوں کے بوسے لیتی تھیں گویا اُن کو رخصت کرتی تھیں۔ برٹش فوج
مع فرینچ فوج کے ۱۳ اگست کو بلجیم کی طرف روانہ ہوئی اور دس روز تک یہ فوجیں
اسی طرح روانہ ہوتی رہیں۔ لوگ ان کو دیکھ کر یہ کہتے تھے کہ ایسے گرانڈیل، خوبصورت،
چست و چالاک، تنومند اور مضبوط جوان لڑائی پر جا رہے ہیں، اس کو فال نیک
سمجھنا چاہیئے۔ جس وقت فوج برطانیہ سے روانہ ہوئی تو حضرت جارج پنجم کا فرمان
شاہی Southampton میں سنایا گیا جو حسب ذیل تھا۔

You are leaving home for the safety and honour of my Empire. Belgium, which country we are pledged to defend, has been attacked and France is about to be invaded by the same powerful foe. I have implicit confidence in you, my soldiers. Duty is your watch-word and I know your duty will be nobly done. I shall follow

ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا اور سبھوں نے مصلحتہً خاموشی اختیار کی تھی۔ بُلوُن میں پہونچکر یہ ممکن نہ تھا کہ فوج کے استقبال کے لئے جو انتظام ہوے تھے وہ پوشیدہ رہتے۔ جب فوج فرانس میں آگئی تب بھید چھپانے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

یہ فوج Highlanders کی تھی جس کے دیکھنے کے لئے دو دکانوں اور گھاٹوں سے دوڑ دوڑ کر لوگ آگئے تھے اور سڑکوں پر پرے باندھے ہوئے کھڑے تھے اور اُن کو دیکھکر نعرۂ خوشی بلند کرتے تھے۔ ہر سپاہی نہایت کڑیل جوان معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر دھوپ کا اثر تھا کیونکہ اسکاٹ لینڈ میں بہت زیادہ چلنا پڑا تھا۔ دلوں میں خوشی اور چہروں پر مسکراہٹ تھی اور داہنے بائیں تعجب سے اُن مچھلی پکڑنے والے مردوں اور عورتوں کو دیکھتے جاتے تھے جو بُلوُن کے گھاٹ پر جمع تھے اور کنارے پر پانی کی موجوں اور جہازوں پر نہایت خوشی سے نظر ڈالتے تھے۔ جہاں فوج کا کیمپ تھا، وہ ایک نہایت پُرفضا مقام، تفریح گاہ خاص و عام تھا۔ میدانوں میں خیمے لگائے گئے تھے جہاں سے پہاڑیوں کا نہایت خوشنما منظر دکھائی دیتا تھا۔ جن پر سبز گھاس، کا فرش زمردیں بچھا ہوا تھا اور آسمان نیلگوں شامیانے تانے ہوئے تھا۔ سمندر کی طرف سے صاف اور ٹھنڈی ہوا آرہی تھی اور پہاڑیوں کے آبشاروں کی آوازیں، دور کے نغموں کی طرح خوش آیند معلوم ہوتی تھیں ؎

کشیدہ بر سر ہر کوہسارے — زمردگوں لباسطے مرغزارے
بہر جا سبزہ از خاکش دمیدہ — زُرخ خوباں بہ پیش خط کشیدہ
عبارش آب و رنگ چہرہ گُل — گیاہش دلربائے زلف سنبل

بلجیم میں امدادی فوج کے دیر میں پہونچنے پر اعتراض اور جواب

اہل بلجیم اور اکثر اُن کے دوست انگریز وغیرہ، یہ سوال کرتے ہیں کہ کیوں برطانیہ اور فرانس نے اپنی فوجیں، پہلے بلجیم میں نہ بھیج دیں کہ وہ دریائے میوز پر جرمن کو روکیں اور اُن کو عبور نہ کرنے دیں اور بلجیم کی تباہی جو امدادی فوجیں پہونچنے سے پہلے ہوئی وہ نہ ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرانس میں بڑے بڑے فوجی سرداروں کو یقین تھا کہ اگر بلجیم کی سرحد کو، جنگ کا صدر مقام بنایا جائیگا تو بلجیم اور فرانس ہمیشہ کے لئے پامال ہو جائیں گے۔ جرمن کا مقصود تو یہ تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے پیرس میں پہونچ جائے اور فرانس کی طاقت کو بالکل توڑ دے بیشتر اس کے کہ روس اپنے دوست فرانس کو مدد دے سکے۔ اور فرانس کا ارادہ یہ تھا کہ جرمن کے حملے کو روکے اور پھر جواب میں جرمن کے علاقوں پر حملہ کرے سنہ ۱۸۷۰ء سے فرانس نے دو خیال اپنے ذہن میں نقش کر رکھے تھے۔ ایک یہ کہ آلساس لورین کو دوبارہ فتح کرے جو اُس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اسی وجہ سے فرانس نے اپنی فوجیں پوربی سرحد پر جمع کیں، یعنی بیلفور (Belfort) سے لانگوی (Longwy) تک ــــ اور دوسرا خیال یہ تھا کہ کسی حال میں اپنی فوجیں جا بجا تقسیم نہ ہونے دے، بلکہ ایک جگہ جمع رکھے تاکہ طاقت کم نہ ہو جائے سنہ ۱۸۷۰ء میں جو شکستیں فرانس نے بمقابلہ جرمن کے کھائیں، وہ اس وجہ سے تھیں کہ فوج کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ موقعوں پر تھے۔ جرمن نے ہر فوج پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اگر فرانس کی کوشش یہ ہوتی کہ بلجیم اور فرانس کے سب علاقوں کو حملے سے محفوظ رکھے،

your every movement with the deepest interest and mark with eager satisfaction your daily progress. Indeed, your welfare will never be absent from my thoughts. I pray God to bless you and guard you and bring you back victorious.

یعنی تم میری سلطنت کی حفاظت کی غرض سے اور اُس کی عزت قائم رکھنے کی غرض سے، اپنے ملک اور وطن سے باہر جارہے ہو۔ بلجیم جس کی حفاظت کا ذمہ ہم نے لیا ہے، اُس پر دشمن نے حملہ کیا ہے اور وہی زبردست دشمن فرانس پر بھی چڑھائی کرنے والا ہے۔ میرے سپاہیو! میں تم پر پورا بھروسا کرتا ہوں۔ فرض کی انجام وہی تمھارا اصل اصول ہونا چاہیئے اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنا فرض نہایت خوبی اور شرافت سے انجام دوگے۔ میں نہایت شوق سے تمھاری نقل و حرکت معلوم کرتا رہوں گا اور جو ترقی کا قدم تم آگے بڑھاؤ گے، مجھے اُس کا حال دریافت کر کے نہایت اطمینان ہوگا۔ ہر وقت میرا دھیان تمھاری خیر و عافیت کی طرف لگا رہے گا۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو برکت دے اور تم کو اپنی حفاظت میں لے اور پوری فتحمندی کے ساتھ وطن مالوف کو واپس کرے ـــــ اسی طرح لارڈ کچنر نے، جو وزیر جنگ ہیں اور اس وقت برطانیہ کے سب سے بڑے سپاہی اور جنگ آزما سمجھے جاتے ہیں، فوج کو نہایت عمدہ اور مناسب ہدایتیں کیں کہ غیر ملک میں جا کر فرینچ قوم کے ساتھ اُن کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ اُن ہدایتوں نے فوج کا دل بڑھایا اور اُس میں قومی جوش کی آگ بھڑکا دی۔

اور اب اُس کی فوج دنیا میں ایک نہایت زبردست ساز و سامان سے آراستہ اور تعداد میں نہایت کثیر سمجھی جاتی تھی۔ اُس نے جاپان سے صلح ہو جانے کے بعد اس بات کی تحقیقات کی کہ کیوں اُس کی فوج نے جاپان کے مقابلے میں شکستیں کھائیں اور ذلت اُٹھائی۔ اُس نے بڑے بڑے جنرلوں کو عہدوں سے علٰحدہ کیا اور فوج کے ٹھیکہ داروں کو، جنھوں نے ایسی قومی اور ملکی مصیبت کے وقت اپنا ذاتی فائدہ بیجا طور پر حاصل کیا تھا، بے رحمی سے سزائیں دیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے روس کی کوشش خاص طور پر یہ رہی کہ جرمنی اور آسٹریا کے مقابلے میں اپنی سلطنت کی حفاظت کرے۔ پس فرانس نے روس اور برطانیہ کی فوجوں کی آمد کا خیال کرکے، اپنی فوجوں کی نقل و حرکت تجویز کی تھی اور اس لئے آلساس لورین پر بہت بڑے لشکر سے حملہ کر دیا تھا، جہاں فرانس خیال کرتا تھا کہ جرمن کی فوج زیادہ تعداد میں مقابلہ پر آئے گی۔ فرانس یہ یقین رکھتا تھا کہ ان دونوں صوبوں کی رعایا ہمارے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرنے اور جرمن کی حکومت سے نکل جانے کو تیار ہے۔ اُس نے یہ تجویز کی تھی کہ بڑی فوج صوبہ لورین میں رہے اور چھوٹی فوج جرمن کو اُتّر کی طرف روکے رہے۔ فوج کے چند دستے بلجیم کی مدد پر رہیں، پیدل سپاہ کے دستے نامور کی طرف بڑھیں اور دریائے میوز کے پار جرمن کو آنے نہ دیں۔ سواروں کے رسالے بلجیم کے درمیانی حصے تک پہونچ کر جرمن کے سواروں کو پیچھے ہٹا دیں اور آمد و رفت کے راستوں پر امدادی فوجوں کو جو علاقوں سے آئی تھیں، مامور کر دیا جائے۔

لی ایثر پر حملہ کرنے کے بعد، جس کا ذکر ہو چکا ہے، شہنشاہ جرمن نے

تو اُس کو ضروری تھا کہ بلیفور سے نامور تک اور نامور سے دریائے میوز کے کنارے کنارے لی آیٹر تک، اپنی فوجیں قائم کرتا۔ اگر اس لین کو وہ اپنے قبضے میں رکھتا تو جرمن کے لئے ناممکن ہو جاتا کہ وہ بلجیم پر حملہ کرے۔ لیکن یہ طریق اختیار کرنے میں فرانس کی فوجیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتیں، جن میں سے ہر ایک حصے پر جرمن جب چاہتا غلبہ کر لیتا۔ فرانس نے جو یہ تجویز سوچی کہ اپنی فوجیں تقسیم نہ ہونے دے یہ بھی دو عظیم الشان نقصانوں سے خالی نہیں، سب سے پہلے تو یہ نقصان ہے کہ بلجیم میں جرمن بہت کثرت سے بھر گئے دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر جرمنی اپنی فوجیں سمندر کے کنارے تک لے آئے اور وہاں سے پھر شمالی فرانس کے اُن حلقوں میں جہاں صنعت و حرفت کے کارخانے ہیں، یا جہاں کانیں کھودی جاتی ہیں گھس پڑے، تو جب چاہے اُن کو غارت کر دے۔ فرنچ جنرلوں کو پہلے سے یہ سب معلوم تھا لیکن وہ مجبور تھے کہ فوجوں کو دو طرف تقسیم نہیں کر سکتے تھے اور اس بات کی سخت ضرورت تھی۔ فرانس یہ خوب سمجھتا تھا کہ جتنے عرصے تک جرمن فوج کو روکے رہے گا اور اپنی فوجوں کو جا بجا تقسیم نہ ہونے دے گا، اُسی قدر اچھا ہے۔ کیونکہ برطانیہ نے سمندر کی طرف جرمنی کی راہ روک دی تھی اور فرانس کو مہم روانہ کر دی تھی کہ خشکی کی لڑائی میں مدد دے۔ اُدھر یورپ کی طرف سے روس اپنا ٹڈی دل لشکر جرمنی کے مقابل لا رہا تھا، جو ایسے ساز و سامان سے آرہا تھا کہ جرمنی کو اُس کا مقابلہ دشوار تھا۔

روس کو جاپان کی لڑائی سے سبق حاصل ہو چکا تھا اور اُس نے اپنی فوج نئے سرے سے آراستہ کر لی تھی اور جنگ کے طریقوں میں بہت کچھ اصلاح کی تھی

میدان جنگ میں کام دے سکتی تھی اور اسّی ہزار قلعوں کی فوج تھی جو ۱۹۱۳ء میں نئے سرے سے ترتیب دی جا رہی تھی۔ لیکن کافی طور پر تیاری، زمانہ حال میں کبھی نہیں کی گئی۔ بجائے اس کے کہ فوجی طاقت پر بھروسا کیا جاتا، بلجیم اُن حقوق پر بھروسا کرتا تھا جو عہدناموں کے ذریعہ اُسے حاصل تھے۔ کبھی کبھی ملک کی محافظت کے لئے بڑی بڑی تجویزیں ہوتی تھیں۔ بہت روپیہ خرچ کرنا قرار پاتا تھا، لیکن اُن تجویزوں پر عمل کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی توپیں خریدی جاتی تھیں۔ مگر حوالگی کی نوبت نہیں آتی تھی، نہ قلعے بنائے جاتے تھے جن پر وہ توپیں چڑھائی جائیں۔ لی آیشر اور نامور غیر محفوظ حالات میں تھے سول گارڈ، جس کی تعداد پچاس ہزار تھی اور جس کو قلعے کی محافظت سپرد تھی، اُس کا حال یہ تھا کہ جب جنگ شروع ہوئی اُس وقت اُس کو موزر رائفل (Mauser Rifle) دیے گئے اور اُن کا استعمال کرنا اُس کو سکھایا گیا، غرضکہ بلجیم کی فوجی حالت، بہت اصلاح کے قابل تھی اور جرمن کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔

اہل بلجیم فرانس اور برطانیہ کی مدد پر بھروسا کیے ہوئے تھے صرف یہ چاہتے تھے کہ حملہ آوروں کو روکے رہیں، جب تک کہ اتحادی فوجیں پہونچ جائیں۔ فرانس کی سپاہ کی نقل و حرکت بہت آہستہ رہی، جس سے جرمن کو موقع ملا کہ اپنے منشائے دلی کے مطابق اُس نے چھاپا مارا اور بلجیم کی فوجوں کی طرف، ایک بہت بڑا لشکر لا کر ڈال دیا۔ فرانس کی فوج نامور پر بھی دیر میں پہونچی اور تعداد میں کم تھی۔ بلجیم کی محافظت جو فرانس نہ کر سکا، اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ کی فوج میدان جنگ میں ساڑھے پانچ دن دیر کر کے پہونچی۔ اہل بلجیم کا ارادہ یہ تھا کہ دریائے میوز کی لین کو جس قدر عرصے تک ممکن ہو بچاتے رہیں اور پھر اگر ضرورت ہو تو نامور اور اینٹ ورپ

ملکہ ہالینڈ کے ذریعہ، شاہ بلجیم کے پاس پیام بھیجا کہ اگر بلجیم مقابلہ نہ کرے اور فرانس پر فوج جانے کے واسطے راہ دیدے، تو بلجیم کے باشندوں کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جائے گا اور اُس کی سلطنت بحال و برقرار رہے گی۔ شاہ بلجیم نے انکار کیا اور کہا کہ فرانس، برطانیہ اور روس ہماری مدد پر ہیں اور اگر وہ ہم کو تباہی اور بربادی سے بچا نہ سکیں، تب بھی ہماری بات اسی میں رہتی ہے کہ ہم تمھارا مقابلہ کریں اور پیچھے نہ ہٹیں تاکہ دنیا میں نام رہ جائے ؎

جوانمرداں نہ پیچند از سخن رو ہمی میداں ہمی چوگاں ہمی گو

رعایائے بلجیم کو اول تو جرمن سے ویسے ہی نفرت تھی۔ اُس پر طرہ یہ کہ ہر گاؤں اور ہر قصبے سے جرمن کے ظلم و ستم کی خبریں آرہی تھیں۔ ان سے وہاں کے باشندوں کو اور بھی غصہ پیدا ہوا اور تمام قوم یکدل ہو کر اپنے ملک کو بچانے کے لئے تیار ہو گئی۔ شاہ بلجیم جو نہایت سادہ مزاج اور بہادر ہیں اس موقع پر پیشوا بنے اور بادشاہی کی شان و شوکت چھوڑ کر، بغیر کسی جلوس اور ہمراہیوں کے، اپنے لشکر کے سپاہیوں کے ساتھ ساتھ رہ کر سب کی ہمت بڑھائی اور اسی طرح رہنا اختیار کیا، جس طرح معمولی سپاہی رہا کرتے ہیں۔

جب بلجیم کا لشکر مقابلہ کرنے نکلا، تو اُس ملک کے کاہن صلیبیں لیے ہوئے لشکر کے پہلو بہ پہلو تھے اور ہمت دلاتے تھے کہ مذہب کے لئے شہید ہو جانا چاہیئے، مگر بلجیم بلکہ تمام دنیا کو معلوم ہو گیا کہ اعلیٰ درجے کی بہادری، جانبازی اور قومی جوش یہ سب بیکار ہیں، جبکہ مقابلے میں ایسی فوج کثیر ہو جو قواعداں زبردست اور جدید اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو۔ بلجیم کی فوج ایک لاکھ تھی جو

دشمن نہیں ہیں۔ ہماری جان چھوڑ دو۔ ہم بیگناہ ہیں" یہی حال تی آیشر تک تمام راہ دیکھنے میں آیا ہے۔ غرضکہ جرمن قوم کے ظلم و ستم سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ موت کے فرشتے زمین پر اُتر آئے ہیں، جنھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا ہے۔ نہ بچوں کو چھوڑتے ہیں نہ عورتوں کو نہ مردوں کو۔ یا یہ کہ کوئی وبا پھیلی ہوئی ہے، جس نے گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے صاف کر دیے ہیں۔ یا وحشی فرقے ملک میں گھس پڑے ہیں، جو انسان کے خون کے پیاسے ہیں اور لوٹنا، مارنا، پھونکنا اُن کا کام ہے، جن سے نہ عبادت گاہیں بچیں، نہ کسی کا گھر۔

جرمن کا رسالہ قصبہ وسی سے گزر کر مقام Tongres پہونچا۔ بلجیم کا جھنڈا ٹاؤن ہال پر لہرا رہا تھا۔ جرمن نے اُس کو گرا دیا۔ میونسپلٹی کے خزانے پر قبضہ کر لیا اور ڈاکخانے سے دس ہزار فرینک (Franc) لیئے اور نیز Hesselt کے مقام پر حملہ کر دیا۔ وہاں کی نیشنل بینک سے دو ملین فرینک، یعنی اسّی ہزار پونڈ چھین لیئے گویا پورے طور پر ڈاکوؤں کا کام کیا، جس کی اجازت جنگ میں ہرگز نہیں ہے۔

۱۲ اگست کو Tirlemont کے مقام پر دو ہزار جرمن سوار بڑھے اور ادھر سے بلجیم کے نیزہ برداروں نے مقابلہ کیا، لیکن جرمن مشین گن کی آگ برداشت نہ کر سکے اور پیچھے ہٹ گئے۔ دوسری صبح جرمن نے پھر حملہ کیا لیکن بلجیم کی فوج نے وہ آگ برسائی کہ جرمن کچھ دور تک پسپا ہو گئے۔ اُس وقت ڈریگون (Dragoons) کے رجمنٹ نے مقام Aineffe پر چھاپا مارا۔ تین گھنٹے تک سخت لڑائی ہوئی جرمن فوج پیچھے ہٹا دی گئی اور اُس کے ۱۰۳ سپاہی مارے گئے اور ۱۰۲ گرفتار ہوئے اسی طرح کئی موقعوں پر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں دونوں فریق میں ہوئیں، جن میں بلجیم

کے قلعوں میں پناہ لیں۔

جب جرمن کا لشکر بیلجیم میں داخل ہوا، اُن کو اُمید تھی کہ ہم کو گزرنے کے واسطے راہ مل جائے گی اور شاید ہی کچھ مقابلہ ہو تو ہو۔ مگر اُن کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ یہاں کے باشندوں کو ہم سے سخت نفرت ہے اور ہر شخص سخت مقابلے پر آمادہ ہے اور جو چیز جس کے ہاتھ پڑتی ہے اُس کو وہ بطور ہتھیار کے ہمارے مقابلے میں کام میں لاتا ہے۔ اُنھوں نے اُس کی تدبیر کی۔ جرمن کی پالیسی یہ رہی ہے کہ سول آبادی یعنی عامہ رعایا، جس کا تعلق فوج سے نہیں ہے، وہ ہرگز ہرگز شریک جنگ نہ ہو چنانچہ ۱۸۷۰ء میں، جبکہ فرانس اور جرمنی میں جنگ ہوئی تھی، جرمنی نے اس حکمتِ عملی پر بہت سختی سے عمل کیا تھا۔ وہی عمل جرمن کو اس لڑائی میں بھی کرنا تھا، مگر وہ سختی کی جو مہذب قوموں میں، حالت جنگ میں نہیں برتی جاتی ہے۔ اُن زیادتیوں کا مفصل حال پہلے لکچر میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ خود ایک جرمن نامہ نگار نے، جرمن کے ظلم و ستم کی شہادت دی ہے، جس کو کافی ثبوت کہنا چاہیے۔ اُس نے سرکاری طور پر سفیروں کے فوجی مصاحبوں کے ساتھ بیلجیم کے اُس حصے کا سفر کیا جو جرمن فوج کے قبضے میں تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے دو گاؤں Herve اور Battice کا معائنہ کیا وہ مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیے گئے۔ Herve میں پانچ سو مکانات تھے، اُن میں سے صرف اُنیس باقی رہ گئے ہیں۔ ہر جگہ لاشوں کے انبار لگے ہوئے ہیں اور جلائند آتی ہے۔ گرجا کی عمارت اینٹ روڑے کا ڈھیر ہے۔ جو مکانات مسمار ہونے سے بچے ہوئے ہیں، وہ ایسے ہیں جن پر یہ نوٹس لگے ہوئے ہیں "ہم کو نہ مارو ہم تمھارے

میدان سے ہٹ آئی اور جرمن کے مقابلے کی تاب نہ لاسکی۔ جرمن کی فوج نہایت جوش وخروش سے آگے بڑھتی تھی۔ ہر سپاہی اپنی جان ہتیلی پر لیے ہوئے تھا۔ اُن کی زبردست توپیں بلجیم کی فوج میں آگ برسا رہی تھیں اور بیشمار مشین گنیں بھاڑ کی طرح بھونے ڈالتی تھیں اور ہوائی جہاز بم کے گولے آسمان سے پھینک رہے تھے۔ ایسے حملے کو روکنے میں بلجیم کا نقصان بہت ہوا۔ تین رجمنٹیں نیست ونابود ہوگئیں۔ آخر میں بلجیم کی سپاہ منتشر ہوکر اینٹ ورپ کے قلعوں میں پناہ گیر ہوئی اور دارالسلطنت برسیلز کو دشمنوں کے لیے کھلا ہوا چھوڑ گئی۔

جب جرمن سپاہ دارالسلطنت بلجیم کی طرف آرہی تھی، وہاں کے برگوماسٹر نے باشندوں کو ہدایت کی کہ لڑائی سے باز رہیں اور بالکل خاموش رہیں، ورنہ برسیلز پر مفت میں تباہی آجائے گی۔ ۲۰ راگست کو جب برگوماسٹر موٹر پر سوار ہوکر جرمن سپہ سالار کے پاس گیا، تو اُس نے برگوماسٹر سے پوچھا کہ تم اپنا شہر بغیر کسی شرط کے ہمارے سپرد کرنے کو تیار ہو یا نہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ سوا سے اس کے کہ میں اس کو تسلیم کروں، کوئی دوسرا چارہ نہیں ہے۔ تب سپہ سالار نے برگوماسٹر سے کہا کہ تم ذمہ دار ہو کہ کوئی شخص ہماری فوج سے بُری طرح پیش نہ آئے، ورنہ تم کو سزا دی جائے گی اور تمھارا خانماں اور اہل وطن، عبرت خیز مصیبت میں مبتلا ہوجائیں گے۔ آج ہماری فوج برسیلز میں داخل ہوگی۔ اس کے بعد فوج جرمن چالیس ہزار، جس میں سوار اور پیادے دونوں تھے، نہایت زرق برق سبز دھانی وردیاں پہنے ہوئے، باجے بجاتی اور قومی گیت گاتی ہوئی داخل ہوئی۔ آمد سے پہلے دور سے توپوں کی سلامی کی آواز آئی

کو کامیابی ہوئی اور جرمن کا نقصان زیادہ ہوا۔ کبھی توپیں چھن گئیں، کبھی گھوڑے، کبھی رسد کا سامان اہل بلجیم کے ہاتھ آیا۔ دونوں طرف سے اعلیٰ درجے کی بہادری ظاہر ہوئی۔ یہاں تک کہ جرمن کی شجاعت کا اقبال، بلجیم نے اور بلجیم کی بہادری کا اعتراف جرمن نے کیا۔ اہل بلجیم کو اپنی فتح اور کامیابی کے باعث اپنے اوپر بہت بھروسا ہو گیا اور جرمن نے یہ سمجھا کہ جس دشمن کو بہت کمزور سمجھتے تھے وہ ویسا کمزور نہ نکلا۔ ع دشمن نتواں حقیر و بیچارہ شمرد۔

بتاریخ ۵ راگست، جرمن سپاہ بہت کثیر تعداد میں بلجیم کے وسط کی طرف بڑھی۔ سواروں کے رسالے آگے آگے تھے اور اُن کی آڑ میں پیدل سپاہ چلی آتی تھی۔ دوسرے دن مقام وآوَر (Wavre) سے ہالینڈ کی سرحد تک نہایت تیزی سے پھیل گئی اور مقام Tirlemont پر بڑے زور سے گولا برسایا۔ جرمن کے ہوائی جہاز گرداوری کرتے تھے اور بلجیم کی فوج جہاں جہاں تھی اُس کی ٹھیک جگہ کا پتہ گولہ اندازوں کو بتا دیتے تھے، جس کے باعث نشانہ بہت ٹھیک لگتا تھا۔ بلجیم کی سپاہ برداشت نہ کر سکی اور پراگندہ ہو گئی۔ تب جرمن سواروں نے اُن پر حملہ کر کے اُن کو ہلاک کرنا شروع کیا۔ وہاں کے باشندوں نے بھاگنا شروع کیا اور مقام وآوَر سے پانچ میل پر ریل تھی، وہاں جا کر ریلوں پر سوار ہو کر برسلز چلے گئے۔ وہاں بلجیم فوج کی شکست و تباہی اور تمام رعایا کی ہلاکت کا حال پر ملال کہہ کر سب کو گھبراہٹ میں ڈال دیا۔

۱۹ راگست کو بلجیم کی سپاہ نے لُوؤین میں جم کر مقابلہ کیا۔ یہ مقام موقع کا تھا اور یہ سمجھا گیا تھا کہ یہاں دیر تک سخت مقابلہ ہو گا۔ مگر تھوڑی دیر بعد بلجیم کی سپاہ

کرلیا اور جنرل جافرے (Joffre) نے، جو کل لشکر فرانس کا قائدِ اعظم یعنی کمانڈر انچیف
تھا، یہ اشتہار دیا کہ ہم ۴۴ برس تک اس موقع کا انتظار نہایت افسوس کے
ساتھ کرتے رہے، کہ تمھارے ملک میں آئیں۔ اب ہم سب کو نہایت خوش ہونا چاہئے
کہ ہم نے آج اپنے دشمن جرمن سے بدلہ لیا اور تم کو جرمن کی ظالمانہ حکومت سے
نجات اور آزادی ملی۔ آلساس کی عمر دراز ہو اور فرانس کو فتح نصیب ہو۔

اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب بلجیم میں فوج بھیجنے کی شدید ضرورت
تھی، تو کیوں آلساس پر حملہ کیا گیا اور سپاہ کا بڑا حصہ اس طرف سے جرمن پر
حملہ کرنے کو بھیج دیا گیا؟ بڑے تجربہ کار جنرلوں اور مشہور مدبّروں کی رائے ہے کہ
جنرل جافرے نے جو کچھ کیا اُس وقت یہی مناسب تھا۔ فوجی ضرورتیں اور ملکی
مصلحتیں، دونوں اسی کی مقتضی تھیں کہ آلساس پر حملہ کیا جائے۔ اول یہ کہ چونکہ
آلساس اور لورین کے باشندے جرمن کی حکومت کو پسند نہ کرتے تھے، اس لئے
یقین تھا کہ وہ فرانس کی رعایا بننا پسند کریں گے۔ دوسرے یہ کہ ان صوبوں کی
طرف سے سیدھا راستہ فرانس میں گھس پڑنے کا، جرمن کو حاصل تھا، اس لئے
مناسب تھا کہ دونوں صوبوں کی رعایا کو جرمن کے خلاف اُبھار دیا جائے، تاکہ
اُس طرف سے جرمن کا حملہ رُک جائے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ چالیس برس سے
تمام مہذب دنیا جرمنی کو آدابِ جنگ و حرب اور شیوہ طعن و ضرب کا اُستاد
سمجھ رہی تھی۔ جاپان، ٹرکی، یونان وغیرہ جرمنی ہی سے سپہ سالار بلا بلا کر اپنی
فوجوں کو فنِ جنگ سکھواتے تھے اور فرانس سنہ ۱۸۷۰ء کی شکست کے باعث
عام نظروں میں کمزور و حقیر سمجھا جاتا تھا۔ البتہ زمانۂ حال میں بلقان کی بعض

پھر بینڈ کی سُریلی آواز سُنائی دی اور ہراوُل نہایت جلوس سے فتحمندی کے نشے میں چور آگے بڑھا۔ اہلِ بلجیم کی اُمید کے خلاف، ہر جرمن سپاہی نہایت تازہ دم، عمدہ اور نئے برقدم ہتھیار لگائے، سپاہیانہ شان سے اکڑتا چلا آتا تھا۔ گویا پریڈ کرنے جارہا ہے۔ شہر کے باشندے اُن کو دیکھ کر عش عش کرنے لگے۔
جب لشکرِ جرمن دارالسلطنت میں داخل ہوا تو اُس نے عمدہ مقامات فوجی ضرورت کے اپنے قبضے میں کر لیے اور اُسی برگوماسٹر کو شہر کے معمولی انتظام کے واسطے مقرر کیا۔ لیکن اپنی طرف سے ایک سول گورنر اُس پر افسر کر دیا۔ اس کے بعد شہر سے اسّی لاکھ پونڈ یعنی ۱۲ کروڑ روپیہ جنگ کا خرچہ طلب کیا۔ برگوماسٹر نے یہ جواب دیا کہ شہر کا سب خزانہ اینٹ ورپ بھیج دیا گیا ہے، اس باعث یہ مطالبہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ برسیلز میں جرمن سپاہ داخل ہونے تک اس جنگ عظیم کا ایک درجہ ختم ہوتا ہے۔ اس کے آگے لڑائی نے دوسرا رنگ بدلا۔ اس وقت تک لڑائی بلجیم کی سرحدوں کے اندر محدود تھی اور فوجیں بھی دونوں طرف بہت زیادہ نہ تھیں۔ آگے جو لڑائیاں ہوئیں وہ فرانس اور برطانیہ کے لشکرِ عظیم اور جرمن کی سپاہِ کثیر میں، پہلے بلجیم کی سرحد پر اور بعد میں فرانس کی سرزمین پر ہوئیں۔

آلساس میں فرانس کے جارحانہ حملے

جب فرانس نے اپنی سپاہ بلجیم کی مدد پر بھیجی، اُس کے ساتھ ساتھ بیلفورٹ کے مقام سے، (جہاں فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ تینوں کی سرحدیں ملتی ہیں) ایک برگیڈ آلساس میں بھیج دیا۔ جس نے وہاں پہونچتے ہی Altkirk پر قبضہ

شروع میں فرینچ کو کامیابی زیادہ ہوئی، Thame اور Altkirk پھر فتح کرلیے گئے اور منول ہاؤزین پر بھی قبضہ کرلیا اور جرمن بہت بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئے۔ اُن کی ۲۴ توپیں فرینچ نے چھین لیں۔ جرمن نے مجبور ہوکر آسٹریا کو اپنی مدد پر طلب کیا فرینچ قوم نے اس فتح پر نہایت خوشی منائی۔ اشتراس برگ (Strass Burg) کی تصویر سنگی پر جو ۱۸۷۱ء سے کالا ماتمی کپڑا رنج وغم کی نشانی کے طور پر پڑا ہوا تھا، وہ اُتار ڈالا گیا۔ کئی اور مقامات پر جن کا ذکر طول سے خالی نہیں ہے، فرینچ کو کامیابی نصیب ہوئی خصوصاً وادی Bruche میں جہاں پندرہ سو جرمن گرفتار کیے اور بارہ توپیں جرمن کی چھین لیں اور آٹھ مٹریلیزیز (Mitrailleuses) بھی (یہ ایک قسم کی توپ ہوتی ہے جس میں کئی نالیں ہوتی ہیں) نتیجہ یہ ہوا کہ آلساس کے اوپر کے حصے سے جرمن نہایت بدحواسی سے ہٹ گئے اور بہت سامان رسد اور سامان جنگ چھوڑ گئے۔

لیکن افسوس کہ جو خوشی پیرس میں منائی گئی تھی، وہ زیادہ دنوں قائم نہ رہی اور رنج سے بدل گئی۔ جرمن نے بہت فوج جمع کرکے ۲۰ اگست کو یعنی اُسی دن کہ جب برسیلز میں داخل ہوئے تھے، لورین میں فرینچ پر غلبہ حاصل کرلیا اور دس ہزار فرینچ گرفتار کیے اور پچاس توپیں فرینچ کی چھین لیں۔ فرینچ کو Nancy کی طرف لوٹنا پڑا۔ دو دن بعد فرینچ کو آلساس سے بھی ہٹ جانا پڑا اور Mulhausen اور Donan وغیرہ چند مقامات خالی کردینا پڑے، جن پر جرمن نے قبضہ کرلیا۔ جرمن نے پیرس پر نہایت تیزی سے اور بڑی زبردست سپاہ سے حملہ کیا۔ جس کے باعث جنرل پو (Pau) جس کو آلساس کی مہم سپرد ہوئی

عیسائی ریاستوں نے، پیرس کو فتح حرب کا مرکز تسلیم کرلیا تھا۔ پس جنرل جافرے نے مناسب سمجھا کہ آلساس پر قبضہ کرکے اپنی پوری قوت کا اظہار کردیا جائے اور جرمن کو عام نظروں میں کم وقعت کردیا جائے اور جو شکستیں سنہ ۱۸۷۰ء میں کھائی تھیں اُن کی یاد فرینچ قوم کے دلوں سے بھول جائے اور ملک کی تمام رعایا سمجھ لے کہ سنہ ۱۸۷۰ء میں فوج کے سرداروں نے یہ بڑی غلطی کی تھی کہ جرمن کے حملوں کو فقط روکتے رہے، بلکہ خود جرمن پر حملہ کردینا چاہیئے تھا اور اس صورت میں فرینچ کو کامیابی ضرور ہوجاتی۔

سب سے پہلے فرینچ نے یہ کوشش کی کہ جرمن کو Thame اور Altkirk دونوں مقامات سے نکال دیا۔ باوجودیکہ جرمن مورچے بنائے ہوئے تھے اور تعداد میں بھی فرینچ کے برابر تھے، لیکن فرینچ نے دونوں مقامات فتح کرلیے۔ دوسرے دن یعنی ۸ر اگست کو فرینچ، مقام مُول ہاوزین (Mulhausen) کی طرف بڑھے اور شام ہوتے ہوتے اُس میں داخل ہوگئے۔ اُن کی آمد پر وہاں کے باشندوں نے نہایت خوشی ظاہر کی۔ لیکن دوسرے دن جرمن نے بڑی جماعت سے دو طرف سے فرینچ پر حملہ کیا اور سپاہ کی آمدورفت کی راہ بند کرنا چاہی۔ اس لئے فرینچ کے سردار فوج نے یہی مصلحت دیکھی کہ واپس جائے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ جرمن کی فوج آلساس میں بہت زیادہ تھی۔ جب سپاہ واپس آئی تو جنرل جافرے کی رائے ہوئی کہ ابھی تک تو صرف چھاپہ مارا ہے، لیکن اب آلساس پر مہم بھیجی جائے تاکہ جرمن کے لئے آلساس اور لورین کی طرف حملہ کرنا مشکل ہوجائے۔ جنرل پَو، جو سنہ ۱۸۷۰ء میں جنگ فرانسہ و جرمنی میں شریک رہ چکا تھا، اُس کو یہ مہم سپرد ہوئی۔

زیادہ جلدی اس وجہ سے کر رہا تھا کہ پیشتر اس کے کہ روس مدد کو پہونچے، فرانس
پر غلبہ حاصل کرے۔

نامور، لی آینٹر کی طرح محفوظ جگہ تھی اور جا بجا مضبوط قلعے تھے پچیس ہزار
فوج نامور میں تھی، جس کا سردار جنرل مائکیل تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ ۲۸ C.M
توپوں نے ہمارے قلعوں کو توڑ دیا۔ اس قدر دنا دن توپوں کی مار تھی کہ جو کچھ قلعوں
کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی تھی، اُس کی مرمت ہم لوگ نہیں کر سکتے تھے۔ دس گھنٹے تک
اہل بلجیم نے وہ آگ برداشت کی، جو اُن پر برس رہی تھی اور کوئی جواب نہ دے
سکے جس نے ٹوٹی پھوٹی فصیل سے سر باہر نکالا، تراق سے گولا لگا۔ افسر بہت کثرت
سے ہلاک ہوئے۔ آخر کار بلجیم کی فوج مقابلے کی تاب نہ لا سکی اور جہاں جس کے
سینگ سمائے چل دیا اور فوج اپنے مورچے خالی کر گئی۔ پھر اور قلعوں کی طرف جرمن
بڑھے۔ اُن کا بھی یہی حال ہوا۔ قلعہ سورلی (Saurlee) پر جرمن نے ۲۳ راگست
کو چھ سو گولے مارے۔ گولے کا وزن ۷۵۰ پونڈ تھا۔ ۲۴ اور ۲۵ کو تیرہ اور چودہ سو
گولے مارے اور یہ گولے وہی ۲۸ Howitzer C. M. سے مارے تین دن
میں یہ قلعہ فتح ہو گیا اور جس قدر سنگین برج قلعے کے تھے سب مسمار ہو گئے۔ غرض کہ
جنرل مائکیل نے چار روز تک دس گنی فوج جرمن سے مقابلہ کیا۔ جب اُس نے دیکھا
کہ زیادہ ٹھہرنے میں قلعے کی سب فوج ہلاک ہو جائے گی تو اُس نے اور قلعوں سے
فوجیں لانا شروع کیں۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ جاسوسوں نے زمین کے اندر کا ٹیلیفون
توڑ دیا، تو اُس نے پھر یہ ارادہ کیا کہ جس قدر فوج کو واپس لے جا سکے، اُسی قدر
بہتر ہے۔ مگر جبکہ فوج کے مختلف سردار نامور سے باہر جانے کے لئے اپنی فوجیں

تھی، پیرس آیا اور اُس کی حفاظت میں مصروف ہوگیا اور اُس کے آنے کا یہ اثر
ہوا کہ جرمن پیرس کا محاصرہ نہ کر سکے۔ جرمن کی فتح جو لورین میں ہوئی اُس کی خبر
جب برلن (Berlin) اور آسٹریا میں پہونچی تو دونوں جگہ بڑی خوشی منائی گئی۔

پیرس پر جرمن کا حملہ اور جنگ نامور و شال را و مالنس

جرمنی کو ۱۸۷۰ء کے واقعات یاد تھے کہ پیرس کے فتح ہونے سے گویا فرانس
پر پورا غلبہ ہوگیا تھا، لہذا اُس کو اُمید تھی کہ اب پیرس کو فتح کر لینے سے وہی اثر
ہوگا۔ اسی خیال سے اُس نے یہ تجویز سوچی تھی کہ بلجیم سے بہت تیزی سے گزر کر پیرس
پر چڑھائی کرنا چاہیئے۔ فرانس نے ۱۸۷۰ء کے بعد نو کرور پونڈ خرچ کر کے اپنی سرحدوں
پر قلعے بنا کر اپنے ملک کی محافظت جرمنی کے مقابل میں کردی تھی۔ فرانس کی پوربی
سرحد کی طرف سے حملہ ہونے کا خوف زیادہ تھا اور شمالی سرحد کی طرف سے کم تھا۔
کیونکہ شمالی سرحد پر بلجیم واقع تھا جس کی نیوٹریلیٹی (Neutrality) یعنی علیحدگی
و غیر جانبداری بحالت جنگ، کی ضمانت، فرانس، جرمنی اور برطانیہ نے کی تھی۔
چونکہ بلجیم کی طرف سے حملے کا خوف کم تھا اور قلعوں کے بنانے میں روپیہ کا خرچ
زیادہ تھا، اس لئے شمال کی طرف کی سرحد پر فرانس زیادہ مضبوطی اور حفاظت نہ کر سکا
جرمنی خوب جانتا تھا کہ اگر اُتر کی طرف یعنی بلجیم کی طرف سے فرانس پر حملہ کیا جائے گا،
تو فرانس اُس کو روک نہ سکے گا اور جرمن کی فوج بڑھتی ہوئی پیرس تک پہونچ جائیگی
لی آیش اور نامور پر قبضہ کرنا جرمن کے واسطے ضرور تھا کیونکہ بغیر اس کے بلجیم سے
فرانس تک جو ریل کی لائن گئی ہے، اُس پر کچھ اختیار جرمن کا نہیں ہو سکتا تھا جرمن

کے نواح میں برطانیہ کی فوج بظاہر اچھا کام کر رہی تھی۔ مانس پر قبضہ رکھنے کا کام برٹش فوج کے سپرد کیا گیا تھا، جس سے سرجان فرینچ کو بہت خوشی تھی، کیونکہ مانس ایک ایسا مقام تھا کہ اُسی کے آس پاس، بہت بڑی فتوحات اور کامیابیاں برٹش نے اٹھارھویں صدی کے شروع میں حاصل کی تھیں۔ مانس سے تین میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف، مال پلاکے (Malplaquet) کا مقام ہے، جہاں ڈیوک آف مارل برا، نے لوئی چہاردہم کے مقابلے میں سب سے آخری اور بڑی نمایاں فتح حاصل کی تھی۔ اسی طرح واٹرلو (Waterloo) کا مقام بھی وہاں سے قریب برسیلز کی راہ میں ہے، جہاں ڈیوک ولینگٹن نے سب سے بڑی فتح نپولین کے مقابلے میں پائی تھی۔

یہ تحقیق معلوم ہوا تھا کہ ایک لاکھ جرمن، برٹش فوج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ۲۲ راگست کو برٹش سواروں کا رسالہ، اُتر کی طرف بڑھا اور واٹرلو سے ایک کوس کے فاصلے پر پہونچا تھا کہ وہاں اوئلین (Uhlan) اور برٹش Hussars کی سپاہ سے معرکے پیش آئے اور اُن میں امتحان ہو گیا کہ تلوار اور گھوڑے کے کرتب میں جرمن فرداً فرداً برٹش کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ Sir Philip Chetwoode سردار فوج نے ٹھیک کہا کہ ہمارے آدمی دشمن کی فوج میں ایسے گھستے ہیں، جیسے چاقو بادامی کاغذ کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ سرجان فرینچ نے اسی ہزار سپاہ لڑائی کے لئے نکالی۔ ۲۳ راگست ۱۹۱۴ء، اتوار کے دن، مقام مانس پر برٹش فوجیں جمع ہوئیں تیسرے پہر جرمن مقابلے پر آئے اور نہایت سخت حملہ Sir Douglas Haig کے دستہ سپاہ پر کیا۔ برٹش جنرل نے اپنے بازو کی فوج کا حصہ پہاڑیوں میں Bray کے جنوب کی طرف ہٹا لیا اور سواروں کے رسالے نے، اپنی جگہ چھوڑ کر جنوب کی طرف

لڑتے بھڑتے نکال رہے تھے، بہت سپاہی ضائع ہوئے۔ نامور کے چھوڑنے اور فوج واپس لے جانے پر بہت اعتراض کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بارہ گھنٹے فوج اور نامور میں رہتی تو ایک سوار اور ایک پیدل اور ایک توپ بھی نہ بچتی۔

اس کے بعد جرمن کی فوج نے شہر شاآل را پر حملہ کیا۔ یہ وہ شہر تھا جس کے راستے سے نیپولین ۱۵ ؍جون ۱۸۱۵ء کو گزرا تھا۔ اُس وقت سے اِس وقت تک، سو برس کے عرصے میں، اس شہر میں بہت فرق آگیا تھا۔ لوہے اور کانچ ڈھالنے کے کارخانے یہاں کثرت سے تھے۔ ۲۱ ؍اگست ۱۹۱۴ء کو بیس ہزار جرمن ہُزار (Hussars) اس مقام میں داخل ہوئے اور اپنے آپ کو برٹش سوار کہکر دریائے سیمبر (Sambre) کی طرف گھوڑے پویائے گئے، لیکن فرینچ افسر نے اُن کو پہچان لیا اور دو آدمی اُن میں سے قتل اور تین زخمی کیے اور مار کر نکال دیا۔ دوسرے دن جرمنی نے شاآل را پر یورش کی۔ ۲۳ ؍اگست کو قصبے کے اندر سخت لڑائی ہوئی اور ۲۴ ؍اگست کو سخت مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک طرف پرشن گارڈ (Prussian Guard) تھے اور دوسری طرف فرانس کی سپاہ الجزائر و سینگال (Senegal)۔ جرمن کا نقصان بہت زیادہ ہوا لیکن ایک ویران فیکٹری میں، جو توپیں جرمن نے لگا رکھی تھیں، اُن کے باعث جرمن کو فرینچ پر غلبہ ہوگیا اور فرینچ کی سپاہ نے واپس آنا شروع کیا اور دریائے سیمبر نامور سے موبئژ (Maubeuge) کے نواح تک جرمن کے قبضے میں آگیا۔

اب یہاں سے برطانیہ کی سپاہ کا حال لکھا جاتا ہے، جو دریائے سیمبر سے اُتر کی طرف، مقامات موبئژ و کانڈے (Conde) کے درمیان تھی۔ مانس (Mons)

ممکن ہے۔ جرمن نے یہ خیال کیا تھا کہ مورچوں میں کوئی سپاہی بچا نہ ہوگا لیکن انگریزوں نے جنگ ٹرانسوال میں یہ سبق سیکھا تھا کہ مورچے ایسے بنائے تھے کہ بڑی توپوں کے گراب سے اُن کو زیادہ نقصان نہ پہونچے۔ جرمن یہ سمجھ کر کہ برٹش سپاہی سب مردہ یا زخمی ہوں گے مورچوں پر قبضہ کرنے کے لئے بڑھے، جب زیادہ قریب آگئے تب انگریزوں نے توپوں سے اُن کی خبر لی اور چاروں طرف لاشیں بچھادیں لیکن جرمن نے بہت فوج آگے بڑھائی جو آندھی کی طرح بڑھتی چلی آئی اور کسی چیز سے نہ رُکی۔

غرضکہ مانس کی لڑائی آخر تک اس کامیابی کے ساتھ قائم نہ رہی جو پہلے ہوئی تھی۔ وجہ یہ ہوئی کہ فرانس کی فوج دریائے سیمبر کے اُس حصّے پر، جو نامور اور شالَ را کے درمیان ہے، قبضہ نہ رکھ سکی اور یہ بات انگریزی افواج کے خلاف پڑی۔ جب جرمن فوج دریائے سیمبر کی راہ سے آگے بڑھی تو فرینچ سپاہ جنوب کی طرف واپس ہٹی۔ اگر انگریزی سپاہ وہاں سے ہٹ نہ جاتی تو جرمن فوج اُس کے داہنے بازو پر حملہ کرتی اور زیادہ نقصان پہونچاتی، اس لئے انگریزوں نے مناسب سمجھا کہ فرینچ کی سرحد پر واپس آجائیں اور اُسی لین میں رہیں، جہاں فرینچ سپاہ ہٹ کر واپس آگئی تھی۔ اگر فرینچ نے مقام شالَ را پر قبضہ کر بھی لیا ہوتا، تب بھی برٹش کی حالت نہایت نازک اور خطرناک ہوتی، کیونکہ مانس کو جرمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

جنرل جافرے نے سرجان فرینچ کو اطلاع دی کہ کم سے کم تین Army Corps ۲۳ اگست کو برٹش کے مقابل کی طرف آرہی ہیں اور ٹورنے (Tournay) کی طرف سے دوسری سپاہ آرہی ہے جو بازو سے حملہ کرے گی۔ یہ خبر صحیح ثابت ہوئی

رُخ کیا۔ آٹھ لاکھ فرینچ سپاہ نے سرحد کے کنارے کنارے لوٹنا شروع کیا اور پندرہ لاکھ جرمن فتح کی خوشی میں بھرے ہوئے اُن کا پیچھا کرتے آتے تھے۔ ایسی صورت میں اسّی ہزار برٹش سپاہ اس زبردست ریلے کو کیونکر روک سکتی تھی۔ مانس کے آس پاس جرمن گولہ اندازوں کو بظاہر بڑی کامیابی ہوئی۔ توپوں کی لڑائی میں برٹش سپاہ جرمن کے مقابلے میں ویسے ہی ناکام رہی جیسے کہ اہل بلجیم ناموری میں رہے تھے۔ برٹش کے بڑے تجربہ کار اور جنگ آزما افسروں کا قول تھا کہ ٹرانسوال کی جنگ میں جو سخت سے سخت مقابلہ برٹش کو مقام (Spion Kop) اور دریائے ماڈر پر کرنا پڑا تھا، وہ بھی ان معرکوں کے آگے کوئی چیز نہ تھا، جو اس وقت مقام مانس پر انگریزوں کو پیش آئے۔ جرمن توپوں کی آواز دنا دن، ایسی ہولناک تھی کہ کلیجے دہلتے تھے اور بدن پر روئیں کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک گرم ہوا کا طوفان ہے، جس کے ساتھ آگ برس رہی ہے اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج ساتھ ساتھ ہے اور جہاں گراب گرتے تھے وہاں بھونچال آجاتا تھا۔ ایسے وقت میں توپوں کی پُرشور آواز سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے اور فیر کے صدمے اور دھماکے سے زمین ہل رہی تھی اور انگریزی سپاہ کے چاروں طرف گولوں اور گولیوں اور گراب کا مینہ برس رہا تھا۔ برٹش سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ ذرا بھی نہیں گھبراتے تھے اور نہایت استقلال اور اطمینان کی حالت میں خندہ پیشانی یہ بحث کر رہے تھے کہ فلاں امریکن پہلوان نے جو فلاں انگریز کے مقابلے سے اپنی جان بچائی اُس کی وجہ نامردی تھی یا کچھ اور۔ سپاہ انگریزی، گو موت کے منہ میں تھی، مگر اُس کو نہایت حقارت سے دیکھتی تھی اور اپنے افسروں پر پورا بھروسا رکھتی تھی کہ وہ ہمارے لئے سب کچھ کر رہے ہیں جو انسانی طاقت سے

کے ساتھ مال و دولت بھی نثار کر چکی تھی۔ اس کے سوا آسٹریا کی پالیسی کے باعث ایسی سازشوں کا زمانہ آ گیا تھا کہ سرویا کو ایک دم چین نہ ملتا تھا۔ ٹرکی کے مقابلے میں، سرویا تھک چکا تھا کہ دوسری لڑائی اتحادی فوجوں کے باہم جو ہوئی اُس میں رہی سہی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ سرویا ایک صدی سے آسٹریا کو اپنا دشمن سمجھ رہا ہے جس نے سروین قوم کی اپنی رعایا کو غلامی کی حالت میں رکھا ہے، اس وجہ سے سرویا ہمیشہ آسٹریا سے ڈرتا رہا اور اُس سے نفرت کرتا رہا ہے اور بموجب اس مقولے کے سے

ازاں مار برپاے راعی زند که ترسد سرش را بکوبد بسنگ

یہ چاہتا رہا ہے کہ آسٹریا کو تباہ و برباد کر دے۔ جب آسٹریا کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہوا تو سرویا یہ سمجھا کہ اب میرا خاتمہ ہوا چاہتا ہے، لہذا اُس کا ہر مرد و عورت، پیر و جواں اپنی جان و مال سے تیار ہو گیا کہ کسی طرح سرویا کو فتح حاصل ہو۔ روس نے سرویا کو پہلے سے اطلاع دی تھی کہ کسی نہ کسی بہانے اور حیلے سے ۱۹۱۴ء میں آسٹریا ضرور سرویا سے لڑائی ٹھانے گا اور خود بھی روس نے کوشش کی تھی کہ اپنی بری و بحری فوج کو نہایت جلد ترتیب دے اور اُس کو خوب درست کرے، تاکہ جب موقع پیش آئے تو سرویا کو فوج سے مدد دے سکے، کیونکہ اُس وقت اُس نامہ و پیام سے کام نہیں نکل سکتا تھا جو سفیروں کے ذریعہ روس نے سرویا کو ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۲ء میں دیے تھے۔ سرویا بمقابلہ بلغاریہ کے، دو لاکھ ۹۵ ہزار سپاہ لایا تھا مگر اس فوج میں توپوں اور افسروں کی کمی تھی اور پورے طور پر مرتب بھی نہ تھی۔ اُس وقت سے ریاست سرویا کی پوری توجہ یہ

اور معلوم ہوا کہ تین لاکھ جرمن بڑھتے ہوئے آرہے ہیں اور توپوں کی تعداد اُن کے ساتھ برٹش توپوں سے چوگنی ہے۔ چونکہ انگریزی سپاہ اسی ہزار تھی، لہذا بڑی خوش تدبیری اسی میں تھی کہ بے فائدہ نقصان سے فوج کو بچایا جائے۔ پس برٹش جنرل یعنی سرجان فرینچ نے بڑی خوبی اور لیاقت سے سپاہ کو واپس لاکر فرینچ سرحد پر ڈال دیا۔ غرضکہ انگریزی سپاہ کی Retreat یعنی واپسی اُسی طرح اعلیٰ درجے کی تاریخی یادگار ہے، جس طرح سے دس ہزار فوج یونانی کی واپسی یونانی جنرل زانوفن کی کمان میں ہوئی تھی۔

جنگ عظیم پر تیسرا لکچر

سرویا کس طرح اپنے زبردست دشمن آسٹریا سے مقابلے کو آمادہ ہوا

فرینچ اور برٹش کے معرکے، بمقابلہ جرمن، دوسرے لکچر میں مذکور ہو چکے ہیں اُن کو چھوڑکر آسٹریا اور سرویا کی جنگ کا بیان کیا جاتا ہے جب آسٹریا نے سرویا کے مقابلے پر اعلان جنگ کیا، اُس وقت سرویا کی حالت بلقان کی سب ریاستوں کی طرح نہایت ابتر ہو رہی تھی۔ خزانہ خالی تھا۔ رعایا لڑتے لڑتے تھک چکی تھی۔ چالیس لاکھ رعایا بلقان کی جنگ میں اپنا خون آب باراں کی طرح بہا چکی تھی اور جان

لڑوں گا اور اُس کو سزا دوں گا۔ بلغاریہ کو سرویا اور یونان سے سخت عداوت تھی مگر اس وقت سرویا سے بدلہ نہ لے سکا، کیونکہ رومانیہ، مدد کا معاہدہ، سرویا اور یونان دونوں سے کر چکا تھا۔ پس بلغاریہ کو لازم آیا کہ خاموش رہے اور موقع کا انتظار کرے۔ بلغاریہ نے وقتاً فوقتاً باری باری، روس، سرویا، یونان، آسٹریا، اٹلی اور ٹرکی سے دوستی کا اظہار کیا ہے، لیکن کسی سے سچائی کا برتاؤ نہ کیا۔ جیسے کوئی ناکتخدا عورت شادی کے لئے بہت مردوں سے محبت کا اظہار کرے، تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہرجائی کا شوہر بننا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ ع۔ کہ ایں عجوز عروس ہزار داماد است۔ ——— یہی حال بعینہ بلغاریہ کا ہوا۔

اہل رومانیہ چونکہ نسل اور زبان اور مذہب کے اعتبار سے لیٹن ہیں، لہذا اُن کو جرمن قوم سے نفرت اور سلاؤ قوم سے محبت ہے۔ اسی بنا پر اُن کو آسٹریا سے بھی ہمدردی نہیں ہے، کیونکہ ہنگری میں ۳۰ لاکھ رومانین قوم کی آبادی ہے، جن کے ساتھ آسٹریا کا برتاؤ بہت سخت ہے۔ اس کے علاوہ بلقان میں جا بجا پھیلا ہوا، ایک فرقہ ہے بنام نہاد Kutzo Vilachs جو خانہ بدوشی اور غارتگری پیشہ ہیں اور یہ رومانین نسل سے ہیں اور آسٹریا کی گورنمنٹ اُن کو اپنی پناہ اور حمایت میں رکھتی ہے۔ اس لیے جب کبھی رومانیہ نے کوئی اصلاح کا مسئلہ بلقان میں چھیڑا، آسٹریا نے خفیہ اور علانیہ دونوں طرح اُس کی مخالفت کی۔ سچ بات یہ ہے کہ ترکوں کی سلطنت میں جو مقدونیہ نے ترقی نہیں کی اور تمدن میں اور قوموں سے پیچھے رہا، اُس کا الزام ٹرکی پر ہرگز نہیں ہے، بلکہ آسٹریا نے اپنے جاسوس نہایت کثرت سے جا بجا بلقان میں مقرر کر رکھے تھے اور وہ لوگ

رہی کہ سپاہ کی آراستگی میں جو کمی ہے، اُس کی تکمیل کی جائے۔ سرویا کو یہ اُمید تھی کہ مانٹی نیگرو چالیس ہزار فوج سے، جو جنگ آزمودہ بہادروں کی ہے، مدد دے گا۔ اُس وقت جو سپاہ، سرویا میدان جنگ میں لانے والا تھا، اُس کی تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی، جس میں چالیس ہزار سرحدی گارڈ اور بیس ہزار قلعوں کی سپاہ شامل ہو سکتی تھی، گویا کل فوج کی تعداد تین لاکھ بیس ہزار ہو سکتی تھی۔

فرانسس جوزف شہنشاہ آسٹریا کی سلطنت میں کم سے کم ایک کرور رعایا سرب نسل کی ہے اور اُن میں سے بہت بڑا حصّہ ایسا ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کسی مناسب موقع پر، اپنے آپ کو آسٹریا کی حکومت سے آزاد کرے۔ پس سرویا یہ سمجھا کہ مانٹی نیگرو اور سرویا کی فوج مل کر جب آسٹریا پر حملہ کرے گی، تو اُس ملک میں جس قدر سرب ہیں وہ سب دوستانہ برتاؤ سے پیش آئیں گے اور ہمارے شریک ہو کر آسٹریا سے مقابلہ کریں گے۔ آسٹریا کو بلغاریہ سے اُمید تھی کہ وہ ہمارا شریک ہو گا، لیکن بلغاریہ کا خزانہ اور میگزین سب جنگ بلقان میں خالی ہو چکا تھا اور تین سو توپیں اور بہت کثیر تعداد میں رائفل وغیرہ سب چھن گئے تھے اور جو توپیں باقی تھیں، وہ کثرتِ استعمال سے بیکار ہو گئی تھیں۔ بلغاریہ کو یہ خوف بھی تھا کہ اگر میں نے آسٹریا کو مدد دی، تو سرویا پچھم کی طرف سے اور رومانیہ اُتّر کی جانب سے، مجھ پر حملہ کریں گے اور میں دو دشمنوں کے درمیان گھر جاؤں گا۔ رومانیہ کے پاس بہت بڑا خزانہ اور پانچ لاکھ سپاہ نہایت اعلیٰ درجے کی تھی اور اُس نے جنگ بلقان میں جب سے صلح کرائی تھی، تب سے بلقان میں پولیس کی ڈیوٹی اختیار کی تھی، یعنی اعلان کر دیا تھا کہ بلقان کی صلح میں اگر کسی ریاست نے خلل ڈالا، تو میں اُس سے

(الف) یہ کہ سردیا کی قوم نہایت تیزی کے ساتھ نقل وحرکت کر سکتی ہے۔

(ب) دریائے ڈینیوب کو عبور کرنے کی مشکلات۔

(ج) مانٹی نیگرو کا جوابی حملہ، لودی بازاریں۔

جب تک آسٹریا کی فوجیں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور دریاے ساؤ اور دریائے ڈینیوب کو عبور کرنے کی کوشش، بیدلی کے ساتھ کرتی رہیں، سردیا نے نہایت تیزی سے سپاہ کو حرکت دی اور جنوبی دستۂ سپاہ کو ریل سے مقام نش پر پہونچادیا اور بلغاریہ کی طرف سے اپنی سرحد کو محفوظ کرکے، اپنی مشرقی سرحد کی طرف کی سپاہ کو آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ مانٹی نیگرو نے اپنی فوج کا ایک دستہ Cattaro پر آسٹریا کو روکنے کی غرض سے بھیج دیا اور ایک زبردست فوج کا دستہ اُتر کی طرف روانہ کیا جس نے Visegrad پر آسٹریا کو دھمکی دی۔ اب آسٹریا مجبور ہوا کہ مانٹی نیگرو کے مقابلے کے واسطے اپنے بازو کی طرف سپاہ روانہ کرے، تاکہ وہ سردیا کی فوج سے ملنے نہ پائے۔

سردیا نے اپنے دارالسلطنت کو چھوڑ کر نش کی طرف جانے کا دھوکا آسٹریا کو دیا اور اصل میں اُتر پچھم کے گوشے کی طرف چلے۔ یہاں (Ushutza) سے دوسری فوج آکر شریک ہوگئی۔ آسٹریا کی فوج دریائے ڈینیوب وساؤ کو عبور کرنے میں نہایت سخت کوشش، کئی روز تک کرتی رہی، مگر سردیا کے گارڈ نے اور دوسری فوجوں نے، جو کئی جگہ سے آکر جمع ہوگئی تھیں، ایسا سخت مقابلہ کیا کہ آسٹرین سپاہ دریاؤں کو عبور نہ کرسکی۔ آسٹریا نے چاہا کہ سردیا پر پورب کی طرف سے، بڑی سپاہ سے حملہ کرے، اس میں بھی اُسے ناکامی ہوئی۔ تین دستے سپاہ کے، جو لشکر ہراول میں تھے، اسلئے یہیں

اس کام پر مقرر کیے جاتے تھے، جن کا نامۂ اعمال بدچلنی کے باعث سیاہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مثل مشہور ہوگئی کہ " بلقان کے جیل خانوں کو دیکھو تو اعلیٰ درجے کے بدمعاش اور بدافعال لوگ ملیں گے جو آسٹریا کے جاسوس ہیں"۔ آسٹریا کی پالیسی سو برس سے یہی رہی ہے کہ بذریعہ ایسے جاسوسوں کے، بلقان کی ریاستوں میں باہم نفرت پیدا کردی جائے، جس سے آسٹریا کو آسانی ہو کہ وہ چپکے چپکے بلقان میں اندر ہی اندر دخل پیدا کرتا جائے اور دریائے ایڈریے ٹک (Adriatic) کا مشرقی کنارہ آولونا (Avlona) تک اپنے قبضے میں کر کے Ægean Sea میں نکل کر سالونیکا (Salonica) تک پہونچ جائے۔ چونکہ مانٹی نیگرو اور سرویا راہ میں حائل تھے، لہذا یہ ضروری تھا کہ نووی بازار کے وادی کو قبضے میں لا کر، مانٹی نیگرو کو سرویا سے الگ کر دیا جائے، لیکن نووی بازار جنگ بلقان میں سرویا کے قبضے میں آچکا تھا، لہذا آسٹریا نے ضروری سمجھا کہ سرویا سے لڑائی کا حیلہ ڈھونڈھ کر نووی بازار چھین لے۔ یہ پولٹیکل ارادہ آسٹریا کے حق میں بہت تباہی کا سبب ثابت ہوا، جبکہ اُس نے سرویا کے مقابل میں مہم بھیجی۔

جب آسٹریا نے سرویا پر مہم بھیجی تو چاروں طرف سے نِش (Nish) گھیر لینے کا ارادہ کیا۔ دو پلٹنوں نے دریائے ڈینیوب بیلگریڈ کے نزدیک عبور کرنا چاہا اور تیسری پلٹن نے اُتر پچھم کی طرف سے دریائے ساؤ (Save) کے پار اُترنا چاہا اور چوتھی پلٹن وِسی گراڈ (Visegrad) کی طرف بڑھی، اس ارادے سے کہ نووی بازار پر حملہ کر کے مانٹی نیگرو کو سرویا سے الگ کر دے۔ یہ تجویز اصل میں بہت اچھی تھی مگر تین باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا، وہ نہیں رکھا گیا۔

نہ کرے گا۔ ۱۷، ۱۸، ۱۹ر اگست کو یہ فوجیں اس کثرت سے جمع ہوگئیں کہ اگر بازو سے آسٹرین سپاہ حملہ کرے تو اُس کو روک دیں۔ آسٹریا نے حملے پر حملے کیے، اس غرض سے کہ سروین حملہ آوروں کی صفیں توڑ دے۔ مگر یہ کوشش بے فائدہ ثابت ہوئی اور سرویا کی فوج کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکی۔ ۱۸ر اگست کو، تیسرے پہر، یہ معلوم ہوا کہ آسٹریا کی سپاہ نے حملہ کرنا موقوف کر دیا۔ اُس کا نقصان زیادہ ہوا اور سرویا کی سپاہ جو حملے روک رہی تھی اُس کا بال بیکا نہ کر سکی اور جو دو دستے سپاہ کے، یعنی ۴ اور ۹ نمبر کے، رُکے ہوئے تھے مدد کو نہ آ سکے۔ ۱۹ر اگست کو آسٹریا کی طرف سے حملے ہونے بالکل بند ہو گئے۔ آسٹریا کی دو پلٹنوں ۸ اور ۱۳ نمبر کی حالت بہت مایوسی کی ہوگئی اور دو پلٹنیں، جو دوسری جگہ پھنسی ہوئی تھیں، اُن سے مدد ملنے کی اُمید کچھ باقی نہ رہی۔ سامنے اور پہلو کی طرف آسٹرین فوج کے، سرویا کی فوج تھی جس کو شکست نہ ہوئی تھی اور پیچھے دریا تھا جو پایاب نہ تھا اور دریا کو عبور کر کے ایسے ملک سے جانا تھا، جہاں کے باشندوں کی حالت یہ تھی کہ اگرچہ دشمن نہ تھے تاہم کھلے بندوں باغی تھے۔ (یعنی باسنیا کے لوگ۔) ایسی صورت میں آسٹرین فوج کا ہٹنا کیا تھا، گویا شکست کھا کر بھاگنا تھا۔ اب ہر شخص کو اپنی فکر پڑی اور جس کے جدھر سینگ سمائے بھاگ کھڑا ہوا۔ نہ سڑکیں تھیں، نہ گاؤں، نہ کھیت۔ تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ادھر تو سرویا نے تعاقب کر کے دشمن کی سپاہ کو ہلاک کیا، اُدھر فاقہ کشی سے ہزاروں مر گئے۔ ۲۰، ۲۱، ۲۲ر اگست، تینوں دن سروین سپاہ نے تعاقب کیا اور آسٹرین فوج سے جو بچے تھے اُن کو دریائے ڈرینا کے اُس پار بھگا دیا۔ منجملہ ایک لاکھ بیس ہزار آسٹرین سپاہ کے جنھوں نے دریائے ڈرینا کو ۱۲، ۱۳ر اگست کو

پھوٹ گئے کہ وہ قلب سپاہ سے نہ مل سکے اور ایسے سردین فوج کی گھات میں پھنس گئے کہ ہلاک ہو گئے اور منجملہ تین ہزار چار سو آدمیوں کے صرف پچیس۲۵ زندہ بچے جو گرفتار ہو گئے۔

اس لڑائی کے بعد آسٹرین فوج نے ۹ر اور ۱۰ر اگست کو دریائے ڈرینا (Drina) کے پار اُترنا چاہا، جو سرویا کی مغربی سرحد ہے، لیکن عبور نہ کر سکے۔ ۱۱ر اگست کو آسٹرین فوج نے رائفلوں اور توپوں کی باڑھیں مارنا شروع کیں اور اُن کی آڑ میں، بڑی فوج سے تمام محاذوں، گرداوری کرتی رہی اور ہوائی جہازوں نے بڑی مستعدی سے کام کیا۔ تب بھی ان دونوں دریاؤں کے پار نہ جا سکی۔ سرویا کی فوج نے دیکھا کہ اب دشمن کی سپاہ ہماری فوج سے زیادہ آ گئی ہے اور اگر کسی دریا کو بھی اُس نے عبور کر لیا تو ہمارے دونوں بازوؤں پر سے حملہ ہو گا، تو اُس نے مناسب سمجھا کہ ذرا ہٹ جائے، تاکہ اپنی بڑی فوج سے جا کر مل جائے اور دشمنوں کی مدافعت کر سکے۔ سپاہ کا اس طرح بڑھنا، کچھ تو اپنی حفاظت کے لئے تھا اور کچھ اس غرض سے کہ آسٹرین فوج کو دونوں دریاؤں کے عبور کرنے کی ترغیب ہو۔ ۱۲ر اگست کو آسٹریا کی فوج ہر اوّل دریائے ڈرینا کے پار آ کر پورب کی طرف بڑھی اور دوسرے دستہ فوج نے دریائے ساؤ کو عبور کر لیا۔ دوسرے دن پیپوں کے پل کئی جگہ بنائے گئے اور آسٹریا کی سپاہ جوق جوق دریا کے پار اُتر کر سرویا میں داخل ہونے لگی۔

اس وقت سرویا کی امدادی فوجیں نہایت تیزی سے آ گئیں۔ یہ تیزی ایسی تھی کہ اگر کسی نے جنگ بلقان میں سردین فوج کی گرداوری نہ دیکھی ہو تو وہ یقین

اور مانٹی نیگرو کی فوجوں نے اُن کو مار کر نکال دیا۔

شروع میں آسٹریا نے اپنے دشمن کو حقارت سے دیکھا اور اپنی سپاہ کو اِدھر اُدھر تقسیم کر دیا۔ جس وقت سے آسٹریا کو سرویا کے مقابلے میں کامل فتح اور فوری کامیابی کی اُمید جاتی رہی، اُس وقت آسٹرین سپہ سالاروں کی عقل گُم ہو گئی اور بغیر کسی مطلب یا مقصد کے کبھی فوجیں اِدھر، کبھی اُدھر بھیجیں اور اس بیہودگی میں اپنا وقت مفت رائگاں کیا اور اپنی سپاہ کی طاقت زائل کر دی۔ سروین یہ دیکھ کر کہ آسٹرین سپاہ کا نہ کوئی مضبوط ارادہ ہے، نہ کوئی خاص غرض ہے، اُن کو اچھی طرح ناچ نچاتے رہے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ سروین گت بجا رہے ہیں اور آسٹرین جنرل اُس پر ناچ رہے ہیں۔ جس وقت موقع پایا سروین سپاہ نے دن سے دھاوا مارا اور آسٹرین سپاہ نیست و نابود ہو گئی۔

ایک مہینہ کچھ کم میں سرویا کی ڈھائی لاکھ فوج نے، جن کو آسٹریا نے حقیر سمجھا تھا، آسٹریا کی فوج کو جو تعداد میں کچھ زیادہ تھی، نہایت زبردست شکست دی اور سامان جنگ آدھے کے قریب چھین لیا اور کئی ہفتوں تک اُس کو لڑنے کے لائق نہ رکھا۔ لیکن یہ جنگ شابیٹس، جو جیدر (Jador) کی لڑائی بھی کہلاتی ہے، اس کا اثر دور تک پہونچا۔ یہ پہلی لڑائی تھی جس کا نتیجہ قطعی طور پر آسٹریا کے خلاف ہوا اور اُس کا اثر بھی بُرا ہوا، یعنی یہ کہ آسٹریا کو معلوم ہو گیا کہ سرویا کے مقابل میں بھی اُس کو کامیابی کی اُمید نہ کرنا چاہیے اور دو فوجیں آسٹریا کی، جو جرمنی کو آلساس لورین میں مدد دینے کے واسطے مامور تھیں، فوراً واپس بلالی گئیں اور بزرد فوج جو روسیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے گالیشیا میں بھیجی جانے کو تھی وہ

مجبور کیا تھا، بیس ہزار مارے گئے اور زخمی ہوئے اور پانچ ہزار سے زیادہ قید ہوئے اور جو باقی بچے اُن میں بہت سے بھوک کے مر گئے یا اوس اور سردی میں غیر محفوظ رہنے سے ہلاک ہوئے یا بھاگ کر گھر چل دیے۔ آسٹریا کی ساٹھ توپیں سرویں کے ہاتھ آئیں اور علاوہ اس کے بہت سامان جنگ ملا۔ جبکہ آسٹریا کی فوج بھاگ رہی تھی، سرویا کی سپاہ نے تعاقب موقوف کر کے اُتر اور پورب کا رُخ کیا، تاکہ جو سپاہ آسٹریا کی اُس طرف پھنسی ہوئی تھی اُس کو گھیر لے۔ اس سپاہ کے جنرل نے سرویا کے مورچوں پر بہت سخت حملہ کیا اور اس حملے کی آڑ میں اپنے لشکر کا بڑا حصہ ہٹا کر دریائے ساؤ کے کنارے کی طرف لے گیا۔ اس حملے میں آسٹریا کا نقصان بہت زیادہ ہوا اور دریائے ساؤ میں جو آسٹریا کے جنگی جہازوں کا بیڑا پڑا ہوا تھا، اُس نے آسٹریا کی باقی ماندہ سپاہ کو دریا کے پار اُتار دیا اور قید ہونے سے بچا دیا پس ۲۴ر اگست کو یہ باقی ماندہ کم بختی کے مارے سپاہی، سرویا کی سرزمین کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور اُس چھوٹی سی حقیر سمجھی ہوئی ریاست سرویا پر جو مہم سزا دینے کے واسطے بھیجی گئی تھی اُس کا خاتمہ ہو گیا۔

اب آسٹریا کی صرف ایک فوج سرویا کی زمین پر رہ گئی، جس نے پہلے پہل سرویا کے مشرقی حصے پر حملہ کیا تھا۔ جب روس نے گالیشیا (Galicia) پر مہم بھیجی تھی، اُس وقت یہ فوج آسٹریا واپس بلائی گئی تھی کہ روس کی سپاہ سے مقابلہ کرے۔ لیکن بہت دور نہ پہونچی تھی کہ جنگ شابیٹس (Shabatz) کا حال سُن کر پھر سرویا آگئی۔ اس فوج نے ۸، ۹، ۱۰ر ستمبر کو سرویا کا مقابلہ کیا تھا لیکن شکست کھائی تھی۔ باسنیا کی سپاہ کے جو دستے شابیٹس کی شکست فاحش میں شریک نہ تھے، وہ سرویا کو چھوڑ کر وسی گراڈ کی طرف پیچھے ہٹ گئے، مگر وہاں سے بھی ۱۱ر ستمبر کو سرویا

نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ شکست کھائے گی یا اپنے ریلوے سنٹر (Centre) سے، جو Brest Litovsk میں تھا، پیچھے ہٹا دی جائے گی۔

آسٹریا کی بدقسمتی سے روس ان سب تجویزوں سے جو جرمن نے سوچیں آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے مسلسل کئی حملے ایسے کیے کہ جرمن اور آسٹریا کو گمان بھی نہ تھا، جس سے سب پروگرام آسٹریا اور جرمنی کا بگڑ گیا۔ جنرل Rennen Kampf نے مشرقی پرشا میں ایسا چھاپا مارا کہ جرمن فوج آسٹریا کی فوج سے نہ مل سکی۔ اس نے برلن میں رسد پہونچنے کے ذریعے بالکل بند کر دیے اور Konigsberg اور Dantzic اور Thom کو ایسی دھمکی دی کہ جرمن کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ جب جرمن کو اپنے شہروں کے چھن جانے کا خوف پیدا ہوا، تو روسی پولینڈ سے سپاہ واپس آئی، جہاں فوج ہراوُل مقام لاڈز (Lodz) تک پہونچ گئی تھی، جو وارسا کی راہ میں ہے، اور نہایت بدحواسی سے جلد پرشا میں جمع ہو گئی تاکہ کاسک حملہ آور روس کا مقابلہ کرے۔ اس وجہ سے آسٹریا کی فوجیں جو روسی پولینڈ کے کیمپ میں تھیں، اُن کی موت زیست روسی جنرلوں کے ہاتھ میں آ گئی جنرل ڈاکل (Daukl) اور جنرل آفین بیرگ (Auffenberg) اور گرینڈ آرچ ڈیوک جو آسٹریا کی فوجوں کے سپہ سالار تھے، اُن کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اُن کے پاس ڈھائی ہزار توپیں اور دس لاکھ چیدہ جوان فوج نظامیہ کے تھے۔ ان کے علاوہ ملیشیا (Militia) کی بڑی تعداد گالیشیا میں تھی۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ روس ایک بیوقوف دیو ہے، جو خواب غفلت میں ہے اور جب تک اُٹھے اُٹھے گا، ہم اُس کو ہلاک کر دیں گے۔ پس ان جنرلوں نے دو بڑی زبردست سپاہیں سرحد پر

بجائے پورب کے دکھن کی طرف روانہ کی گئی اور خود جرمن نے مناسب سمجھا کہ اپنی سپاہ فرانس اور بلجیم سے ہٹا کے آسٹریا بھیج دے۔ بجائے اُس فوج کے جو آسٹریا نے سرویا بھیج دی تھی۔ غرضکہ سرویا نے اتحادیوں میں سب سے پہلے قومی آزادی حاصل کرنے کے لیئے جرمنی کے فوجی غلبے کو سخت صدمہ پہونچایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سرویا کی توپوں کی گرج جو مقام شابٹیش میں پیدا ہوئی وہ صوفیہ اور قسطنطنیہ بلکہ بحرایڈریٹک کے پار روما تک گونج اُٹھی۔

گالشیا میں جرمن فتوحات

اور لیمبرگ (Lemberg) پر قبضہ

اب روس کے معرکے جرمن اور آسٹریا کے مقابلے میں بیان کیے جاتے ہیں۔ جرمنی نے دونوں طرف میدان جنگ میں یعنی فرانس اور روس کے مقابلے میں فتح حاصل کرنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ لیکن تیس لاکھ سپاہ کی ضرورت، اُس کو فرانس کے مقابلے میں لے جانے کی تھی اور صرف دس لاکھ سپاہ ملیشیا (Militia) وہ روس کا حملہ روکنے کی غرض سے چھوڑنا چاہتا تھا اور آسٹریا ہنگری پر بھروسا کرتا تھا کہ وہ مشرق کی طرف سے روس پر حملہ کرے گا۔ آسٹریا اور جرمن نے ارادہ کیا تھا کہ روسی پولینڈ کو فتح کرنے کے لئے حملہ کریں۔ تجویز یہ تھی کہ آسٹریا کی دس لاکھ فوج گالشیا سے بڑھے۔ اُسی وقت جرمن سپاہ اُسی تعداد کی، لیکن ذرا گھٹیا قسم کی، مشرقی پرشا اور جرمن پولینڈ کی طرف وارسا (Warsaw) پر حملہ کرے۔ اس سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ روسی فوج پر تین طرف سے حملہ ہو جائے گا جس کا

جس سے ایک ہزار سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جو تھوڑے بہت باقی بچے، اُن کا تعاقب کاسکوں نے کیا اور اب گالیشیا پر روسیوں نے بڑی زبردست فوج سے حملہ کیا۔ جنرل رسکی (Russky) کا دستۂ سپاہ اُتر کی طرف لیمبرگ پر بڑھا اور جنرل Brussiloff کی سپاہ پورب کی طرف سے حملہ آور ہوئی، تاکہ دونوں فوجیں مل کر آسٹرین فوج سے تعداد میں زیادہ ہو جائیں، جو لیمبرگ کی حفاظت کر رہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک جنرل کی علیحدہ علیحدہ سپاہ، آسٹرین فوج کے مقابل میں مغلوج ہو جاتی، لیکن دونوں جنرلوں نے مل کر ایسی خوش تدبیری سے حملہ کیا کہ جنرل Brussiloff کی فوج گالیشیا کے اندر خفیہ گھس گئی اور پیشتر اس کے کہ دشمن سے کوئی بڑی لڑائی پیش آئے، ملک کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا۔ اس سپاہ کا گالیشیا میں داخلہ نہایت پوشیدہ طور پر عمل میں آیا اور ۱۹ اگست سے ۳۱ اگست تک ۱۳ دن میں روز روشن میں ہوا اور باوجودیکہ آسٹریا کے جاسوس نہایت کثرت سے تھے اور سواروں کے علاوہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سرحد کی نگرانی ہوتی تھی، لیکن تب بھی روسی فوج کے داخلے کا بھید اُس وقت کھلا جب موقع نکل گیا۔

اس بھید نہ کھلنے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ مشرقی گالیشیا، جس طرف سے جنرل Brussiloff اپنی فوج لایا، پُرانے زمانے میں روس کی ایک ڈچی تھی، جو اُس سے نکل کر آسٹریا کے ملک میں شامل ہوگئی تھی۔ مشرقی گالیشیا گویا سلطنت روس کا آلساس لورین تھا، جس کے باشندے سلاو نسل سے تھے اور جرمن زبان بولتے تھے اور پراٹسٹنٹ مذہب رکھتے تھے۔ جو Brussiloff کی فوج کے سپاہیوں کا تھا جب روسی سپاہ داخل ہوئی تب قصبوں اور گاؤں کے باشندوں نے نکل کر بڑی

جمع کیں۔ ایک دریائے وسٹولا (Vistula) اور دوسری دریائے بُوگ (Bug) کے پہلو بہ پہلو بڑھی۔ انھوں نے اسّی میل تک لڑائی کی لین قائم کی اور کالم (Kholm) کی طرف اس ارادے سے چلیں کہ وارسا پر دھاوا ماریں گے۔ روسی جنرلوں نے مشرقی گالیشیا کی سرحد کی لمبائی میں کاسک کی قوم، بطور پردہ کے قائم کر دی اور اُس کی آڑ میں فوجیں نقل و حرکت کرتی رہیں۔ ڈیڑھ سو میل کی لمبائی میں ہر راستے اور پل پر دریائے نیسٹر (Dniester) اور دریائے بُوگ کے درمیان، یہ کاسک ٹڈ بھیڑ کرتے رہے۔

لڑائی کے شروع سے دو ہفتے تک یہی کیفیت رہی، یہاں تک کہ آسٹرین سپہ سالار جو لیمبرگ میں تھا، یہ سمجھا کہ یہ محض بیہودہ شورش ہے اور کچھ نہیں ہے۔ تب اُس نے دو ہزار سپاہی بھیجے کہ Podolia میں گرداوری کریں۔ جب یہ Gorodok مقام پر پہونچے، تو وہاں نو سو کاسک تھے، جن کے پیچھے آڑ میں بڑی فوج تھی۔ ان کاسکوں نے آسٹریا کی گرداور فوج کو پسپا کر دیا اور بڑی فوج جو آڑ میں تھی اُس سے مدد نہیں مانگی، کیونکہ اُس میں بھید کھُلنے کا اندیشہ تھا۔ کاسکوں نے قصبے سے نکل کر جنگل میں صفیں آراستہ کیں۔ اُن میں سے تیس سپاہی آگے بڑھے اور آڑ میں بڑھتے ہوئے چلے گئے، یہاں تک کہ آسٹرین سپاہ کے مقابل آ گئے۔ مقابل آتے ہی کاسک بھاگ کھڑے ہوئے اور ظاہر کیا کہ گویا خلاف اُمید، یکایک مقابلہ ہو جانے سے گھبرا گئے ہیں۔ آسٹرین فوج اس حیلے کو نہ سمجھی اور بے تحاشا کاسکوں کا پیچھا کرنے لگی۔ ان کا پیچھا کرتے کرتے ایسی جگہ پہونچ گئی، جہاں روسی فوج گھات میں بیٹھی تھی۔ یہاں دونوں طرف سے رائفل اور توپوں کی باڑھ اُن پر پڑنے لگی،

کے پار جا پہونچی۔ اُس وقت بھی آسٹرین سپہ سالار نے یہ شبہ کیا کہ جنوب کی طرف سے ہمارے عقب پر دشمن کا حملہ ہونے والا ہے۔ آسٹریا کی تین بڑی بڑی فوجیں تھیں، جو لیمبرگ کے آس پاس ڈیڑھ سو میل لمبی لڑائی کی لین کی حفاظت کر رہی تھیں لیکن جب معلوم ہوا کہ دونوں روسی جنرلوں کی فوجیں حملہ کریں گی، تو اور دو بڑی فوجیں علاوہ ملیشیا وغیرہ کے، دونوں جنرلوں میں آسٹریا نے اضافہ کیں۔ یہاں تک کہ پورے تین لاکھ آسٹرین سپاہی لیمبرگ کے گرد جمع ہو گئے۔ یہ جو کچھ آسٹریا نے کیا، اگست کے آخری دنوں میں بہت دیر بعد کیا۔ جنرل رسکی اور جنرل Brussiloff کی فوجیں لیمبرگ سے چالیس میل کے فاصلے پر پورب کی جانب متعین ہو گئیں اور اب متفقہ فوجیں جنرل رسکی کی کمان میں لیمبرگ پر حملہ آور ہوئیں۔ آسٹریا کے جنرل کوئی ایسے نہ تھے جو روسی سپہ سالاروں کا مقابلہ، دماغی طاقت یا فوجی کرتب میں کر سکتے۔ دونوں فوجیں آخر میں تعداد میں برابر ہو گئی تھیں، لیکن روس کی توپیں جو فرانس کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں، آسٹریا کی توپوں سے بہتر تھیں، اس کے علاوہ آسٹریا نے اپنے نہایت مشہور Howitzer ۱۲ انچ کے، مع بہت سے افسر توپخانہ کے، جرمن کی مدد پر فرانس اور بلجیم کی جانب بھیج دیے تھے جن کے بھیج دینے سے آسٹریا کے سرحدی قلعے مثل لیمبرگ وغیرہ کے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ جنوبی سپاہ کی مدد کے لئے جو دو پلٹنیں بھیجی گئی تھیں، وہ روسی جنرل رسکی نے مقام Zloezow پر روک دیں اور پراگندہ کر دیں اور فتحمند روسیوں نے آگے بڑھکر ایک پہاڑ موسومہ بہ Naked Hill پر قبضہ کر لیا جہاں سے لیمبرگ کی قسمت کا فیصلہ وہ اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے تھے۔ اس

خوشی سے روسیوں کا استقبال کیا اور اُن کو اپنا بھائی سمجھا۔ اور قصبوں اور شہروں
میں چھتوں سے سڑکوں پر، روسی فوج پر پھول برسائے اور لوگ یہ سمجھے کہ ہمارے
بھائی آئے ہیں، جو اس پُرانی ڈچی کو آسٹریا کے پنجے سے چھڑائیں گے۔ دوسری وجہ
یہ تھی کہ روسیوں کے خفیہ ایجنٹ اور جاسوسوں نے گالشیا کی اُس رعایا کو پہلے
سے تیار کر رکھا تھا کہ جب روس کا حملہ ہو تو اپنی خوش قسمتی سمجھیں۔

کاسک جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ایک جنگجو قوم ہے، جو لڑکپن سے ایسی تعلیم
و تربیت پاتی ہے کہ تمام عمر لڑائی میں بسر کرے۔ پرشن قوم بھی اپنے آپ کو ایسا ہی
کہلانا پسند کرتی ہے، مگر اصل میں ایسی ہے نہیں۔ قدیم زمانے میں کاسکوں اور منگولوں
میں بہت جنگ و جدل رہی۔ کاسکوں نے پہلے پولینڈ کی سلطنت قائم کی اور پھر
اپنی آزادی برقرار رکھنے کی غرض سے، ڈیوک آف ماسکو کے طرفدار ہو کر انھوں
نے روس کی سلطنت قائم کی۔ روس کی فوج میں یہ فرقہ نہایت بکار آمد ہے۔ ہر قسم
کی لڑائی لڑ سکتا ہے اور ہر قسم کے کرتب لڑائی کے جانتا ہے۔ کبھی نیزے سے حملہ کرتا
ہے کبھی گھوڑے سے اُتر کر سنگین ہاتھ میں لے کر پیدل کی طرح دھاوا کر کے مورچے
فتح کرتا ہے۔ بوقت ضرورت خود مورچے بنا لیتے ہیں اور مورچوں سے اعلیٰ درجے
کے نشانے لگاتے ہیں۔

باوجودیکہ روسیوں کی سپاہ لیمبرگ کے نزدیک آتی گئی اور اکثر آسٹریا اور
روس کی سپاہ میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں مٹھ بھیڑ بھی ہوتی رہی، تب بھی آسٹریا
کے سپہ سالار کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے رہے۔ یہاں تک کہ روسی جنرل
Brussiloff کی سپاہ کئی دریاؤں کو یکے بعد دیگرے عبور کر کے Golden Hipa

ہوئی اور ۴۸ گھنٹے رہی۔ تیس ہزار آسٹرین مقتول اور زخمی ہوئے اور روسی فتحیاب ہوئے ؎

قوی دست را فتح شد رہنموں   بزنہار خواہی در آمد زبوں

اس فتح کے بعد روسی سپاہ، لیمبرگ کی جانب بڑھی اور آسٹریا کی باقی ماندہ ٹوٹی پھوٹی سپاہ کو بھگا دیا۔ جنرل رسکی کی سپاہ نے جو فاصلہ کہ Zloezow سے لیمبرگ تک چالیس میل کا تھا، وہ بہت جلد طے کر لیا (حالانکہ فوج ستّرہ دن سے برابر کوچ کرتی ہوئی اور لیمبرگ کی طرف لڑتی بھڑتی آتی تھی) اور شہر مذکور کے قریب چند مضبوط مقام فتح کر لیے۔ چھ روز تک ہنگامہ کارزار گرم رہا یعنی ۲۹ راگست سے ۳ ستمبر تک۔ روسی سپاہ صبح سے شام تک اور آخر میں دن رات لڑتی رہی اور آسٹرین سپاہ بھی نہایت تیزی سے لڑنے میں سرگرم رہی۔ روسی فوج گو نہایت تھکی ہوئی تھی اور گرمی کے موسم کے باعث پیاس سے بہت تکلیف اُٹھا رہی تھی لیکن فتح کی اُمید کی خوشی میں، پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے لڑی۔ آسٹرین فوج جب جنگ سے تنگ آئی تو لیمبرگ کے قلعوں میں پناہ لی۔ اب روسیوں نے قلعے کے آہنی گنبدوں پر گراب مارنا شروع کیے۔ جو کچھ کہ بلجیم پر آفت آئی اور ناموریں گذری اور جو کچھ فرانس پر موبژیں اُفتاد پڑی (بوجہ اُن آسٹرین Howitzers کے جو بطور مدد کے جرمنی کو دیے گئے تھے) اُن سب کے بدلے میں گالیشیا کے قلعوں کی سپاہ کو مصیبت برداشت کرنا پڑی اور اُن کے سب مضبوط قلعوں اور اُن کے آہنی گنبدوں کو روسی Howitzers نے جو فرینچ کارخانوں میں بنے ہوئے تھے دو دن میں توڑ پھوڑ کے برابر کر دیا اور آسٹرین توپیں بھی توڑ دیں۔ جب توپیں بیکار

عرصے میں جنرل Brussiloff کی سپاہ نے جنوب کی طرف سے لیمبرگ کو گھیر لیا اور آسٹریا کی بڑی فوج کا، جو جنوبی حصہ تھا، اُس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ فوج مقام Holiez میں دریائے Zipa کے کنارے مورچے قائم کیے ہوئے تھی جس جگہ پر آسٹرین سپاہ تھی، وہ قدرتی طور پر بہت محفوظ تھی، کیونکہ جوالا مکھی پہاڑ کا ڈھالو کرارا تھا اور اُس کا آتش فشاں دہانہ بھی تھا، جو اس وقت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اُس کو حملہ کر کے لینا مشکل تھا۔ آسٹرین انجینیروں نے بیس چھوٹے چھوٹے قلعے Holiez کے آس پاس بنائے تھے۔ دریا کا راستہ نہایت دشوار گذار تھا، مگر روسی سنگینیں دریا، خندق، مورچے سب پر غالب آئیں اور گولہ اندازوں نے قلعوں اور مورچوں کے ٹکڑے اُڑا دیے اور پیدل سپاہ کے لئے راہ پیدا کر لی پہلے تو روسی کھلے بندوں سامنے سے جھپٹے۔ پھر لیٹ کر رینگتے ہوئے چڑھے اور بلندی کی طرف فیر کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جب زیادہ نزدیک پہونچ گئے تو ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور ایک جگہ پکڑ کر گولیاں برسانا شروع کیں۔ اتنے میں اُن کی مدد بھی آ پہونچی۔ پھر کیا تھا۔ سنگینیں ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے اور پرانا مقولہ جو روسیوں میں مشہور چلا آتا ہے سچ کر کے دکھا دیا یعنی یہ کہ "The Bullet is a fool, but the Bayonet is a hero" یعنی گولیاں بیوقوف چلایا کرتے ہیں اور بہادر سپاہی سنگین سے موت کے گھاٹ اُتارتے ہیں۔ آسٹرین اور ہنگیرین سپاہی بھی خوب لڑے اور اُنھوں نے پورے طور پر داد شجاعت دی خوب سنگینوں کا مقابلہ کیا اور خود بھی سنگینیں چلائیں، لیکن اُن کی بندوقوں کے نشانے ٹھیک نہیں لگتے تھے کہ روسیوں کے حملے روک سکتے۔ یہ لڑائی اسر اگست کو

ہو گئے۔ آسٹرین سپاہ کے چند دستوں نے مقابلہ بھی کیا، لیکن ہلاک اور گرفتار ہوے۔ شہر کے سلاؤ باشندوں نے روسیوں کا خیر مقدم کیا اور خوشی کے نعرے بلند کیے اور روسیوں کے قومی گیت گائے۔ اِدھر کچھ توپوں کے فیر کی آوازیں آئیں، جو بھاگتے ہوئے دشمن نے شہر سے باہر کیے تھے۔ گویا اُنھوں نے بھی روسیوں کی آمد کی مبارکباد میں سلامی دی۔ بالاخانوں سے جہاں لوگ تماشا دیکھ رہے تھے، پھول برسائے گئے اور مرد و زن سب وہ زبان بولتے تھے جو روسی سپاہ سمجھ سکتی تھی۔ سپاہیوں کے ہاتھ چومتے تھے اور اُن کے روبرو کھانے کی چیزیں پیش کرتے تھے۔ سپاہی گو نہایت تھکے ہوئے تھے، کیونکہ رات دن سوائے لڑائی کے اُن کو کوئی دوسرا کام نہیں رہا تھا، لیکن جب وہ بازاروں میں آئے تو خوشی کے مارے اپنی تکان اور بھوک پیاس سب بھول گئے۔

ساڑھے دس بجے صبح روسی پھریرا ٹاؤن ہال پر لہرانے لگا اور شہر کے رئیسوں کا ایک وفد روسی جنرل رسکی کی بارگاہ میں حاضر ہوا، جس نے اہل شہر کی یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم سلاؤ قوم کے باشندے سلطنت روس کی خیر خواہ رعایا بننے کو تیار ہیں فتحمند فوج کا طریق عمل نہایت قابل تعریف تھا۔ چونکہ رسد کے سامان سے گاڑیاں بھری ہوئی ساتھ تھیں، اس لئے اُنھوں نے شہر کے باشندوں سے کسی قسم کی مدد نہیں چاہی اور سپاہ کے سرداروں نے میونسپل جماعت کی مدد سے فوراً امن و امان قائم کر دیا۔ اسباب غنیمت جو ہاتھ آیا وہ آسٹرین فوج کا میگزین تھا، دو سو توپیں ڈیرے، خیمے اور سب سامان لڑائی کا جو بے شمار تھا، کیونکہ آسٹریا اور ہنگری کے ہر حصے سے جمع کر کے لیمبرگ میں اکٹھا کیا گیا تھا کہ سرحد پر چھ مہینے یا زیادہ تک فوج کے کام آئے۔

ہوگئیں تو آسٹرین فوج اس خوف سے کہ مبادا روسی سپاہ سنگینوں سے حملہ کرے، مورچے چھوڑ کر واپس ہوئی۔ مگر اس واپسی میں فوج چنداول یعنی سب سے پیچھے کا دستۂ فوج بھاگا اور اُس کے بھاگتے ہی سب سپاہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ پیچھے کا دستۂ فوج جو بھاگا اور اس سے تمام لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، وہ حال عجیب و غریب حسب ذیل ہے۔

آسٹرین اور ہنگیرین افسروں نے اپنے آپ کو اور اپنے ہموطنوں کو بچانے کی غرض سے اپنے پیچھے سلاؤ قوم کی رجمنٹیں کھڑی کی تھیں، جن میں گالیشیا کے روسی، پولینڈ کے باشندے، باسنیا کے سردین اور بوہیمیا کے باغی سپاہی تھے اور اُن کے پیچھے ہنگیرین سپاہی کھڑے کیے تھے، تاکہ اگر یہ رجمنٹیں لڑنے سے انکار کریں یا روسیوں سے مل جائیں تو ان صورتوں میں وہ توپ سے اُڑا دی جائیں۔ روسی جنرل کو یہ حال معلوم ہوگیا تھا۔ اُس نے حکم دے دیا کہ گراب اُسی دستۂ فوج پر مارے جائیں جو سب سے پیچھے ہے۔ گولہ اندازوں نے ایسے نشانے لگائے کہ شیل سلاؤ رجمنٹوں کے سروں کے اوپر سے گذر کر آسٹرین اور ہنگیرین فوج میں جا کر گرتے تھے اور وہاں پھٹتے تھے۔ ان توپوں کی ہولناک گرج نے اور اس شیل اور گراب نے جو اولوں کی طرح گر رہے تھے اور پھٹ کر چاروں طرف موت کا بازار گرم کر رہے تھے، لیمبرگ سے واپس ہوتی ہوئی سپاہ کو سخت گھبراہٹ میں ڈال دیا۔ کائی سی پھٹ گئی اور فوج کے کالم کے کالم ٹوٹ گئے اور تمام فوج تتر بتر ہوگئی اور توپیں اور میگزین اور سامان رسد چھوڑ کر Gorodok کے قلعے کی طرف بھاگی۔

اب روسی اُتر، دکھن، پورب تین طرف سے لیمبرگ میں جمع ہوگئے اور آخری لین قلعوں کی لے کر ۳ ستمبر، منگل کے دن، نو بجے صبح شہر مذکور کے بازاروں میں داخل

یہ کام آسان تھا کہ وہ اپنے پرانے دشمن پرشا پر حملہ کرتا۔ لیکن پرشا نے اُس کو دھوکا دیا اور ہنگری نے، جو روس سے بدلہ لینا چاہتا تھا، اُس کو روس سے لڑنے کی ترغیب دی۔ ان دونوں وجہوں سے آسٹریا روس سے بھڑ گیا اور اپنی شامت اعمال سے اپنے آپ کو اُس نے تباہ کیا۔ آسٹریا نے جو مہم روس کے مقابلے پر بھیجی، وہ پہلے تین ہفتے تک کامیابی کے ساتھ کام کرتی رہی۔ سرحد کے پار جا کر پانچ لاکھ آسٹرین سپاہ، روسی سرزمین پر پھیل گئی اور وارسا اور Brest Litovsk کی طرف بڑھی۔ یہ فوج دریائے وسٹولا کی طرف بہت آہستگی سے آگے بڑھی اور اُس کے دونوں طرف پھیل گئی۔ پھر اُس کے بائیں کنارے پر Radom کی جانب اور داہنے کنارے پر کالم اور لبلین (Lublin) کی طرف آہستگی سے بڑھی جس کی وجہ یہ تھی کہ آسٹریا کو جرمن کے آنے کا انتظار تھا۔ لیکن جرمن کی سپاہ ہراوُل لاڈز اور Petrokov تک آ کر واپس گئی، کیونکہ جو جوابی حملہ مشرقی پرشا پر کیا تھا اُس کے باعث جرمن نے اپنی تمام سپاہ، جو وہ فرانس کے محاذ سے بچا کر لا سکتا تھا، مشرقی پرشا پر ڈال دی تھی۔ اب آسٹریا کو مشکل کا سامنا آ گیا۔ جرمن کی مدد کے وعدے پر اعتبار کر کے ایسی سخت خطرناک مہم اپنے ذمہ لی تھی اور اب ایسے نازک وقت پر اُس کو محض اپنے بھروسے پر کام کرنا پڑا۔ آسٹرین جنرل زیادہ دور تک ملک روس میں بڑھ نہ سکتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس قدر ہم آگے بڑھ جائیں گے، اُسی قدر ہم اپنے ملک سے دور پڑ جائیں گے اور فوجوں کی مدد اور اُن کی آمد و رفت میں دیر لگے گی۔ کیونکہ روس کے ملک میں نہ ریلیں زیادہ ہیں، نہ اچھی سڑک کی کثرت ہے۔ یہ بھی جانتے تھے کہ اس ملک میں نپولین کی سپاہ نے شکست فاحش کھائی تھی۔ ان خیالات کی

دریائے وسٹولا (Vistula) اور دریائے نیسٹر (Dniester) پر روسیوں کی فتح اور افواج آسٹریا ہنگری کی ہلاکت و تباہی

کئی صدیوں سے آسٹریا حملہ آوروں کی جولانگاہ رہا ہے۔ ترکوں نے، سوئیڈن کے باشندوں نے، پرشا والوں نے اور فرینچ نے وقتاً فوقتاً اس پر حملے کیے۔ ایک دفعہ ترکوں نے دارالسلطنت ویانا (Vienna) بالکل لے لیا ہوتا، اگر پولینڈ کے بادشاہ John Sobleski نے اُس کو نہ بچایا ہوتا، مگر اُس کا شکریہ آسٹریا نے یوں ادا کیا کہ پولینڈ کی سلطنت پامال کرنے میں، جو کوشش چند شاہان یورپ نے کی، اُن میں آسٹریا شریک غالب تھا۔ روسیوں نے ۱۹ صدی کے وسط میں ہنگیرین قوم کو آسٹریا کی حکومت سے آزاد ہونے سے روک دیا۔ اس کا بدل آسٹریا، نہایت کفرانِ نعمت کے ساتھ کر رہا ہے کہ روس سے مُتصادم ہے یہ کام آسٹریا نے بڑی بیوقوفی کا کیا۔ گو ہنگیرین قوم روس سے اس بات کا بدلہ لینا چاہتی ہے کہ روس نے اُس کی آزادی کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور اسی وجہ سے آسٹریا سے موافقت کر رہی ہے، لیکن تب بھی آسٹریا کا روس پر حملہ کرنا، ایک دیوانگی کی حرکت ہے کیونکہ آدھی رعایا آسٹریا کی ایسی ہے جو سلاؤ نسل سے ہے اور اپنے حاکموں سے ناخوش رہ کر، روس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ یہ آدھی رعایا آسٹرین قوم کے خلاف ہے اور روس کی طرفداری کی خواہشمند ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جس وقت آسٹریا روس کے مقابل میں میدان جنگ میں آیا، اُس کی تباہی اور بربادی ہوتی گئی۔ روس پر حملہ کرنے میں آسٹریا کو کامیابی کی اُمید برائے نام بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس سے تو

جہاں گرانڈ ڈیوک نکولس (Grand Duke Nicholas) روسی سپہ سالار یا قائد اعظم اُن کو لانا چاہتا تھا۔ ۲۲ر سے ۲۹ر اگست تک، روسی سپہ سالار نے آسٹرین حملہ آور فوج کو Lublin-Kholm ریلوے لین لینے سے روکے رکھا۔ دو مشین گن کے افسروں نے کچھ بلندی پر سے گولے مارے اور حملہ آوروں کی صفوں کو بہت نقصان پہونچایا اور پھر سنگین سے روسیوں نے ایسا حملہ کیا کہ آسٹرین سپاہ مقابلے کی تاب نہ لاسکی اور بھاگی اور بھاگنے میں ایک دلدل میں پھنس گئی، جس میں سے چھ ہزار سپاہ گرفتار ہوگئی۔

روسیوں کی سنگینوں نے آسٹرین سپاہ کے مقابلے میں بڑا کام کیا۔ یہ سنگینیں جرمن کے مقابلے میں بھی حملے کا عمدہ اوزار ثابت ہوئیں لیکن آسٹریا کے لئے تو پورا قہر تھیں۔ پولینڈ کے دریاؤں کے درمیان جو سلسلہ لڑائیوں کا روسیوں اور آسٹرین فوجوں کے درمیان رہا۔ اُن میں ڈھائی لاکھ آسٹرین روسی سنگینوں کی بدولت گرفتار ہوئے۔ صرف ایک موقع پر سنگینوں کے حملے میں ناکامی ہوئی اور ایک سارجنٹ میجر، جو سپاہ کے ساتھ تھا، حملہ کرنے میں گرفتار ہوگیا۔ اتفاقیہ جس افسر کے چارج میں دے دیا گیا، وہ سلاف قوم کا ایک عہدہ دار تھا۔ روسی اور آسٹرین عہدہ داروں کی بولی ملتی جلتی تھی، جس کو دونوں سمجھ لیتے تھے۔ روسی افسر نے نہایت فصاحت سے بیان کیا کہ آسٹریا میں جو سلاف قوم کی سپاہ ہے، اگر وہ روس سے جا ملے تو ہم لوگ نہایت مہربانی سے اُس کا خیر مقدم کریں گے اور یہ کہ روس چاہتا ہے کہ تمام سلاف رعایا کو آسٹریا کی حکومت سے آزادی دلائے۔ اس روسی افسر کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ وہ سلاف افسر مع اپنی تمام سپاہ کے واپس چلا گیا اور سمجھوں نے

بنا پر آسٹرین جنرل، کوئی حملہ ایسی تیزی اور سختی سے نہ کر سکے، جس تیزی اور سختی سے اُن کا دوست جرمنی بیلجیم کی جانب فرانس کے مقابلے میں حملے کر رہا تھا۔ آسٹریا کا حال تو یہ تھا، مگر روس نہایت دور اندیشی سے کام کر رہا تھا اور وارسا اور Kiev کے درمیان بہت بڑا لشکر اُس نے جمع کیا تھا۔ آسٹریا کو اُس نے وارسا اور Ivangorod کی طرف بڑھنے سے روکا اور سواروں کے رسالوں کی آڑ میں اُس کو رکھکر، آسٹرین سپاہ کو ہلاکت کی جگہ پر پہونچانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ دریائے وسٹولا کے دوسری طرف، جو دریائے مذکور اور دریائے بُوگ کے درمیان جنگل ہے، اُس راستے پر روس نے پہلے آسٹرین سپاہ کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی، خصوصاً کالم کی جانب بڑھائے گیا۔ روسیوں کا جو دستہ فوج آگے تھا، وہ بہت چھوٹا تھا اور اپنی جگہ چھوڑتا جاتا تھا۔ آسٹرین سپہ سالاروں نے ان چھوٹی سی کامیابیوں کو بہت مبالغے سے اپنے ملک کے باشندوں پر ظاہر کیا، کیونکہ اپنے ملک کے باغی سلاؤ رعایا کو ڈرانے اور اُن کی ہمت توڑنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح کی کامیابی سے آسٹرین جنرل ڈانکل اور جنرل آفین بیرک مقامات ربیب لین اور کالم کی طرف بڑھے اور روس کے ملک میں پچاس میل تک پہونچ گئے۔ ۲۵ راگست کو آسٹرین فوج ایسی جگہ پہونچ گئی کہ وہاں سے اُن شہروں پر زد پڑ سکتی تھی۔ یہاں سے ریل کا سلسلہ، جو ان مقامات کے درمیان تھا، بہت قریب تھا اور یہیں سے وارسا اور Ivangorod کو بھی ریل گئی تھی لیکن روسیوں نے مقامات مذکور یا ریلوے کو آسٹرین سپاہ کے قبضے میں آنے نہیں دیا۔ غرضکہ دریائے وسٹولا اور دریائے بُوگ کے درمیان، ایسی جگہ پر آسٹریا کی فوج آگئی،

سپاہ کو جنرل ہنڈن برگ کی سپاہ عظیم سے لڑاتا ہوا، اپنی سرحد کی طرف لوٹ آئے۔ اس کا کام یہ بھی تھا کہ جرمن قائد اعظم کو (یعنی ہنڈن برگ کو) لڑائی میں ایسا مشغول رکھے کہ وہ جرمن فوج کا کوئی بڑا حصہ پرشا سے پولینڈ میں بھیج کر آسٹرین فوج کو مدد نہ دے سکے۔ اس اثنا میں روسی فوج جو لیُب لین اور کالم میں تھی، اُس کو جنرل Rennenkampf کے حصہ فوج سے مدد پہونچ گئی، تو اُس نے حملہ کردیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ آسٹرین جنرل ڈانکل کو بہت تردد ہوگیا اور لیُب لین کی جانب اُس کا بڑھنا رُک گیا اور اُس کی حالت بہت خطرناک ہوگئی۔ دو سو میل تک لڑائی کی لین چلی گئی تھی، جس کے دہنے بازو پر جنرل ڈانکل کی سپاہ رُکی ہوئی پڑی تھی جس پر روسی فوج غلبہ کیے ہوئے تھی۔ روسی سپہ سالار نے کُل لین پر دھاوا کردیا اور اس تدبیر سے کیا کہ جو آسٹرین سپاہ بائیں بازو پر تھی وہ دہنے بازو کی مغلوب سپاہ سے نہ مل سکی اور اُس کو مدد نہ پہونچا سکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۵ نمبر کا ہنگیرین ڈویزن شکست کھاکر پراگندہ ہوگیا۔ ایک ہفتے تک دریاے وسٹولا اور دریاے بوگ کے درمیان لڑائی ہوتی رہی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس عرصے میں روسی جنرل کا منشا فقط یہ رہا کہ جنرل ڈانکل کو روکے رہے اور جنرل آفین بیرگ کو ایسا تنگ کرے کہ وہ آرچ ڈیوک فریڈرک کو گالیشیا میں مدد نہ پہونچا سکے۔

دونوں آسٹرین جنرل یعنی ڈانکل اور آفین بیرگ جانتے تھے کہ جنوب کی طرف اُن کی فوج کا داہنا بازو مغلوب ہوگیا ہے اور شکست کھا چکا ہے۔ اس لئے اُنھوں نے سخت کوشش کی کہ روسی سپاہ کو سامنے سے مغلوب کرکے اپنی شکست کا بدلہ لیں۔ ایک زبردست سپاہ آسٹریا کی دریائے وسٹولا کے پاس مقام Radom

روسیوں کی اطاعت قبول کرلی۔

جب آسٹرین سپاہ نے دیکھا کہ سامنے سے روسیوں کی فوج دباتی ہوئی بڑھتی چلی آتی ہے اور دریائے وسٹولا کے پار، دریائے بوگ کے بائیں کنارے تک پھیل گئی ہے، تو اُنھوں نے بہت جلد مدد بھیجی۔ یہاں تک کہ پولینڈ کے دریاؤں کے درمیان قریب سات لاکھ آسٹرین فوج ہوگئی اور تین لاکھ گالیشیا میں رہی۔ ان کے علاوہ مدد کے واسطے سپاہ کے کئی دستے رہے، جو آمد و رفت کے راستوں کی بھی حفاظت کرتے تھے۔ ان کے مقابلے کے لئے جو روسی سپاہ پہلے تھی، وہ چھ لاکھ تھی۔ پلٹنیں برابر ریلوں سے اُتر رہی تھیں اور میدان جنگ میں جا رہی تھیں مگر تب بھی پوری مدد نہیں پہونچا سکتی تھیں۔ روسی جنرل Sukhombnoff نے ایک کام بڑی جرأت کا کیا، جس سے گرانڈ ڈیوک نکولس روسی کمانڈر ان چیف کو پوری مدد پہونچ گئی۔ اُس نے اُس فوج میں سے جو مشرقی پرشا پر حملہ کر رہی تھی، بہت سے دستۂ سپاہ واپس بلا لیے اور Ivangorod پر پہونچا دیے، تاکہ روسی سپاہ کا بایاں بازو ویسٹ لیفٹ پر مضبوط کر دے۔ یہ کام اُس وقت کیا گیا جبکہ جرمن جنرل، ہنڈن برگ (Hindenburg) مقام Thorn پر لشکر جمع کر رہا تھا کہ روسی حملہ آور سپاہ پر مقام Zannenberg اور Konigsberg میں جوابی حملہ کرے۔ روسی جنرل Samsonoff تو پرشا میں Zannenberg کے مقام پر شکست کھا چکا تھا، اُس کی دو پلٹنیں سخت ضرورت کی وجہ سے پولینڈ کی جانب مقامات لیفٹ لیفٹ اور کالم پر بھیج دی گئیں اور دوسرا روسی جنرل Rennenkampf جو مقام Konigsberg میں تھا، اُس کو یہ سخت مشکل کام سپرد کیا گیا کہ اپنی کمزور

و شوکت سے مع بھاری توپوں کے عین وقت پر پہنچ گئی -
اس کے ساتھ بہت عمدہ سپاہ Trol اور ہنگری کی شامل تھی۔اس میں
سے ڈیڑھ لاکھ سپاہ جرمن مع بڑے توپ خانے کے روس کے علاقے
میں چلی گئی اور مقام Turolim کے ارد گرد پہاڑیوں پر دونوں آسٹرین
جنرل ڈاکل اور آفین بیرک کی فوجوں کے درمیان قائم ہوگئی - دوسری
ڈیڑھ لاکھ جرمن سپاہ، اس تازہ وارد ہنگیرین فوج میں شامل ہوگئی اور
مل کر ایک نیا دہنا بازو قائم کیا۔ اس میں چونکہ سلاؤ قوم کے سپاہی شامل
نہ تھے، جن کے خیالات باغیانہ تھے، لہذا یہ نئی ترتیب دی ہوئی گالشیئن
فوج، پہلی سپاہ سے زیادہ زبردست تھی اور آرچ ڈیوک فریڈرک قائد اعظم
کی مستعدی اور قابلیت بہت زیادہ تعریف کے قابل ہے، جس نے
فوج کو تباہی اور بربادی سے نکال کر طاقت بخشی -

آخر میں جہاں آسٹرین فوج نے جگہ پکڑ لی تھی وہ بہت مضبوط
تھی - البتہ یہ برائی تھی کہ اس کے پیچھے دلدل تھی، پچیس سو ضرب توپ
اس کے پاس تھی، جن میں جرمن توپیں اور Maximis بہت کثرت سے
شامل تھیں۔ یہ سب سپاہ مقام Ravaruska پر جمع ہوئی جو روسی سرحد
کے قریب ہے۔ روسیوں نے آسٹریا کے قلب سپاہ پر Frontal Attack حملہ
کیا، جیسا کہ نپولین کا پرانا طریقہ تھا۔ لیکن ایسی زبردست سپاہ اور اتنی
زبردست اور زیادہ توپوں کے مقابلے میں حملہ کیا کہ نپولین نے بھی
واٹرلو کے مقام پر نہیں کیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ قلب سپاہ توڑنے میں حملہ آور فوج

میں تھی۔ یہ نہایت تیزی سے Ivangorod کی طرف بڑھی، مگر یہاں کے قلعے کی فوج نے دشمن کو شکست دی۔ آسٹرین فوج دریائے مذکور کے اوپر کی جانب ہٹ گئی۔ جہاں جنرل ڈاکل مورچے ڈالے ہوئے تھا، وہاں جاکر پیپوں کے دو پُل بنائے اور اُس کی فوج سے جا ملی۔ جنرل ڈاکل یہ مدد پاکر لیٹب لیٹین ریلوے کی جانب بڑھا، لیکن روسیوں نے اپنی ساری امدادی فوج ادھر ڈال دی اور پھر آسٹرین سپاہ کو روک دیا۔ جب آسٹرین Ivangorod پر حملہ کر رہے تھے اور جنرل Daukl دریائے دسٹولا کی دوسری طرف سے اُن کا شریک تھا، دوسرے آسٹرین جنرل آفین بیرگ نے روسیوں کے قلب سپاہ پر دھاوا کر دیا۔ جس کے باعث روسی سپہ سالار مشکل میں پڑ گیا۔ اب روسی سپاہ کو پیچھے ہٹنا پڑا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کالم پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا، کیونکہ یہی ایک کمزور مقام روسی لین میں تھا۔ جو فوج اُس کی حفاظت کر رہی تھی وہ تھکی ماندی تھی۔

۸ ستمبر کو دونوں فریق کی حالت یکایک بدل گئی۔ جنرل رسکی مقام لیمبرگ سے فوج لے کر آ گیا اور اتنے فاصلے سے برابر کوچ کرتا ہوا سپاہ لایا جو ایک حیرت انگیز کرشمہ تھا۔ اب آسٹرین جنرل آفین بیرگ کی سپاہ پر تین طرف سے حملہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹرین سپاہ جو حملے کر رہی تھی، خود روسی حملوں کی مدافعت کرنے لگی اور کئی موقعوں پر پیچھے ہٹنے لگی۔ خوب معرکہ کارزار گرم ہوا اور چند گھنٹوں تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسٹرین سپاہ کا درمیانی حصہ ٹوٹ جائے گا، لیکن اس کے جنرل اور قائد اعظم نے نہایت مستعدی سے سپاہ کے قلب اور بازو کو درست کر لیا۔ اتنے میں جرمن کی امدادی فوج، تین لاکھ، نہایت شان

جن پر شہنشاہ جرمن کا مانوگرام (طغرا) بنا ہوا تھا۔ لیکن جرمن بہت بہادری سے لڑے۔ آخر کار اُسی طرف ہٹ گئے، جدھر اُن کے ساتھی آسٹرین گئے تھے اور دریائے وسٹولا پر مقام Annopol میں پہنچ گئے۔
گرانڈ ڈیوک نکولس نے نہ چاہا کہ آسٹرین سپاہ کا وسطی حصہ، یا قلب سپاہ، اس طرح جان بچا کر نکل جائے۔ ۹ ستمبر کی شام سے رات بھر روسی سپاہ مارچ کرتی رہی اور فوج کے بعض دستوں نے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی۔ بہت بڑا فاصلہ طے کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹرین سپہ سالار آفین برگ کی سپاہ ۱۰ ستمبر کو چاروں طرف سے گھر گئی۔ روسی جنرل رسکی نے اس نظر سے کہ کیوں لاکھوں بندگان خدا کا خون ناحق بہایا جائے، ایک افسر مع سفید جھنڈے کے جنرل آفین برگ کے پاس بھیجا کہ اطاعت قبول کرے۔ آسٹرین جنرل نے جیسا کہ آج کل دستور ہے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا، کیونکہ اُس کا ارادہ تھا کہ میں اس فوج کو، جو مجھے گھیرے ہوئے ہے چیر کر نکل جاؤں۔ کوئی لایق جنرل ہوتا، وہ بھی اس وقت ایسا ہی کرتا۔ کوئی گھری ہوئی فوج، جس کے پاس رسد اور لڑائی کا سامان کافی ہو، اگر وہ نہایت تیزی اور جوش سے مقابلہ کرے، جیسا کہ جرمن نے بعد میں مقام لاڈز پر کیا تھا، تو اکثر محاصرہ چیر کر باہر نکل جاتی ہے گو اس میں سپاہ کا چوتھا یا پانچواں حصہ کام آجاتا ہے۔ یہی جنرل آفین برگ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس ارادے میں وہ پورا کامیاب نہ ہوا۔ ایک دن کی سخت ہلاکت کے بعد سپاہ بیدل ہوگئی، اُتر، پورب، پچھم تینوں طرف سے روسی

بہت ضایع ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ کثیر تعداد سے زبردست توپیں آگ برسارہی ہوں، اس وجہ سے روسی سپاہ کا زیادہ نقصان ہوا۔ روسی سپاہی نہایت خاموشی، بہادری اور استقلال سے آگے بڑھتے جاتے تھے اور جہاں وہ گرے، اُن کی جگہ پر دوچند سپاہی پیچھے سے پہنچ گئے۔ وہ بھی شہید ہوے تو چار چند سپاہی عقب سے اُن کی جگہ پر آ گئے۔ یہاں تک کہ کمپنی کے بعد کمپنی اور رپلٹن کے بعد پلٹن کٹتی جاتی تھی، آفتاب غروب ہوگیا اور رات کی تاریکی میں حملہ آور روسیوں نے سنگینوں سے حملہ کیا۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تڑکا ہوتے ہوتے روسی فوج نے آسٹرین قلب سپاہ کے ٹکڑے اڑادیے۔ آسٹرین فوج کا سویرا ہوگیا اور سپاہ میں ابتری پڑگئی۔ آسٹرین جنرل ڈاکل جس کی فوج کا یہ حال ہوا اپنی جگہ مایوسی میں چھوڑکر نہایت تیزی سے ہٹا۔ کیونکہ اس کو یہ خوف تھا کہ مبادا کاسکوں کا رسالہ اس کے عقب سے آکر واپسی کی راہ بند کردے تو ایسی صورت میں تمام سپاہ ہلاک ہوجائے گی۔ آخر وہ اپنی سپاہ کو دریائے وسٹولا کے کنارے ترتیب کے ساتھ لے آیا۔ لیکن ڈاکل کی سپاہ کے یکایک ہٹ جانے سے جرمن فوج ڈیڑھ لاکھ جو Turolim کی پہاڑیوں پر تھی، غیر محفوظ حالت میں ہوگئی اور روسیوں نے اُن کی غفلت کی حالت میں پہلو پر سے حملہ کیا۔ جرمن اس وقت تک اپنی بڑی توپیں مورچوں پر لگا نہ پائے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانچ ہزار جرمن سپاہ کھیت رہی اور بڑی توپیں سب روسیوں نے چھین لیں۔ یہ ۳۲ نئی توپیں نہایت اعلیٰ درجے کی تھیں

گاندھی جنم دن

۱۵ اگست ۲۲ء میں گاندھی جی کا جنم دن منانے کے لیے بمقام
سرستی بھون، ایک جلسہ بصدارت شران صاحب منعقد ہوا،
جس میں ارباب کانگریس اور شہر و فتح گڑھ کے دیگر باشندوں
کا ازدحام تھا۔ خواتین بھی شریک جلسہ تھیں۔ موصوف نے
اس موقع سالگرہ پر جو تقریر کی وہ درج ذیل ہے۔

بھائیو اور بہنو! آج مہاتما گاندھی کی سالگرہ کا روز دلفروز ہے
اور ہم سب ان کے جنم دن کی خوشی منانے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں
اور دعا کرتے ہیں ؎

وہ سلامت رہیں قیامت تک　　اور قیامت خدا کرے کہ نہ ہو

میرے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مہاتما جی کی سوانح عمری شروع سے آخر
تک بیان کروں، کیونکہ اس ضیق وقت میں یہ ناممکن ہے۔ لیکن ان کی عادت
خصلت، خو بو کا مختصر بیان کرنا جس سے ہمارے واسطے کچھ سبق نکلتے ہوں
ضروری ہے۔

موہن داس کرم چند گاندھی ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء بمقام پوربندر، علاقہ
کاٹھیاوار میں پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کی عمر اس وقت ڈیڑھ مہینہ
کم ترپن برس کی ہے۔ مہاتما جی کے باپ اور دادا دونوں اپنی آزاد مزاجی
اور آقائی خیر خواہی کے باعث نہایت مشہور شخصیتوں کے مالک تھے۔ ان کے

اس کی سپاہ پر ٹوٹ پڑے۔ صرف دکھن کی طرف سے راہ خالی چھوڑ دی تاکہ اس طرف کو آسٹرین فوج ہٹے۔ لیکن آسٹرین فوج کے لیے اس طرف ہٹنا قہر تھا کیونکہ دریائے ساؤ کی دلدل تھی جس میں آفین بیرک کی سپاہ مار پر مار کھاتی ہوئی کٹتی پٹتی آکر پھنس گئی۔

اس عرصے میں جنرل ڈاکل کی سپاہ جو اپنے مرکز سے ہٹ کر دو دن کی راہ چل چکی تھی اس کی بہت بری طرح روسیوں نے خبر لی۔ اس طرح پر کہ روسی سپاہ کے چند مسلح دستے دریائے وسٹولا کی طرف چلے، تاکہ وہاں کی روسی سپاہ میں شامل ہوکر جنرل ڈاکل کی فوج کو ابتری کی حالت میں ڈال کر دوسری دلدل میں جو دریائے وسٹولا اور دریائے ساؤ کے درمیان تھی ڈال دیں۔ آسٹرین جنرل کی بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ اس نے اپنی سپاہ ایسی جگہ قائم کی تھی کہ اس کی پشت پر دلدل تھی۔ جس وقت اس جنرل کی سپاہ شکست کھاکر پیچھے ہٹی تو دلدل میں پھنس گئی، جس میں آدھی فوج ضایع ہوگئی اور لڑائی کا سب سامان اور بہت توپیں چھن گئیں، لیکن بہت زیادہ توپیں دلدل میں پھنس کر رہ گئیں۔

ماں باپ کے گھر میں گاندھی جی پیدا ہوئے جو اس وقت سب سے بڑے آدمی ہیں۔ نیکی میں سچائی میں، آزادی اور ایثار میں یکتائے روزگار ہیں اور اکنتیس کروڑ باشندگان ہند کے پیشوائے اعظم ہیں۔

گاندھی جی نے سترہ برس کی عمر میں کاٹھیاوار کے ہائی اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس سے پہلے بارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہو چکی تھی۔ ویشنو مت میں اہنسا کی بہت بڑی ہدایت ہے یعنی کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ دینا۔ لیکن مدرسے کی تعلیم انگریزی سے جیسا کہ قاعدہ ہے، ان کے دل سے اہنسا کا خیال جاتا رہا اور انھوں نے یہ سمجھا کہ گوشت کھانے میں کوئی برائی نہیں ہے اور گوشت سے پرہیز کرنا محض ایک وہم ہے۔ چنانچہ چند ساتھیوں کے ہمراہ ہر روز شام کو کسی ندی کے کنارے کھانے پکا کرتے تھے اور گاندھی جی گھر سے بہانہ کرکے نکل جایا کرتے تھے کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور وہاں جاکر وہ کھانے کھایا کرتے تھے، جو ویشنو لوگ نہیں کھا سکتے تھے۔ گویا تھوڑے دنوں کے لیے ویشنو سے شیوی بن گئے تھے۔ لیکن چونکہ گاندھی جی کا دل ہمیشہ سچ بولنے پر مائل رہا کرتا تھا اور ان دنوں اس صحبت میں بھی ان کا دل ٹھکانے نہیں رہتا تھا، انھوں نے دیکھا کہ مجھے روز جھوٹ بولنا پڑتا ہے اس لیے جھوٹ سے بچنے کی غرض سے گوشت کھانا چھوڑ دیا۔

انٹرنس پاس کرنے کے بعد گاندھی جی کے دوستوں نے صلاح دی کہ اب تم ولایت جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کرو۔ وہ تیار ہو گئے،

دادا صاحب رانا ے پوربندر کے یہاں دیوان ریاست تھے۔ ایک مرتبہ جبکہ رانی ناخوش ہوئیں تو یہ نواب جوناگڑھ کے یہاں پناہ گیر ہوے۔ لیکن نواب کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا کرتے تھے۔ جب وہاں کے درباریوں نے نواب سے کہا کہ یہ شخص بائیں ہاتھ سے آپ کو سلام کرتا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ مجھے رانی پوربندر سے بہت ناخوشی حاصل ہوئی ہے لیکن تاہم میں اپنا داہنا ہاتھ اُنہی کے سلام کے لیے محفوظ رکھتا ہوں اور دوسرے کے سلام کے واسطے بایاں ہاتھ کام میں لاؤں گا۔ اسی طرح مہاتما جی کے باپ دیوان پوربندر تھے۔ جب وہاں کے رانا سے کچھ ناچاقی ہوئی، تو یہ راج کوٹ چلے گئے اور وہاں کے دیوان ہو گئے۔ راجہ راج کوٹ نے ان کو زمین جاگیر میں دینا چاہی مگر انھوں نے نہیں لی۔ جب دوستوں نے بہت سمجھایا، تو اُس کا ذرا سا ٹکڑا لے لیا۔ ایک دن پولٹیکل ایجنٹ نے کچھ الفاظ ان کے رانا ے راج کوٹ کی نسبت کہے، جن کو سن کر انھوں نے سخت جواب دیا۔ پولٹیکل ایجنٹ نے کہا کہ تم مجھ سے معافی چاہو۔ انھوں نے انکار کیا کہ میں معافی نہ چاہوں گا۔ تب پولٹیکل ایجنٹ کو معافی کا خیال چھوڑنا پڑا۔

مہاتما جی کی ماتا جی بہت دھرماتما عورت تھیں۔ کسی بھوکے کو دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ سخت سے سخت برت رکھتی تھیں۔ جب تک کسی بھوکے کو کھلا نہ لیں خود نہیں کھاتی تھیں۔ گویا دیبی جی سروپ تھیں۔ ایسے

گاندھی کو مہاتما گاندھی بنا دیا۔ بمبئی میں وکالت کرتے تھے کہ ایک مقدمے میں ٹرانسوال جانا پڑا۔ جس وقت نیٹال پہنچے اُسی وقت سے تکلیفوں اور مصیبتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ عدالت میں حاکم نے کہا کہ بیرسٹری کی پگڑی اتار ڈالو۔ جب ریل پر ٹرانسوال جا رہے تھے تو گارڈ نے اول درجے کی گاڑی میں سے ان کا اسباب اتار کر پھینک دیا اور ریل چل دی۔ دوسری دفعہ گارڈ نے گاڑی پر سے اتار دیا اور جب انھوں نے اترنے سے انکار کیا، تو دو چار گھونسے رسید کیے۔ ایک مرتبہ پریٹوریا (Pretoria) میں ایک سنتری نے انھیں ڈھکیل دیا اور یہ سڑک کے کنارے گر پڑے۔ جب مقدمہ ختم ہوا اور گاندھی جی ہندوستان کو واپس آنا چاہتے تھے، اُس وقت معلوم ہوا کہ کوئی قانون پاس ہونے والا ہے جس سے ہندوستانیوں کے تمام حقوق چھین جائیں گے۔ گاندھی جی نے اپنی واپسی موقوف کر دی اور کاونسل پارلیمنٹ میں درخواست دی کہ یہ قانون پاس نہ کیا جائے، مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی تب انگلستان کے وزیر خارجہ کو لکھا۔ وہاں سے بھی کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ تب گاندھی جی نے ایک جماعت وہاں قایم کی جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی نگرانی کرتی رہے۔ وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے کہا کہ آپ ہندوستان جانا موقوف کر دیں اور ہم آپ کی وکالت کا ذمّہ لیتے ہیں۔ آپ کے قیام سے فائدہ ہوگا۔ تب گاندھی جی نے نیٹال (Natal) کے سپریم کورٹ میں اپنا نام داخل کرایا اور ہندوستان کی واپسی

لیکن ان کی ماتا جی بہت خلاف تھیں، کیونکہ وہ انگلستان کی بری صحبت کے حالات سے واقف تھیں اور وہاں جانا ایسا سمجھتی تھیں کہ گویا دوزخ میں رہنا ہے لیکن گاندھی جی نے ضد کی اور ماں کو ماننا پڑا۔ ماں نے تین باتوں کی قسم لی تب اجازت دی۔ ایک یہ کہ شراب نہ پیوں گا۔ دوسرے یہ کہ گوشت نہ کھاؤں گا۔ تیسرے وہاں کی عورتوں سے بچا رہوں گا۔ انگلستان جاکر انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ مگر وہاں پورے انگریز بن گئے۔ انگریزی فیشن اختیار کیا اور انگریزی ناچ ناچنے لگے اور انگریزی باجے بجانے لگے اور انگریزی گیت گانے لگے۔ ایک دن ایک دعوت میں گوشت سامنے لایا گیا اُس وقت ان کو تینوں قسمیں یاد آگئیں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ نہیں کھایا۔ اُسی دن سے انگریزی بہروپ چھوڑ دیا اور یہ کیچلی بدل ڈالی اور روحانیت میں غرق ہو گئے۔ دوستوں نے یہ صلاح دی کہ اگر روحانیت چاہتے ہو تو مذہب عیسوی اختیار کرو، لیکن بھگوت گیتا کے مطالعے نے ان کو ثابت قدم رکھا اور ملک و قوم کی خدمت کے شوق میں امتحان بیرسٹری پاس کر کے ہندوستان واپس آئے۔ اور بمبئی ہائی کورٹ میں نام داخل کرا کر وہیں وکالت کرنے کا ارادہ کیا۔

یہاں آکر وہ وقت شروع ہوتا ہے جو نہایت آزمایش و امتحان کا زمانہ تھا۔ یعنی وہ وقت جب سے آپ نے ملک و قوم کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کیں اور سخت تکلیفیں اٹھائیں جن کے باعث آپ کا نام تمام دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہو گیا۔ بمبئی میں آکر ماتا جی کے بیکنٹھ باس ہونے کی خبر وحشت اثر سنی۔ ماں کیا تھی فرشتہ تھی، جس نے

سمندر کے کنارے ہندوستانیوں کی طرف تحقیر کے نعرے لگانے لگے۔ گاندھی جی کو اطلاع دی گئی کہ اگر تم جہاز سے اترو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا خطرہ ہے، مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ جب یہ لوگ جہاز سے اُترے تو وہاں کے باشندے جو ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے بہت غل و شور مچانے لگے۔ وہاں سرکار کے اٹارنی جنرل نے منع کیا اور وعدہ کیا کہ گورنمنٹ تمھاری خواہشوں پر لحاظ کرے گی۔ تب مجمع ہٹا۔ راستے میں گاندھی جی پر حملے ہوئے اور جس مکان میں پولیس نے ان کو چھپایا تھا، اُس میں آگ لگا دینے کی دھمکی دی گئی۔ تب گاندھی جی پولیس کی وردی پہن کر پولیس اسٹیشن پر پناہ گیر ہوئے۔ غرضکہ اِس طرح اُس وقت بہ ہزار خرابی جان بچی۔

اکتوبر ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور ٹرانسوال میں جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی نے سیکڑوں ہندوستانیوں کو اپنی کمان میں لیا اور والنٹیر بننے کی درخواست کی کہ سلطنت برطانیہ کو مدد دیں۔ یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ دوسری مرتبہ پھر درخواست دی۔ وہ بھی نامنظور ہوئی۔ جب انگریزوں کو وہاں شکست ہونے لگی، تب برطانیہ کی آنکھیں کھلیں اور گاندھی جی کی درخواست منظور ہوئی کیونکہ برطانیہ کا مطلب تھا۔ تب ایک ہزار ہندوستانیوں نے ایمبولینس کی جماعت تیار کی اور گاندھی اس کے سردار بنے۔ اس جماعت نے زخمیوں کی بڑی خدمت کی اور اسپتال پہونچایا۔ افریقہ کے باشندوں نے بھی اس خدمت کو بہت پسند کیا۔ اس وقت

کا ارادہ موقوف کردیا۔

۱۸۹۶ء میں گاندھی جی اس غرض سے ہندوستان واپس آئے کہ اپنے بیوی بچوں کو جنوبی افریقہ لے جائیں۔ اُس وقت اس ملک میں اُن کا استقبال و خیر مقدم ہر جگہ بڑی شان سے کیا گیا، کیونکہ جو خدمات اُنھوں نے ہم لوگوں کی افریقہ میں انجام دی تھیں، اُن کی خبر اس ملک میں مشہور ہو چکی تھی۔ افریقہ سے چلتے وقت اُنھوں نے ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اُن تمام شکایات کو بیان کیا تھا جو ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں تھیں اور جو ظلم و ستم ہم لوگوں پر وہاں ہوتے تھے اُن کو خوب واضح طور پر دکھایا تھا۔ اخباروں نے رنگ آمیزی کرکے یہ خبریں افریقہ میں پہنچائیں کہ گاندھی جی ہندوستان میں اپنی اسپیچوں میں کہہ رہے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں اہلِ ہند کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا ہے کہ گویا یہ لوگ وحشی جانور ہیں۔ اس پر افریقہ کے سفید چمڑے والوں میں بہت ناراضگی پھیل گئی اور گاندھی جی کو وہاں کے باشندے بہت سخت سُست الفاظ میں یاد کرنے لگے۔ گاندھی جی کو پھر وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے بلایا۔ جب گاندھی جی افریقہ روانہ ہوئے تو دو جہاز تھے، جن میں ہندوستانی مسافر چھ سو سے زیادہ تھے۔ یہ دونوں جہاز بندرگاہ ڈربن (Durban) پر قرنطینہ کی غرض سے روک دیے گئے۔ یہ ارادہ کرلیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو جہاز سے اترنے نہ دینا چاہیے بلکہ جہازوں کو ڈبو دینا چاہیے۔ ہزاروں سفید چمڑے والے جمع ہوگئے اور

میں تھے، بہت موتیں ہوئیں۔ وہاں کی میونسپلٹی نے کچھ مدد نہیں دی۔ مگر گاندھی جی نے اپنے والنیٹروں سے مدد پہونچائی اور میونسپلٹی کو خبر دی۔ ایک دن اکیس ہندوستانی مرگئے اور ایک ہفتے میں ایک سو ہندوستانی طاعون کی نذر ہوئے۔ گاندھی جی نے بیماروں کو ایک علیحدہ جگہ پر پہونچایا اور وہاں بیماروں کو آرام سے رکھا اور اُن کا علاج کرایا۔ اگر اس موقع پر گاندھی جی مدد نہ کرتے اور بہادری سے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالتے تو ہزاروں آدمی طاعون کا شکار ہوگئے ہوتے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں زولو قوم سے برطانیہ کی جنگ چھڑ گئی۔ گاندھی جی نے اس وقت بیس ہندوستانیوں کو اپنی کمان میں لے کر زخمیوں کو اسپتال پہونچایا اور ان کی مرہم پٹی کی۔ اس سچی انسانی ہمدردی کی داد وہاں کے باشندوں نے قرار واقعی دی۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں نئی ٹرانسوال گورنمنٹ نے ایک قانون پاس کیا کہ سب ہندوستانی خواہ بچے ہوں یا جوان یا بوڑھے، مرد یا عورت اپنے نام نئے سرے سے درج رجسٹر کرائیں اور انگوٹھے کے نشان لگائیں۔ برتاؤ وہاں کے مجرموں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ گویا ہم لوگوں میں اور وہاں کے مجرموں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور سب ہندوستانیوں نے اُن کے کہنے پر عمل کیا۔ ایک وفد ولایت کو بھیجا گیا اور ایک کمیٹی ولایت میں بنائی گئی۔ جس کے چیرمین لارڈ ایمپتھل ہوئے جو گورنر مدراس رہ چکے تھے۔ مگر یہ صرف ہمدردی تھی اور کچھ نہیں۔

انگریزوں نے گاندھی جی سے کہا کہ فائرنگ لائن (Firing Line) میں سے زخمیوں کو اٹھا کر بیس میل پر پہونچاؤ تو یہ خدمت نہایت بیش قیمت ہوگی۔ اس پر تمام ہندوستانی والنٹیر جن میں گاندھی جی شامل تھے فائرنگ لائن میں کام کرنے لگے، جہاں ہر وقت گولیوں اور گراب کا مینہ برستا تھا۔ بہت سے ان میں مارے گئے۔ جب انگریزوں کی فتح ہوئی اور ملک ٹرانسوال انگریزی سلطنت میں شامل ہوگیا، تو گاندھی جی کو امید تھی کہ ہماری خدمتوں کی قدر ہوگی اور ہم لوگوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا خاتمہ ہوجائے گا، مگر نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔ بڑی گورنمنٹ تو کوڑوں سے ہم لوگوں کی خبر لیتی تھی، مگر اتارب نے بچھو کے ڈنک چلائے۔ ایسے قانون پاس ہوئے کہ ایشیا کے باشندے وہاں گھسنے نہ پائیں اور جتنے پہلے کے حقوق تھے وہ سب چھین لیے گئے۔ گاندھی جی ہندوستان واپس آگئے تھے اور افریقہ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، مگر یہ حالت دیکھ کر وہ بھی ٹرانسوال واپس گئے اور وہاں پریٹوریا کے سپریم کورٹ میں اپنا نام بیرسٹری میں داخل کرایا اور ایک اخبار موسوم بہ Public Opinion جاری کیا۔ جس میں بیس ہزار روپیہ ذاتی نقصان اٹھانا پڑا، مگر وہ اخبار آخر میں بہت زوردار ہوگیا اور اس نے ہندوستانیوں کی بڑی خدمت کی جو جنوبی افریقہ میں بیش قیمت خیال کی گئی۔

۱۹۰۴ء میں ٹرانسوال میں طاعون بہت شدت سے پھیلا جس میں اُن ہندوستانیوں کی جو جوہانیس برگ (Johannesburg)

میل جول رکھنے کے بجائے الگ تھلگ رہتے تھے۔ گاندھی جی نے اُن میں اتفاق و اتحاد قایم کیا اور خود داری اور خویشتن داری کا خیال پیدا کر دیا۔ جنوبی افریقہ میں جو تکلیفیں اُن ہندوستانیوں کو تھیں اور جو وحشیانہ برتاؤ وہاں کی گورنمنٹ اور سفید چمڑے والوں کا ہم لوگوں سے تھا، اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے حکام نے نہ صرف زیورِ تہذیب کو اتار کر پھینک دیا تھا بلکہ جامۂ انسانیت کو بھی پارہ پارہ کر ڈالا تھا، لیکن ہندوستانیوں نے جن میں ہندو مسلمان عیسائی پارسی سب شامل تھے، اپنے حقوق اور اپنی عزت و آبرو رکھنے کے لیے جو سخت مقابلہ کیا ہے اور جو ایثار اور قربانیاں کی ہیں وہ ہمیشہ صفحاتِ تاریخ پر یادگار رہیں گی۔ ان سب ہندوستانیوں میں مہاتما گاندھی ایسے تھے جیسے فوج میں جنرل یا ستاروں میں چودھویں رات کا چاند۔

جب یورپ کی جنگ چھڑی اس وقت مہاتما جی نے رنگروٹ بھرتی کرانے میں بہت بڑی مدد گورنمنٹ برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو ہدایت کرتے رہے کہ برٹش گورنمنٹ کو ہر طرح مدد دینا چاہیئے۔ چنانچہ اُن کے فرمانے کے مطابق تمام ہندوستان نے جان و مال سے سرکار کو مدد دی۔ حضور وائسرائے کی تقریروں اور وزیر اعظم برطانیہ کی اسپیچوں اور خود شہنشاہ معظم کی تقریروں میں اُس امداد کا ذکر نہایت تعریف اور شکریے کے ساتھ کیا گیا، جو ہندوستان نے جان و مال کی قربانی کر کے دی۔ بائیس لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر برطانیہ کے لیے فتح حاصل کی۔ لیکن جب

گاندھی جی نے اس کی مخالفت میں Passive resistance کی تحریک شروع کر دی کہ چاہے قید ہو جاؤ، چاہے مرجاؤ مگر رجسٹری نہ کراؤ۔ اب سختی شروع ہوئی اور جیل خانے قیدیوں سے بھر دیے گئے اور گاندھی جی کو دو ماہ قید بلا مشقت کی سزا دی گئی اور بچے اور عورتیں قید فرنگ میں ڈال دیے گئے۔ بچے ماں باپ سے الگ، بیوی اپنے خاوند سے الگ قید میں رکھی گئی۔ جنرل اسمٹس (General Smuts) نے وعدہ کیا کہ اگر ہندوستانی اپنی خوشی سے اپنا نام درج رجسٹر کرائیں گے تو یہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا۔ مگر افسوس یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ گاندھی جی یہ سمجھ کر کہ قانون مذکور منسوخ ہو جائے گا اور سب ہندوستانیوں کی مصیبتیں دور ہو جائیں گی، خود اپنا نام لکھانے کے واسطے تیار ہو گئے۔ ایک پٹھان نے جب یہ دیکھا کہ ہمارا پیشوا نامردی کر رہا ہے اور ہم کو دھوکا دیتا ہے تو راستے میں گاندھی جی کو ایسا مارا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ لوگوں نے کہا کہ تم اس پر نالش کرو۔ گاندھی جی نے انکار کیا اور کہا پٹھان نے جو کچھ کیا وہ اپنے نزدیک اچھا سمجھ کر کیا۔ جب اس پٹھان کو اصلی حالات معلوم ہوے، تو اس نے بڑا افسوس کیا اور گاندھی جی کے پاؤں پر گر پڑا اور معافی چاہی۔ گاندھی جی نے اپنے مقتضائے طبیعت کے موافق اس کو معاف کر دیا۔

غرض کہ مسٹر گاندھی ٹرانسوال میں پندرہ برس Passive resistance کے پیشوا رہے۔ وہاں جو ہندوستانی تھے اُن میں پہلے نا اتفاقی تھی اور آپس میں

دلوں پر زندگی بھر سویدا کی طرح مرتسم رہا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کے دل صفا منزل پر ان کی مادر مہربان کی نصیحت اور محبت کا اثر اب تک منقش ہے۔

۲۔ یہ کہ اگر بُری صحبت میں انسان پڑ جائے، تو پھر سنبھل بھی سکتا ہے، بشرطیکہ غور کرنے کی عادت رکھتا ہو۔ اور اپنی اصلاح اس کو شل گاندھی جی کے منظور رہو۔ ایک صوفی کے روبرو کسی نے ایک مرد صالح کی تعریف کی اور یہ کہا کہ وہ شخص کبھی بے راہ نہیں چلا۔ صوفی نے کیا اچھا جواب دیا۔ اُس نے کہا ،، کاش کردے وگذشتے،، اس کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ اچھا یہ ہوتا کہ اُس سے کچھ لغزش ہوئی ہوتی اور اُس کے بعد سنبھل گیا ہوتا۔ مطلب یہ کہ برائی سے واقف ہو کر اور کچھ اُس کا بُرا نتیجہ اُٹھا کر انسان اگر راہ راست پر آجائے تو وہ زیادہ تجربہ کار اور مستقل مزاج سمجھا جائے گا، بمقابلہ اُس شخص کے جس کو برائی کے جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔

۳۔ یہ کہ تکلیف اور مصیبت میں پڑ کر کس طرح صبر و تحمل کیا جاتا ہے اور خویشتن داری اور آزاد پسندی قایم رکھی جاتی ہے۔ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں جو سختیاں اُٹھائی ہیں اور جس صبر و تحمل سے اُن کو برداشت کیا ہے وہ اُنہی کا کام تھا۔ جنوبی افریقہ وہ مقام ہے جہاں دن میں آگ برستی ہے اور زمین بھاڑ کی طرح بُھننے لگتی ہے اور رات کو ایسی سردی پڑتی ہے کہ برف گرنے لگتی ہے۔

مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکی بلکہ "ڈومینین سٹیٹس یعنی درجۂ نوآبادیات بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم ع

پھر آگئے اسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق بن کر رہ گئے۔ تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہو کر ترک موالات (نان کوآپریشن) کی تحریک جاری کی، جس کا حال آپ سب کو معلوم ہے۔ ہماری گورنمنٹ عالیہ نے جس کو ہم دنیا میں سب سے زیادہ عادل و منصف اور رعایا پرور سمجھتے ہیں، گاندھی جی کی بے بہا خدمات کا صلہ اُن کو یہ دیا کہ قدیم پیشوایان دین و ملت کی طرح اُن کو قید خانوں میں رکھ کر اپنے جیل خانوں کی زیب و زینت اور قدر و منزلت بڑھائی۔ ہم کو چاہیے کہ گاندھی جی کی زندگی اور سوانح عمری سے سبق حاصل کریں۔ لہذا میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ کیا کیا سبق مہاتما جی کی سوانحعمری سے ہم کو سیکھنا چاہیے۔

۱۔ یہ کہ ماؤں کا اثر بچوں کی تربیت پر بہت کچھ ہوتا ہے، جیسا کہ گاندھی جی پر ہوا۔ ولایت میں جہاں وہ بالکل انگریز بن گئے تھے، وہاں بھی جب ماں کی قسموں اور نصیحتوں کا خیال آیا تو پھر سنبھل گئے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید احمد، امیر خسرو دہلوی اور سعدی شیرازی، یہ تینوں ایسے گذرے، جو اپنی ماؤں کو ہمیشہ بڑھاپے میں بھی یاد کرتے رہے اور ماؤں کی محبت و نصیحت کا نقش ان تینوں مشاہیر کے

میں اگر قسم لیا کریں) تو اولاد یقیناً وہ قسم یاد رکھے اور اُس پر عمل بھی کرے جیسے کہ گاندھی جی نے کیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ کارتھے کا جنرل ہینی بیل (Hannibal, Carthaginian General) جبکہ بارہ برس کا تھا اُس کا باپ اُس کو عبادت گاہ میں لے گیا اور اُس سے کہا کہ قسم کھاؤ کہ جب تک زندہ رہوگے رومیوں سے برابر لڑتے رہوگے، یہاں تک کہ یا خود مٹ جاؤ یا اُن کو مٹا دو۔ ہینی بیل نے وہ قسم مرتے دم تک قائم رکھی اور عمر بھر رومیوں سے لڑتا رہا اور اُن کو سخت سے سخت شکستیں دیتا رہا۔ آخر میں مغلوب ہوا اور اپنے آپ کو ہلاک کر لیا، تاکہ رومیوں کے ہاتھ میں زندہ گرفتار نہ ہو جائے۔

۷۔ قوم و ملک کا عاشق زار ہونا اور اس کو آزادی دلانے میں انتہا درجے کا ایثار اور قربانی کرنا، یہ ساتواں سبق ہے جو گاندھی جی کی سوانح عمری پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی ہندوستانیوں کی خاطر اپنی وکالت چھوڑی۔ جنوبی افریقہ جا کر بسے کہ اپنے ملکی بھائیوں کے حقوق بڑھوائیں۔ وہاں کی تمام تر دقتیں اٹھائیں اور بے حد و بے شمار جبر و ظلم سہے اور یہاں ہندوستان میں سوراج اور خلافت کی خاطر بے انتہا تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں جو اخباروں کے ذریعہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہیں، کیونکہ یہ سب کچھ آج گذر رہا ہے۔

۸۔ منکسر مزاجی۔ جس کو انگریزی میں Modesty کہتے ہیں۔ ہمالے

جیل خانے میں دن میں مہاتما جی دھوپ میں اور رات کو کھلے میدان میں رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح دیکھیے، ہندوستان میں مہاتما جی نے ترک موالات کی تحریک میں مسلمانوں کو خلافت کے معاملے میں مدد دینے میں اور سوراج حاصل کرنے کے واسطے ہندوؤں اور مسلمانوں کی خدمت کرنے میں کس قدر جبر و ظلم کیسے صبر و تحمل سے برداشت کیے ہیں۔

۴۔ ماں کی فرماں برداری اور راست گفتاری اور اپنے قول کی پابندی ولایت میں رہ کر اس قدر استحکام اور پامردی سے کی جو اوروں کے لیے سخت مشکل کام تھا۔ جو تین قول انھوں نے اپنی ماں کو دیے تھے، ان تینوں کو آخر وقت تک نباہا، حالانکہ ان کی ماں وہاں پر یہ دیکھنے کو موجود نہ تھیں کہ یہ اپنے قول پر قائم رہتے ہیں یا نہیں۔ اس سے کس قدر ماں کی اطاعت اور صداقت قول کا ثبوت ملتا ہے۔

۵۔ سچ بولنے میں بیبا کی اور بےخوفی چاہیے، جس قدر سچائی میں تکلیف ہو اور چاہے کوئی بُرا کہے۔ جنوبی افریقہ میں سچ بولنے اور سچ کی تبلیغ کرنے میں عالم مسافرت میں بےحد و بے شمار تکلیفیں انھوں نے اٹھائیں۔ سعدی کی طرح ان کا بھی قول تھا بلکہ قول پر عمل تھا ؎

گر راست سخن باشی در بند بمانی ۔۔۔ بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

۶۔ یہ کہ اگر ماں باپ اولاد سے قسم لیا کریں اور خصوصاً عبادت گاہوں

جس کو وہ چلایا کرتی تھیں۔ ہندوؤں نے اس پر مہر تصدیق اس بنا پر لگائی کہ ستر برس پہلے ان کے گھروں میں گرہستی کی چیزوں میں سے جو ایک چیز نہایت مفید اور بکار آمد تھی لیکن حکومت انگریزی میں لوگ اس کو بھول گئے تھے، وہ نئے سرے سے گھروں میں زیب و زینت کا باعث ہوئی۔ عورتوں نے اس کو یوں قبول کیا کہ جہاں گرہستیوں کے بیسیوں دھندے ہیں وہاں چرخہ چلانا بھی ایک نہایت ضروری دھندا ہے، جس کے ذریعہ سودیشی کپڑے ہر قسم کے اور کھدر خاص طور پر تیار ہوا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مردوں نے بھی نہایت شوق سے چرخہ چلانا اختیار کیا ہے۔ اگر بغیر گاندھی جی کی ہدایت کے کسی مرد نے چرخہ چلایا ہوتا، تو یقیناً وہ ہم لوگوں میں مجنون سمجھا گیا ہوتا۔ اب چرخہ چلانا کفایت شعاری، دوراندیشی، ملک و قوم کی خدمت اور سوراج دلانے کا ایک زبردست آلہ سمجھا جاتا ہے۔

۱۰۔ دسواں یا آخری سبق جو ہم کو حاصل ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز چیز ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مہاتما جی کا خاص ایجاد، نہ صرف بلحاظ مفہوم بلکہ بخیال بندش الفاظ کے بھی ہے یعنی Non-violent Non-cooperation جس کا ترجمہ یہ ہے "بلا تشدد ترک موالات"، ہندی میں اس کو اسہیوگ کہتے ہیں۔ آج تک کہیں دنیا کے پردے پر اس قسم کا ترک موالات نہ کسی رعایا نے کسی بادشاہ کے ساتھ کیا ہے نہ کوئی جماعت کسی گروہ کے ساتھ عمل میں لائی ہے۔ ہوا بھی ہے

مہاتما جی تین تین ہفتے کے برت رکھتے ہیں۔ جب اُنھوں نے ہندو مسلمانوں میں جھگڑے، فساد دیکھے، یا جب کبھی ہم لوگوں سے بڑی خطائیں اور گناہ سرزد ہوئے تو ہمارے قصوروں اور خطاؤں کا کفارہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کی طرح ادا کیا۔ جس طرح منصور انا الحق کہتے ہوئے سولی پر چڑھ گئے اسی طرح مہاتما جی بھی ہم لوگوں کے فائدوں کی خاطر ہمیشہ پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار رہے اور تکلیفیں تو ہمیشہ ہی اُٹھاتے رہے۔ ان کا قول یہی رہا۔ ؎

دیرست کہ آوازہ منصور کہن شد من بار دگر جلوہ دہم دار و رسن را

۹۔ حال میں اُن کی زندگی سے ہم کو دو سبق اور بھی ایسے ملے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ایک کھدر، اور دوسرا چرخے کا رواج۔ اگر ان دونوں چیزوں کا ذکر اس ملک میں کسی اور نے کیا ہوتا، تو یقیناً ہنسا جاتا اور لوگ اُس کو دیوانہ کہتے۔ لیکن انھوں نے خود کھدر اور چرخے کے فائدوں پر تقریریں کیں اور لکچر دیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے خود کھدر پہنا اور چرخہ چلایا اور ان کے خاص پیرووں نے ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا، تو ہندوستان میں اس کا عام رواج ہو گیا اور ستر برس پہلے سے جو چرخہ چھوٹا ہوا ہے، وہ پھر نئی شان اور نئی مقبولیت کے ساتھ رواج پا گیا۔ مسلمانوں نے چرخہ اس بنا پر قبول کیا کہ ان کے رسولِ مقبول کی چہیتی بیٹی بی بی فاطمہ زہرا کے گھر جہاں اور گرہستی کی چیزیں تھیں وہاں چرخہ بھی تھا

تو تشدّد کے ساتھ ہوا ہے۔ مہاتما جی کے ترک موالات کا منشا یہ ہے کہ تشدّد نہ خیال کے ذریعہ ہو نہ زبان کے وسیلہ اور نہ عمل سے۔ پھر یہ کہ انگریزوں کی ذات کے ساتھ ترک موالات نہ ہو، بلکہ حکومت انگلشیہ کے ساتھ عدم تعاون عمل میں لایا جائے۔ یعنی فی المثل کوئی انگریز حالت علالت میں یا کسی دوسری وجہ سے ہماری مدد کا محتاج ہو تو فوراً وہ مدد اُس کو پہونچائی جائے، بلکہ اُس کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ واہ اس ترک موالات میں بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا فیاض طبعی اور صلح جوئی دکھائی ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی! گوتم بُدھ صلح کے شہزادے تھے، لیکن اُن کے بعد اس دنیا میں صلح کے شہزادے بے نظیر و عدیل، یہ سمجھے جاتے ہیں۔

ناشر

پنڈت جگموہن نراین مُشران
ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج - یو، پی -
۲۶، ونگفیلڈ پارک
لکھنؤ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ